خدا بخش لائبریری
جرنل

شمارہ: ۱۷۹ــــ ۱۸۲ جنوری ــــ دسمبر ۲۰۱۵

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ایڈیٹر
ڈاکٹر شائستہ بیدار
ڈائریکٹر، خدابخش لائبریری

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۷۹-۱۸۲

زرسالانہ

افراد : -/۴۰۰
ادارہ : -/۵۰۰

غیر ممالک

افراد : ۳۰ڈالر
ادارہ : ۶۰ڈالر

مقالہ نگاروں کے افکار وآراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

محمد جاوید اشرف نے پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	پانچ-چھ
افضل الفوائد، خواجہ نظام الدّین اولیا کے ملفوظات ، از ڈاکٹر رضوان اللہ آروی	۱
قاضی عبدالودود کے خطوط، پیشکش از ڈاکٹر فردالحسن	۲۰
غالب کی جدیدیت اور انگریزی استعمار، از ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ	۵۴
علامہ اقبال پر قدیم ترین تحریریں، از خلیل احمد **منٹگمری**، پیشکش از ڈاکٹر اسد فیض	۷۲
راجہ مہندر پرتاپ کی تین تاریخی باتیں، از ڈاکٹر عبدالخالق رشید، ترجمہ: ڈاکٹر محمد حیات الدین	۷۷
مولانا سید عبدالغنی استھانویؒ، از ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی	۸۷
سید حامد کی آٹو بایوگرافی : نجمہ محمود کے ساتھ انٹرویو (پیشکش:ش)	۹۵
پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس، از ڈاکٹر غلام شبیر رانا	۱۳۳
البیرونی اور ہندستان کے متعلق اس کے مشاہدات، از ڈاکٹر محمد انوارالحق تبسم	۱۵۰
اکیسویں صدی کے آغاز کے بڑے تبصرہ نگار: ''اردو ادب'' (انجمن) کے تبصروں کا اشاریہ (ش)	۱۷۵
تاریخ بنارس مصنفۂ غلام حسین خان : معرفی نسخۂ خطی، از ڈاکٹر محمد صادق حسین	۱۸۷
تازہ کتب و رسائل: تعارف (ادارہ)	۲۰۲

انگریزی۔ ہندی

شہزادی زیب النساء، از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی)	۱
اتہاس اور راج نیتی، از ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (ہندی)	۱۹

مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر اسد فیض، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسلام آباد ماڈل کالج، ایف۱۰/۳، اسلام آباد

☆ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد، پروفیسر شعبۂ تاریخ (سابق)، پٹنہ یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، پرفیسر شعبۂ فارسی واردو، ایچ۔ڈی۔جین کالج، آرہ

☆ ڈاکٹر سید حسن عسکری، مرحوم، پروفیسر شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی، استھانواں، بہار شریف

☆ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، مصطفیٰ آباد، جھنگ سٹی، پاکستان

☆ ڈاکٹر فرد الحسن، فیلو خدا بخش لائبریری (سابق)، ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ

☆ ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، پروفیسر شعبۂ تاریخ (سابق)، اورینٹل کالج، پٹنہ

☆ ڈاکٹر محمد حیات الدین، ۲۳۲، ای برہمپترا ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

☆ ڈاکٹر محمد صادق حسین، شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر، ڈائریکٹر جنرل، سائنس بورڈ، ۲۹۹، اپر مال، لاہور

☆ ڈاکٹر نجمہ محمود، پروفیسر ایجوکیشن (سابق)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اداریہ

خدابخش لائبریری ۲۰۱۴ء یا اس سے کچھ قبل ہی سے کچھ ایسے ناگزیر حالات سے گذری جس سے اپریل ۲۰۱۹ء سے پہلے نکل نہ پائی۔ لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں ۱۹۷۷ء سے نکلنا شروع ہوا، ۲۰۱۴ء میں پچھلی سیریز کا گویا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا، اس کے بعد ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء کے دوران جو تعطل رہا، ایک سال کے ایک شمارے کے حساب سے تو ہو ہی جاتا؛ سو اب ہو گیا، اور ۲۰۱۴ء کی طرح ان چار برسوں کا بھی بھرت پورا ہو گیا، یعنی ایک سال کے ایک شمارہ ہی کا حساب بن پایا، مگر تسلسل رکھنے کے لئے نمبروں کو مسلسل کر دیا گیا، آگے پھر یہ ہوا کہ ۲۰۱۹ء میں سال میں ایک شمارے کی اوسط بڑھا کے سال میں دو شماروں تک لے آیا گیا ہے، یعنی جنوری تا جون ۲۰۱۹ء – اور – جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۲۰۱۵ تا ۲۰۱۹ء کے 'مقروض' شماروں میں بیشتر تو نئی تحریریں ہیں، مگر ایک آدھ وہ بھی جو ہماری قدیم میراث میں شامل تھیں، اور ان کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں از سرِ نو شائع کیا جائے۔

ان برسوں کے قرضے کی ادائی میں ہمیں عبدالرحمٰن صاحب (ساکن ضلع ارریہ سابق ضلع پورنیہ) کا تعاون حاصل رہا، اس کے لئے دلی شکریہ۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب نے سال ۲۰۱۹ء میں اس سیکشن کا چارج سنبھالا، ان سے بھی تعاون ملا۔ چند مضامین کا پروف بھی اچھے طور سے پڑھا، اور مجموعی ہیئت کو سنوارنے میں بھی (فہرست وغیرہ) انھوں نے مدد دی، اس کے لئے ان کا شکریہ۔ سب سے اہم شکرگزاری پرانے خریداروں کی ہم پر واجب ہے، اور نئے خریداروں کی شکرگزاری بھی۔ مزید شکرگزاری ان

رسائل کی بھی جو خدا بخش لائبریری کے ذخیرے کو بھرپور بنانے کے لئے اپنے مجلّات بھیجتے رہے ہیں۔ ان رسائل میں جو لائبریری کو موصول ہوتے رہے ہیں، اکثر کو ہم نے اپنی مستقل مبادلہ فہرست میں رکھا ہے، مبادلے والے رسائل کے مدیران کرام پر ہمارے جرنل کی رسید واجب ہے جب یہ تازہ شمارے ان تک پہنچ جائیں۔

ہمارا جرنل ان مضمون نگاروں کو پہنچنا ضروری ہے، اور متوقع مضمون نگاروں کو بھی، جو خدا بخش لائبریری اور اس کے جرنل سے تعلق بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

(ش)

توجہ فرمائیں

شمارہ بابت ۲۰۱۵ء۔ اور۔ شمارہ بابت ۲۰۱۹ء (نصف آخر) آپ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ درمیانی مدت کے شمارے آپ کی طرف سے **طلبگاری** آنے پر ارسال ہوں گے، جس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ پوسٹ کئے جانے والے شمارے آپ تک پہنچ گئے۔ یہ بھی پتہ چلے گا کہ آپ نے انھیں پسند کیا۔ اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ آپ اپنی پسندیدگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر رضوان اللہ آروی

افضل الفوائد

خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات

تعارف و تجزیہ

افضل الفوائد حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒ کے ملفوظات کا ایک اہم لیکن غیر معروف مجموعہ ہے ،جس کے جامع امیر خسرو ہیں[1]۔ اس کے مندرجات اور مشتملات کا سیر حاصل اور مفصل تعارف اب تک پیش نہیں کیا گیا ہے ۔ اس کے قلمی نسخے بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جن میں خدا بخش لائبریری کا نسخہ بھی شامل ہے ۔ زیرِ نظر مقالے میں اس نسخۂ خدا بخش کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس نسخے کی اہمیت، قدر و قیمت نیز اس کی اصلیت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت امیر خسرو کی کتابوں، خاص طور پر نثری تصانیف ، میں ’ افضل الفوائد‘ کو بہت کم شہرت ملی ۔یا یوں کہئے کہ’ فوائد الفواد‘ کے سامنے اس کی روشنی ماند پڑ گئی ۔ حالانکہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی شخصیت (محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒ) کے ملفوظات ہیں اور ان دونوں کے جامع (یعنی امیر حسن سجزی اور امیر خسرو) ایک دوسرے کے عزیز ترین دوست ہونے کے علاوہ حضرت خواجہ کے مرید اور فیض یافتہ بھی تھے ۔لیکن اس کے باوجود اس تاریخی صداقت سے انکارنہیں کیا جا سکتا کہ امیر حسن نے حضرت خواجہؒ کے ملفوظات کے جمع و ترتیب میں گویا اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور دیگر تمام امور کو ترک کر کے اسی ایک کام کو حرزِ جاں بنا لیا تھا ،ظاہر ہے امیر خسرو ایسا نہ کر سکے اور وہ اپنی گونا گوں مصروفیات کے سبب ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب ’فوائد الفواد‘ نہ صرف حضرت خواجہؒ کی فکر اور علم و دانش کا ایک آئینہ بن کر سامنے آئی بلکہ اُس زمانے کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس کے علاوہ ہر مجلس کی تاریخ اور سنہ لکھنے کے سبب یہ کتاب

اُس دور کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک مرجع بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب بار بار چھپتی رہی ۔فارسی متن کے ساتھ اس کے اردو ترجمہ کی بھی اشاعت ہوتی رہی ۔ اور اس طرح اس کتاب سے استفادہ کی حدیں وسیع ہوتی گئیں اور اس کی شہرت ومقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ برعکس اس کے 'افضل الفوائد' کو ایسی شہرت حاصل نہ ہوسکی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت خواجہؒ کے ملفوظات غیر اہم ہیں یا انہوں نے غیر اہم موضوعات پر سرسری اظہار خیال کیا ہے ۔ مجھے حیرت اور افسوس ہے کہ چشتیہ سلسلے کے ملفوظات پر نگاہ رکھنے والے دانشوروں نے 'افضل الفوائد' کو وہ اہمیت نہیں دی جس کا حق اس کتاب کو حاصل تھا۔ اس کتاب کے تئیں عدم توجہی کے اسباب پر غور کرتا ہوں تو یہ اسباب سمجھ میں آتے ہیں :

(الف) 'فوائد الفواد' کی طرح اس کتاب کی وسیع اشاعت نہ ہوسکی ۔صرف حوالوں میں یہ ذکر ملتا ہے کہ اس کا فارسی متن ۱۳۰۴ھ میں دہلی سے شائع ہوا۔ لیکن یہ مطبوعہ نسخہ نایاب ہے۔ میری نگاہ سے نہیں گذرا۔ اور میری نگاہ کیا ، یہ کتاب تو شاید پروفیسر خلیق احمد نظامی اور پروفیسر حبیب جیسے مؤرخین کی نگاہ سے بھی نہیں گذری ۔ حضرت خواجہؒ کے ملفوظات کے تعلق سے پروفیسر نظامی کی یہ سطریں دیکھئے جس سے 'افضل الفوائد' سے ان کی لاعلمی عیاں ہوتی ہے :

> '' چشتی بزرگوں کی تعلیم اور انداز تربیت پر سب سے زیادہ روشنی ملفوظات سے پڑتی ہے۔ 'فوائد الفواد' کی حیثیت 'دستورالعمل صادقان' کی تھی۔ بہت سے چشتی بزرگ اس کو روحانی سعادت سمجھ کر پڑھتے تھے ۔ شیخ نظام الدّین اولیاؒ کے کچھ اور ملفوظات بھی مرتب کئے گئے تھے ۔ مثلاً 'دُرر نظامیہ' 'انوار المجالس' 'تحفۃ الابرار' و 'کرامۃ الاخیار' اور 'حسرت نامہ'۔ لیکن ان کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو 'فوائد الفواد' کو حاصل ہوئی۔ اور اب تو 'دُرر نظامیہ' کے علاوہ کوئی دوسرا ملفوظ ملتا بھی نہیں(۲) ۔

پروفیسر نظامی کی طرح پروفیسر حبیب نے بھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جبکہ ان کے مطالعات کا محور بھی خواجگان چشت رہے ہیں۔ اسی بنا پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے:

> '' ایسا گمان ہوتا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب ان کتابوں (افضل

الفوائد اور راحت المحبین) کے وجود سے بے خبر تھے ۔''(۳)

اسی بنا پر بعض لوگوں نے اس کتاب کو امیر خسرو کی تالیف تسلیم کرنے میں تامل بھی کیا ہے ۔لیکن کسی کے ذکر نہیں کرنے سے کوئی کتاب غیر معتبر یا مشکوک نہیں ہو جاتی۔ جس طرح پروفیسر حبیب اور خلیق احمد نظامی نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، اسی طرح امیر حسن سجزی اور سید محمد میر خورد کرمانی (صاحب سیر الاولیا) نے بھی 'افضل الفوائد' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان لوگوں نے ذکر کیوں نہیں کیا ،اس کو بنیاد بنا کر 'افضل الفوائد' کو شک کے دائرے میں لانا یا امیر خسرو کی تالیف ماننے سے انکار کرنا علمی دیانت کے خلاف ہے ۔اور دلچسپ بات یہ ہے کہ نثار احمد فاروقی نے ہندوستان کے مختلف کتابخانوں میں محفوظ 'افضل الفوائد' کے قلمی نسخوں کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں علیگڑھ کا نسخہ بھی شامل ہے(۴) ۔ حیرت ہے کہ علیگڑھ سے تعلق رکھنے کے باوجود پروفیسر نظامی اور پروفیسر حبیب کی رسائی اس نسخہ تک نہ ہوسکی ۔

(ب) 'فوائد الفواد' کے اردو ترجمہ کی اشاعت جس وسیع پیمانے پر ہوئی ،اُس پیمانے پر 'افضل الفوائد' کی اشاعت نہ ہوسکی ۔حالانکہ اس کے مطبوعہ اردو تراجم دستیاب ہیں ۔لیکن اردو ترجمہ سے فارسی کا وہ اصل اور خاص اسلوب سمجھ میں نہیں آتا جو حضرت خواجہؒ کے ملفوظات کا امتیاز خاص ہے اور جو اس کتاب کو حضرت خواجہؒ کے اصل ملفوظ ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے ۔

ملفوظ 'افضل الفوائد' کا ایک جامع اور مکمل قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ اس نسخہ کے مطالعہ کے بعد اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ نہایت اہم اور متنوع موضوعات پر حضرت خواجہؒ کی جامع تعلیمات کے باوجود کیوں اس پر توجہ نہیں دی گئی اور کیوں اس کتاب کے اصل ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کیا گیا ۔ چند واقعات کی تکرار اور کچھ تاریخی تسامحات کے سبب پوری کتاب کو مشکوک قرار دینا قرین انصاف نہیں ۔اس کے علاوہ امیر خسرو کے اُس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے جس میں انہوں نے واضح طور کہا ہے کہ انہوں نے ان ملفوظات کو قلمبند کر کے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ جو کچھ زبان مبارک سے سنا ،اس کو لکھ لیا اور اس کا نام 'افضل الفوائد' رکھا ہے ۔حضرت خواجہؒ نے ان کے ہاتھ سے لے کر اسے ملاحظہ فرمایا اور کہیں پر امیر خسرو سے کچھ چھوٹ گیا تھا تو اس کو نہ صرف پورا فرمایا بلکہ اس کی تصحیح بھی کی۔اس کے بعد حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے حضرت خواجہؒ

نے امیر خسرو کی تحسین کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خسرو کو علم وفضل سے نوازا ہے ۔اسی لئے وہ ایسے ایسے معانی نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ کی شفقت آمیز گفتگو سے متاثر ہو کر امیر خسرو نے عرض کیا کہ یہ سب حضرت خواجہؒ کا فیض ہے ۔اس مجلس کی تاریخ بھی امیر خسرو نے ۲۷/ جمادی الثانی لکھی ہے ۔امیر خسرو کے الفاظ یہ ہیں :

''آنروز بندہ چند جزو کاغذ کہ الفاظ دربار گہر نثار خواجہ راستین درقلم آوردہ بود ،پیش نظر مبارک مخدوم عالمیان بداشت ۔عرضداشت کرد کہ مدتی است کہ ایں بیچارہ ہر چہ از زبان مخدوم می شنود تا آنجا کہ ادراک وفہم یاری می دہد ،آنرا می نویسم وآنرا 'افضل الفوائد' نام کردہ ام۔ چوں بندہ ایں عرضداشت کرد، بر دست مبارک گرفتہ بہ شرف مطالعہ شرف داد۔ درمحلی کہ رسیدہ فرمود کہ نیکو نبشتہ و نام نیکو نہادۂ۔ وآنکہ سخن از بندہ ترک شدہ بود بقلم مبارک آنجا صحیح می کردند۔ بعد ازاں روی سوی حاضران کرد وگفت،خسرو کہ ایں صد فوائد درقلم آوردہ است سبب آنکہ ہمہ وقت در بحر معانی از سر تا پای غرق است ۔امّا حق سبحانہ تعالیٰ ہمہ اعضای خسرو را بعقل وفضل سرشتہ ۔زیرا ہمہ روز در بحر معانی آشنا می کند وصد ہزار دُر معانی می آرد وآنرا می نویسد۔ بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بخیر شکستہ پروری و بندہ نوازی کردہ۔ بندہ برخاست و سر بر زمین نہاد وگفت کہ این ہمہ معانی کہ درفہم این بیچارہ بخاطر جای می دہد، از برکت وقوۃ واکرام مخدوم عالمیانست کہ بنظر مبارک خود ایں بیچارہ را پرورش می دہد(۵)''۔

امیر خسرو نے اس واقعہ کی تاریخ تو لکھی ہے ۲۷/ جمادی الثانی لیکن سنہ نہیں لکھا ہے ۔سنہ کی تحقیق وحید مرزا نے کی ہے جنہوں نے امیر خسرو پر اپنی مبسوط کتاب میں 'افضل الفوائد' پر بحث کی ہے ۔ ان کے مطابق یہ واقعہ ۷۱۹ھ میں پیش آیا تھا ۔امیر خسرو کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''مرید ہونے کے بعد ۷۱۹ھ میں خسرو نے افضل الفوائد کا ایک حصہ حضرت نظام الدّین کی خدمت میں پیش کیا ۔انہوں نے اسے بہت پسند کیا اور خسرو کی ہمت افزائی کی ۔چنانچہ اس کے بعد خسرو نے دوسرا حصّہ بھی لکھنا شروع کیا ۔مگر ناتمام رہا۔'افضل الفوائد' لکھنے کا خیال خسرو کو یقیناً خواجہ حسن سجزی کی تقلید میں پیدا ہوا۔ چونکہ دونوں دوست اپنے پیر طریقت کی تعظیم اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے ۔اس لئے خسرو نے پسند

نہ کیا کہ حضرت نظام الدّین اولیاؒ کے ملفوظات کے جمع و ترتیب میں وہ پیچھے رہ جائیں(۶)''۔

وحید مرزا نے ملفوظ کے جس دوسرے حصے کی طرف اشارہ کیا ہے ،اس سے مراد 'راحت المحبین' ہے ۔اس کا ناتمام قلمی نسخہ بھی خدا بخش لائبریری میں موجود ہے(اندراج نمبر Acc 1834/A)۔ واضح رہے کہ وحید مرزا وہ اہم مصنف ہیں جنہوں نے 'افضل الفوائد' کے اصل ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے ان تمام لوگوں کی نفی کی ہے جنہوں نے اس ملفوظ کی اصلیت پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے ۔ان کے علاوہ علامہ شبلی بھی اپنی کتاب ''حیات خسرو'' میں یہ جملہ لکھ چکے تھے :

''افضل الفوائد خواجہ نظام الدّین اولیاؒ کے ملفوظات ہیں(۷)''۔

علامہ اخلاق حسین دہلوی نے بھی ،حضرت محبوب الٰہیؒ کی سیرت وسوانح پر اپنی کتاب میں'' افضل الفوائد'' کو مستند اور معتبر قرار دیا ہے ۔وہ لکھتے ہیں :

'' حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشادات و ملفوظات بکثرت ہیں اور کئی کتابوں میں ہیں۔ان میں سے ''افضل الفوائد'' مرتبہ، حضرت امیر خسروؒ''فوائد الفواد'' مرتبہ، حضرت امیر حسن علا سجزی اور'' سیر الاولیاء'' امیر خورد کرمانی مستند اور معتبر ہیں(۸)''۔

آگے چل کر وہ مزید صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اس کو خود حضرت محبوب الٰہیؒ نے ملاحظہ فرمایا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

'' حضرت امیر خسرو کو شعر و ادب اور موسیقی سے فطری لگاؤ تھا... آپ نے مختلف علوم وفنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور شعرو ادب کا بہت بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان ہی میں ایک پسندیدہ کتاب '' افضل الفوائد'' ہے جس کی دو جلدیں ہیں اور ان میں حضرت محبوب الٰہی کے ملفوظات ہیں ۔جنہیں خود حضرت محبوب الٰہیؒ نے ملاحظہ فرمایا تھا(۹)''۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''افضل الفوائد'' کی دو جلدیں نہیں ہیں ۔حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات کا یہ دوسرا مجموعہ در اصل ''راحت المحبّین'' ہے جس کی طرف وحید مرزا نے بھی

اشارہ کیا ہے۔

ان کے بعد نثار احمد فاروقی وہ اہم مصنف ہیں جنہوں نے چشتیہ سلسلے کے ملفوظات (بشمول افضل الفوائد) پر قابل قدر تحقیق کی ہے۔ افضل الفوائد اور راحت المحبین پر ان کا مبسوط تحقیقی مقالہ کتاب''امیر خسرو۔احوال و آثار'' میں شامل ہے جس کو ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد نتائج اخذ کرتے ہوئے انہوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

> '' میں امیر خسرو سے منسوب ان دونوں کتابوں کے جعلی ہونے کا اعلان قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکتا کیونکہ بعض شواہد ان دونوں کے حق میں بھی جاتے ہیں(۱۰)''۔

تاہم انہوں نے حضرت خواجہؒ کی مجالس میں مولانا شیخ جمال الدّین ہانسوی کی موجودگی کو'افضل الفوائد' کے جعلی ہونے کی قوی ترین داخلی شہادت بھی تسلیم کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''(حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒ) کی ایک محفل میں مولانا جمال الدّین ہانسوی بھی حاضر ہیں۔اور ان کی موجودگی میں محفل سماع برپا ہوتی ہے۔اس میں اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے اور تمام قلمی نسخوں میں شیخ جمال ہانسوی کا نام ملتا ہے تو اسے افضل الفوائد کے جعلی ہونے کی قوی ترین داخلی شہادت مانا جائے گا۔کیونکہ شیخ جمال الدّین کا انتقال حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی حیات ہی میں ہو چکا تھا اور اس کا حوالہ دُرر نظامیہ میں بھی موجود ہے۔ وہ ۷۱۹ھ میں حضرت نظام الدّین اولیاؒ کی خانقاہ میں کیسے موجود ہو سکتے ہیں؟(۱۱)''۔

یہ سارا اشتباہ صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ملفوظ میں جو شیخ جمال الدّین کا ذکر ہے، انہیں شیخ جمال الدّین ہانسوی سمجھ لیا گیا۔وہ جمال الدّین ہانسوی نہیں ہیں۔ در اصل یہ شیخ جمال الدّین حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاؒ کے چند مخصوص مریدوں میں سے ایک تھے اور حضرت خواجہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔وہ اکثر حضرت خواجہؒ کی مجلسوں میں حاضر ہوتے تھے اور ان کے باطنی درجات کی بلندی کی بنا پر خود حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ مولانا جمال الدّین

کوتو خدا کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہتا ۔ سید امیر خورد کرمانی نے بھی ان کا ذکر کیا ہے ۔انہوں نے اپنی کتاب 'سیر الاولیا' کے پانچویں باب میں حضرت خواجہؒ کے تقریباً بیس مخصوص مریدوں کا ذکر کیا ہے جس میں امیر خسرو اور شیخ جمال الدّین بھی شامل ہیں ۔ اس باب کا عنوان ہے ''احوال بعضی یاران اعلا کہ بشرف ارادت وقربت سلطان المشائخ نظام الدّین مخصوص ومشرّف بودہ اند''۔ اس باب میں شیخ جمال الدّین کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہؒ کی مجلسوں میں وہ بیخود ہو جاتے تھے اور خود حضرت خواجہؒ فرماتے تھے کہ مولانا جمال الدّین کوتو خدا کے سوا کچھ یاد ہی نہیں رہتا ۔کرمانی کے الفاظ یہ ہیں :

'' آن جمال زہاد و آن پیشوائے عباد ،آن سالک طریق ورع وتقویٰ آن طالب وصلت مولیٰ یعنی مولانا جمال الملۃ و الدّین مشغول بہ علوم ربانی ومشاہدات جمال رحمانی میان یاران اعلیٰ مشہور بود۔ ومشغولی باطن مبارک ایشان بحدّے بود کہ درمجلس سلطان المشائخ از خود خبر نداشتے۔سلطان المشائخ می فرمود کہ مولانا جمال الدّین را وقت می باشد کہ او را غیر حق یاد نمی آید(۱۲)'' ۔

امیر خورد کرمانی نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ جمال الدّین کی وفات حضرت خواجہؒ کی حیات ہی میں ہو چکی تھی :

''وایں ہم در حیات سلطان المشائخ برحمت حق پیوست(۱۳)''

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ 'افضل الفوائد' میں ان کے نام کے ساتھ ہانسوی کیوں لکھا گیا۔ تو احتیاطاً یہی کہا جا سکتا ہے کہ شیخ جمال الدّین ہانسوی کی شہرت اس قدر زیادہ تھی کہ کسی بھی شیخ جمال الدّین کے ساتھ کاتب کا غیر ارادتاً ہانسوی لکھ دینا بعید از قیاس نہیں۔ یہ تمام ایسے خارجی شواہد ہیں جو 'افضل الفوائد' کے اصل ملفوظ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

جہاں تک داخلی شہادت کی بات ہے تو مخطوطہ کے آغاز میں ہی امیر خسرو نے اس ملفوظ کو 'گوہر گنج علوم غیبی' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ جو کچھ انہوں نے حضرت خواجہؒ کی زبان مبارک سے سنا ان کے الفاظ و معانی کو اپنی فہم کے مطابق اس مجموعہ میں قلمبند کیا اور اس کا نام 'افضل الفوائد' رکھا۔امیر خسرو کے الفاظ یہ ہیں :

''ایں گوہر گنج علم غیبی... از خزانۂ دل خواجہ راستین ملک المشائخ... نظام الحق والدّین شیخ الاسلام والمسلمین ...جمع کردہ آمدہ ... از عین لفظ ایشان و معانی آن کہ بہ سمع رسید بقدر فہم خود در مجموعہ کہ نام اوست افضل الفوائد نبشتہ آمد۔ مشتمل بر تواریخ مختلف بہر محلی کہ بخدمت پیوستہ شدہ است(۱۴)''۔

خدا بخش لائبریری میں فارسی مخطوطات کے ذیل میں یہ کتاب 'افضل الفوائد' کے نام سے درج ہے(اندراج نمبر H.L. 1882)۔ کاتب کا نام فتح محمد لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ فتح محمد در اصل ایک دوسرے مخطوطہ کے کاتب ہیں ۔ یہ دونوں مخطوطات ایک ہی جلد میں مجلد ہونے کے سبب فہرست نگار کو یہ اشتباہ ہوا ہے ۔واقعہ یہ ہے کہ 'افضل الفوائد' میں کاتب نے اپنا نام لکھا ہی نہیں ۔ البتہ کتابت نستعلیق میں ہے اور سنہ کتابت ۱۱۰۰ھ ہے۔ یہ نسخہ ۶۲/ اوراق (۱۲۴/صفحات) پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر ۲۱/سطریں ہیں ۔ اس میں مجموعی طور ۳۴/ مجالس کے ملفوظات ہیں جس میں پہلی مجلس کی تاریخ ۲۴/ ذی الحجہ ۷۱۳ھ ہے اور آخری مجلس کی تاریخ ۱۰/ذی قعدہ ہے ۔امیر خسرو نے آخری مجلس کا سنہ نہیں لکھا ہے ،لیکن نثار احمد فاروقی کی تحقیق کے مطابق یہ سنہ ۷۱۵ھ ہے ۔پہلی مجلس کا احوال لکھتے ہوئے امیر خسرو نے اپنے بیعت سے مشرّف ہونے کا ذکر کیا ہے اور یہ دلچسپ روداد بیان کی ہے کہ ان کے دل میں خیال تھا کہ وہ خود اندر نہیں جائیں گے ۔اگر حضرت خواجہؒ بلائیں گے تو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور امیر خسرو نہ صرف بیعت سے مشرّف ہوئے بلکہ خرقہ و کلاہ سے بھی سرفراز ہوئے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''بندہ ضعیف نحیف کہ یکی از بندگان درگاہ ملک المشائخ است خسرو لاچین کہ جامع این است، دولت پابوس آن قطب عالم حاصل کرد۔ ہماں زمان کلاہ چہار ترکی بر سر بندہ نہادہ اند و بشرف بیعت مشرّف گردانیدہ اند۔ و آنروز کہ بندہ بخدمت پیوست، در خاطر من بود کہ در خواجہ راستین بروم، بنشینم ۔ اگر خواجہ خود یاد کند و درون بطلبد، بروم۔ آنگاہ بیعت آرم۔ الغرض چوں بر آستانۂ خواجہ بندہ نواز رسیدم، نشستم۔

زمانی برآمد۔ دیدم مبشر کہ خدمت گار خواجہ است، بروں آمد۔سلام فرمود (وگفت) کہ اینجا ترکی آمدہ است کہ فرمان شدہ است کہ درون آید۔ بندہ برفور برخاست۔ برابرمبشر درون رفت ۔سر بر زمین نہاد ۔فرمان شد کہ سر بر کن۔ سر بر کردم۔ بر لفظ مبارک راند کہ نیکو کردی، نیک آمدی و خوش آمدی۔ مرحمت و شفقت بسیار فرمودہ اند ۔آنگاہ بشرف بیعت مشرّف شدم۔بارانی خاص وکلاہ چہارترکی عطا شد(۱۵)''۔

حضرت خواجہؒ کے دست مبارک پر امیر خسرو کے بیعت کرنے کی روداد کا غالباً یہ پہلا مأخذ ہے ۔اسی لئے امیر خسرو کے سوانح نگاروں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ حضرت خواجہؒ سے امیر خسرو کی عقیدت کا آغاز جوانی ہی سے ہوا لیکن وہ با قاعدہ طور پر آپ کے حلقۂ ارادت میں ۷۱۳ھ میں داخل ہوئے ۔ یہ ایک اہم تاریخی اطلاع ہے جس کا اولین مرجع غالباً 'افضل الفوائد' ہے ۔اس طرح دیکھا جائے تو یہ الزام/ غلط فہمی کہ 'افضل الفوائد' میں تاریخی اطلاع کا فقدان ہے اور اس میں مؤرخین کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہے ،بے بنیاد ثابت ہوتا ہے ۔اسی طرح بعض لوگوں نے 'فوائد الفواد' کے مقابلے میں 'افضل الفوائد' کے مندرجات کے معیار و اعتبار پر بھی سوال اٹھایا ہے ۔نیز امیر خسرو کی دیگر تصانیف کے مقابلے میں 'افضل الفوائد' کے اسلوب اورطرز نگارش کوفروتر بتایا ہے ۔مثال کے طور پر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''اگر'فوائد الفواد' یا 'درر نظامیہ' کے مطالب کا موازنہ 'افضل الفوائد' کے مندرجات سے کیا جائے تو معیار و اعتبار کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے(۱۶)''۔

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں :

''امیر خسرو نے بطور خود یعنی اپنے الفاظ میں 'افضل الفوائد' کے مطالب کو لکھا ہے تو اس کی فارسی امیر خسرو کے اسلوب اور مرتبہ نگارش سے کمتر ہے ۔ان کی دوسری تصانیف سے بھی مختلف ہے۔'خزائن الفتوح' میں تو وہ بہت ہی مرصّع نگار بن گئے ہیں ۔لیکن 'اعجاز خسروی' کے رسائل میں انہوں نے فارسی نثر کے جونمونے پیش کئے ہیں ،ان

میں سے کسی کا اسٹائل بھی 'افضل الفوائد' سے نہیں ملتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ
امیر خسرو نے جیسا سنا ویسا ہی قلمبند کیا ہے جو عموماً جامعین ملفوظات
کرتے بھی ہیں تو افضل الفوائد کے اسلوب کو 'فوائد الفواد' کے طرز سے
بہت زیادہ مختلف نہیں ہونا چاہئے(۱۷)''۔

پروفیسر فاروقی کی علمی جلالت کا اعتراف کرنے کے باوجود یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ 'خزائن الفتوح' اور 'اعجاز خسروی' کے اسلوب کو 'افضل الفوائد' میں تلاش کرنا امیر خسرو کے ساتھ ظلم ہے ۔ اس لئے کہ اول الذکر دونوں کتابیں بالترتیب تاریخ اور انشاء کی کتابیں ہیں جبکہ ' افضل الفوائد' امیر خسرو کے پیر و مرشد کے ملفوظات ہیں جس کو انہوں نے حتی الا مکان انہی کے الفاظ میں لکھنے اور اس کے اسلوب کو سادہ و عام فہم بنانے کی دانستہ وشعوری کوشش کی ہے ۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وحید مرزا نے 'فوائد الفواد' اور 'افضل الفوائد' کے اسلوب کا موازنہ کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ:

''دونوں کتابوں کی زبان بہت سادہ وسلیس ہے اور اُس
فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اُس زمانے میں عام طور پر بولی جاتی تھی(۱۸)''۔

جہاں تک 'افضل الفوائد' کے مندرجات کے معیار و اعتبار پر اعتراض کرنے یا سوال اٹھانے کی بات ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معترضین نے 'افضل الفوائد' کے مندرجات کا بغور مطالعہ کیا ہی نہیں ۔ ملفوظات کا یہ مجموعہ کس قدر جامعیت کا حامل ہے اور حضرت خواجہؒ کی تعلیمات کی کتنی جہتوں کو محیط ہے ،اس کا اندازہ درج ذیل موضوعات سے ہوگا جن پر مختلف تاریخوں اور متفرق مجلسوں میں حضرت خواجہؒ نے اظہار خیال فرمایا ہے :

'' فضیلت عاشورہ۔ فضیلت شش روزہ در ماہ شوال ۔فضیلت
روزہ در ایام بیض۔ فضیلت نماز در شب عید الضحیٰ۔فضیلت نماز در ماہ
شعبان ۔سخن در اصحاب سلوک۔ تذکرہ درجات مولانا فخر الدّین زاہد
ؒ۔فضیلت نماز چاشت وثواب آن۔سخن در باب بزرگان و زیر دستان ۔
در بیان عزت وحرمت پیران۔در باب حق ہمسا یگی۔سخن در قضا ،قاضی و
قاضیان۔سخن درحق پیوستن۔سخن درپُرسیدن بیماری۔سخن در امتان پیشین۔

سخن در حکایت ابلیس لعنہ اللہ۔اہل سلوک......سخن در شریف و سفیہ۔ سخن درسلوک۔ سخن در فضیلت امت محمدیہ۔ سخن در فضیلت ماہ معظم رجب۔ سخن در اصحاب اہل تحیر۔ سخن در رویت باری۔ سخن در یاد گرفتن قرآن۔ سخن دریں بود کہ اگر یکی بر یکی ظلم کند،او را دعاء بدنہ کنند۔ سخن در اخلاق پسندیدہ شیخ فرید الدّین گنج شکرؒ۔ سخن در توحید۔ سخن در آفرینش زمین و آسمان۔ سخن در فضیلت سورۂ مزمل ۔ سخن در آخر زمان۔ سخن در بزرگی اولیا ۔ سخن در بزرگی شیخ معین الدّین چشتیؒ ۔سخن در بزرگی امام شافعیؒ ۔سخن در ذکر خواجہ مالک دینارؒ۔ سخن در بزرگی خواجہ بختیار کاکیؒ ۔ سخن در جرجیس پیغمبر علیہ السلام۔ سخن در خشم باری تعالیٰ۔ سخن در بیان شب معراج۔ حکایت در مناقب امام حسین۔ سخن در ولادت رسولؐ۔ حکایت در ولادت شاہ اولیا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔ سخن در احوال رابعہ بصریؒ۔ سخن در فضیلت مہتر یونس علیہ السلام۔ سخن در برکت دست بوسیدن بزرگان۔ سخن در سماع و اہل سماع۔ سخن در امساک۔ سخن در کرامات۔ سخن در دجال لعین‘‘۔

قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ ان موضوعات و مضامین کے بیان میں حضرت خواجہؒ سرسری نہیں گذرے ہیں بلکہ قرآن و حدیث کے ساتھ آثار سلف کی روشنی میں ان تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے ۔ مکاشفات کا بیان اور معرفت وتصوف کے اہم نکات اس پر مستزاد ہیں ۔ تمام ملفوظ میں وہی الہامی کیفیت رواں دواں ہے جو حضرت خواجہؒ کے ملفوظات کا نشان امتیاز ہیں ۔ ان ملفوظات کی روشنی میں حضرت خواجہ کی شخصیت علم ظاہر و باطن کا حسین امتزاج نظر آتی ہے ۔ حضرت خواجہؒ کے وسیع مطالعہ اور ان کی بہترین یاد داشت نے بھی ان ملفوظات کو جامع، معلوماتی اور بصیرت افروز بنانے میں مدد کی ہے ۔ حضرت خواجہؒ نے ان موضوعات پر جن کتابوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے ان میں فقہ وتفسیر اور تصوف کی کتابوں کے علاوہ بزرگوں کے اوراد بھی شامل ہیں ۔ مثلاً شیخ بہاء الدّین زکریا ملتانی ، شیخ شہاب الدّین سہروردی، خواجہ عثمان ہارونی اور شیخ بدر لدّین غزنوی وغیرہ کے اوراد ۔اس کے علاوہ حضرت خواجہؒ کی گفتگو کے دوران ان کتابوں کے حوالے بار بار آئے ہیں : مونس العشاق۔ قصص انبیاء۔راحت

الارواح۔ تذکرۃ الاولیاء۔ جامع الحکایات۔تحفۃ العارفین۔ دلیل السائلین۔انیس الانس۔ کتاب العارفین۔تفسیر امام زاہدی ۔ وغیرہ ۔ سچ تو یہ ہے کہ ملفوظات حضرت خواجہؒ کے جو خصائص 'فوائد الفواد' کے حوالے سے پروفیسر فاروقی نے بیان کئے ہیں وہ 'افضل الفوائد' پر بھی صادق آتے ہیں ۔مثلاً انہوں نے لکھا ہے :

'' فوائد الفواد میں فقہ،حدیث،تفسیر، اخلاق،تصوف اور سلوک کے جو نکتے بیان ہوئے ہیں انہیں دیکھ کر کسی کو بھی یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوسکتی کہ حضرت نظام الدّینؒ اعلیٰ درجہ کا علمی ذوق رکھتے تھے۔ اور ان کی مجلسوں میں بہترین علمی نکات بیان ہوتے تھے(۱۹)''۔

یہاں 'افضل الفوائد' کے مختلف مقامات سے چند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اس کے علمی اور متصوفانہ نکات معیار کے اعتبار سے 'فوائد الفواد' سے فروتر نہیں ہیں ۔طریقت کی اصطلاح میں عارف کی تعریف بیان کرتے ہوئے حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں :

''عارف در طریقت کسی است کہ ہر لحظہ ولمحہ او در عالم تفکر باشد ۔ ہیچ چیز از آمدن و بروں شدن خلق و جز آن خبر نباشد۔ و ہر زماں از عالم غیب بر وی دمبدم حالتی پیدا آید(۲۰)''۔

ایک مقام پر شریف وسفیہ کے نفسیاتی فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''چوں شریف پارسا شود ، تواضع بر وی نماید۔وچوں سفیہ پارسا شود تکبر در وی پدید آید(۲۱)''۔

ایک مقام پر عشق حقیقی کی توضیح اشاراتی انداز میں یوں فرماتے ہیں :

'' سُرمہ عشق سرمہ ایست کہ در ہر چشمی کہ بگنجد از عرش تا فرش ہیچ حجابی نماند(۲۲)''۔

ایک جگہ نشان معرفت کے ساتھ مرد کامل کے درجات کی تشریح یوں فرماتے ہیں :

'' اول نشان معرفت آنست کہ خاموشی درو بسیار بود ۔اگر وقتی سخن گوید، بقدر حاجت گوید۔ وآنکہ مرد کامل است ۔اگرچہ او درخلوت است ہیچ وقتی وساعتی نیست کہ اوستون عرش رانمی جنباند وغلغلہ در عالم

ملکوت نیست(۲۳)''۔

ایک مقام پر قضا کی اہمیت اور منصب قاضی کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قضا و قاضی نیکو چیزیست۔اگر کردن بداندوحق آن کندو بجا آرد کہ آن قائم مقام حضرت رسالت مآبﷺ است(۲۴)''۔

ایک جگہ ضعیفوں اور عمر رسیدہ افراد کی عزت و حرمت کا خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''رسول اللہﷺ چوں در راہ پیری بدیدی، خواہ جہود خواہ مسلمان،سبب حرمت موئی سفید اوہرگز پیش نرفتی و فرمودی کہ ہر کسی کہ نشان نورحق خدا باشد،پیش اونتواں رفت(۲۵)''۔

حضرت خواجہؒ کی ذات اقدس چونکہ شریعت اور طریقت دونوں کی جامع تھی ،لہٰذا علمی وفقہی مسائل کے متوازی تصوف ومعرفت کے اہم نکات بھی 'افضل الفوائد' کے مندرجات میں شامل ہیں۔ ایسے مقامات پر حضرت خواجہ مشاہدات سے گذر کر مکاشفات تک پہنچے ہیں۔ اور ایسے تمام مقامات پر حضرت خواجہؒ کے الہامی بیانات عرفان وسلوک کے نئے نئے دریچے وا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر تصوف میں خرقہ وکلاہ اور اجازت وخلافت کے آغاز کے ساتھ اس کی فضیلت و اہمیت اور مختلف اقسام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خواجہؒ بیان فرماتے ہیں:

''روزی رسول علیہ السلام نشستہ بودہ اندو اصحاب برگرد۔مہتر جبرئیل علیہ السلام بیامد۔چہار پرکالہ جامہ پیش حضرت رسالت پناہ علیہ افضل الصّلوات والتسلیمات نہاد وگفت، یا رسول اللہ، فرمان می شود کہ ایں چہار پرکالہ از بہشت است، این را بر سر نہہ۔بعد ازاں ہر کہ را از اصحاب خود بداں،بدہ و خلیفۂ خود بگرداں۔ پس رسول اللہﷺ بستد و چہار پرکالہ را بر سر نہاد۔ بعد ازاں طاقیہ اول کہ یک ترکی فرود آورد و برسر امیر المؤمنین حضرت ابو بکر صدّیقؓ نہاد۔ طاقیہ دوم کہ دو ترکی بود ،بر سر امیرالمؤمنین عمر بن خطابؓ نہادکہ ایں کلاہ تست۔ و طاقیہ سوّم کہ سہ ترکی بود برسر امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ نہاد کہ این کلاہ تست ۔بعد

ازاں بر لفظ مبارک راند کہ طاقیہ یک ترکی کہ امیرالمؤمنین حضرت ابوبکر صدّیقؓ بر سر نہاد وآن طاقیہ ابدال و صدّیقان بر سر کنند ۔ امّا طاقیہ دو ترکی کہ امیر المؤمنین عمر بن خطابؓ بر سر نہاد ۔این طاقیہ را عباد و طبقہ اوتاد بر سر نہادہ اند۔امّا طاقیہ سہ ترکی کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ بر سر نہاد آنست کہ آنرا زہاد و اہل تحیر و مشائخ اہل خرد بیشتر نہادہ اند۔امّا طاقیہ چہار ترکی کہ جناب ولایت مآب حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ بر سر نہادہ است،آنست کہ این طاقیہ را اصحاب صفہ و سادات و مشائخ کبار بر سر نہادہ اند(۲۶)''۔

یہ روایت حضرت خواجہؒ نے اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ فرید گنج شکرؒ کی زبانی سنی تھی ۔ جنہوں نے اس کا مأخذ بھی بیان کیا تھا کہ یہ روایت تذکرہ خواجہ امام ابو اللیث سمرقندی میں حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے حوالے سے نقل ہوئی ہے ۔ اسی طرح تصوف کے ذیل میں مشائخ کی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے حضرت خواجہؒ نے یہ روایت بھی لکھی ہے :

'' وقتی رسول اللہ ﷺ درحق مشائخ پرسید ۔جبرئیل علیہ السلام گفت ۔یا محمد ۔ بدانکہ مشائخ چراغ امت تو اند و خنک آنکسی کہ حق ایشان بشناسد و دوستان حق داند۔پس ما گواہی دہیم کہ آنکس از اہل بہشت است ۔و ہر کہ ایشان را دشمن دارد از اہل دوزخ است(۲۷)''۔

'افضل الفوائد' کے ایسے مضامین کو نہ صرف 'معمولی مضامین' کہہ کر ٹال دیا گیا بلکہ یہ بھی لکھا گیا :

'' (افضل الفوائد میں) حاضرین بھی گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے نہیں ملتے ۔بات چیت اکثر بغیر کسی سیاق و سباق کے شروع ہوتی ہے اور اسی طرح اچانک ختم ہو جاتی ہے(۲۸)''۔

یہ تمام باتیں 'افضل الفوائد' کے متن سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں ۔ ہر مجلس کے ملفوظ کا بغور مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ تمام ملفوظ کے آغاز و انجام یا ابتدا و انتہا میں نظم و ضبط اور ترتیب ہے۔اچانک نہ تو بات شروع ہوتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے ۔ جہاں تک حاضرین کے گفتگو میں

حصّہ نہ لینے کی بات ہے تو حضرت خواجہؒ کی مجلسوں میں بیشتر ایسے اہل علم حاضر رہتے تھے جو شریعت وطریقت دونوں کے جامع تھے اور وہ لوگ سوالات بھی کرتے تھے اور حضرت خواجہؒ کی اجازت سے گفتگو میں حصّہ بھی لیتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تذکرہ 'سیرا لاولیا' کے مصنف امیر خورد کرمانی نے بھی کیا ہے۔حاضرین مجلس میں چند اہم نام یہ ہیں : مولانا شمس الدّین یحیٰ۔مولانا برہان الدّین غریب۔شیخ یوسف۔مولانا فخر الدّین زراوی۔ مولانا شہاب الدّین میرٹھی۔ شیخ عثمان سیاح۔ شیخ ضیاء الدّین پانی پتی۔ مولانا وجیہ الدین پائلی۔مولانا شرف الدین۔ ملک محمد میناشپوری۔ امیر حسن سجزی۔مولانا نصیرالدین گیاہی وغیرہ۔

یہ صحیح ہے کہ حاضرین مجلس حضرت خواجہؒ کی باتوں کو سنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ اور ایسا احتراماً کیا جاتا تھا۔کیونکہ بزرگوں کی مجلس میں بولنا کل بھی خلاف ادب سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو سمیت حاضرین مجلس میں سے کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو وہ پہلے ادب کے ساتھ حضرت خواجہؒ سے اجازت لیتے اور پھر اپنی بات رکھتے اور بعض لوگ درمیان میں سوالات بھی کرتے تھے اور حضرت خواجہؒ جواب بھی دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مجلس میں ایک شخص نے (امیر خسرو نے اس کا نام نہیں لکھا) حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں دریافت کیا اور آپ نے اس کا جواب بھی دیا۔امیر خسرو لکھتے ہیں :

'' بعد ازاں ،عزیزانی کہ حاضر او بودند،از میان ایشان یکی پرسید کہ امیر المؤمنین عمر بن خطابؓ را فاروق از کجا گویند۔فرمود کہ از سبب آنکہ اوفرق کردہ درمیان حق و باطل۔''

یہ حاضرین مجلس حضرت خواجہؒ کا جتنا احترام کرتے تھے ،حضرت خواجہؒ ان لوگوں کا اتنا ہی خیال بھی رکھتے تھے۔آپ ان لوگوں کی نہ صرف میزبانی فرماتے بلکہ ان کی روحانی ترقی کے لئے محفل سماع کا اہتمام بھی فرماتے۔چنانچہ ایک مجلس میں ملک محمد میناشپوری اپنے تین دوستوں کے ساتھ پہنچے۔حضرت خواجہؒ نے اپنی گفتگو روک کر بہترین مہمان نوازی کا نمونہ پیش کیا اور ان لوگوں کی خاطر تواضع کی۔امیر خسرو رقمطراز ہیں :

'' خواجہ ادام اللہ دریں فوائد بود کہ ملک محمد میناشپوری با سہ نفر دیگر رسید۔سر بر زمین نہاد۔فرمان شد۔بنشیں۔ بنشست۔ اقبال پیش

بود۔ بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بخیر فرمود ۔بیا قدری خربزہ موجود است۔
بیار۔ پیش ملک محمد بدار۔ بیاورد۔پیش ملک محمد داشت۔ بعد ازاں فرمود
قدری نبات وخرما موجود است ۔آن نیز بیار۔ آن نیز بیاورد۔فرمان شد
کہ پیش این ہر سہ نفر بدار۔ چوں پیش این بداشت۔ ہر چہار نفر
برخاستند ۔سر درقدم آوردند کہ یافتم(۲۹)''۔

اسی طرح ایک مجلس میں حاضرین مجلس کی رعایت سے حضرت خواجہؒ نے حسن قوال کو حکم دیا کہ وہ کچھ (عارفانہ کلام) پیش کریں ۔حسن قوال نے آغاز کیا۔حاضرین بیخود ہو کر حالت وجد میں آ گئے ۔جب سکون ہوا تو حضرت خواجہؒ نے سب کو لباس عطا فرمایا ۔امیر خسرو کو بھی سفید ٹوپی عنایت کی ۔خسرو نے یہ روداد یوں بیان کی ہے :

'' خواجہ ذکرہ اللہ بخیر روی سوی حسن قوال کرد کہ عزیزان
حاضر اند ۔چیزی بگو ۔چوں حسن سماع آغاز کرد۔خواجہ شیخ عثمان سیاح و
شیخ جمال لدّین ہانسوی برجستند ۔از چاشت تا نماز پیشیں در رقص بودند۔
چوں فرو داشتہ شد ہر کسی را جامہ عطا شد۔ دریں میان بندہ نیز کلاہ سفید
یافت(۳۰)''۔

اس ملفوظ میں بھی شیخ جمال الدّین ہانسوی کا نام آیا ہے ۔ان کے بارے میں میرا گمان ہے اور جس کا اظہار میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ یہ وہ شیخ جما ل الدین ہیں جو حضرت خواجہؒ کے مخصوص مریدوں میں تھے اور جو اکثر آپ کی مجلسوں میں حاضر ہوتے تھے اور جن کا ذکر 'سیر ا لاولیا' کے مصنف نے بھی کیا ہے ۔شیخ جمال الدّین ہانسوی کی شہرت کے سبب شاید اشتباہاً ان کے نام کے ساتھ ہانسوی لکھا گیا ہے ۔

امیر خسرو نے اس قسم کی ایک اور مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں حسن سجزی اور خواجہ جنید عزیز حاضر تھے ۔حضرت خواجہؒ کے حکم پر خواجہ عزیز نے پردۂ سلوک میں ایک غزل پیش کی جس کو سن کر حضرت خواجہؒ وجد میں آ گئے ۔بعد میں ان دونوں کو آپ نے جامۂ خاص عطا فرمایا۔ امیر خسرو لکھتے ہیں :

''حسن سجزی وخواجہ عزیز ندیم خاص بیامدند ۔سر بر زمین نہادند

۔خواجہ در غلبات شوق بود۔ بسیار شفقت بر ایشان فرمود۔ گفت۔ بشنید۔
آنگاہ خواجہ ذکرہ اللہ بخیر خواجہ عزیز را گفت ۔ یک غزل می باید خواند کہ حق
تعالیٰ شما را بوقت رسانیدہ است ۔خواجہ عزیز چوں غزل در پردۂ سلوک
آغاز کرد ۔ آن مجلس را چناں وقت پیدا شد کہ در وہم و فہم کسی نہ گنجد ۔
خواجہ ذکرہ اللہ بخیر جامہ خاص بخواجہ عزیز و برادرم حسن عطا کرد۔''

حضرت خواجہؒ کے دیگر ملفوظات کے مقابلے میں 'افضل الفوائد' کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ اس میں حضرت خواجہؒ کا شاعرانہ ذوق زیادہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ چنانچہ کئی مجلسوں میں خود امیر خسرو آپ کی اجازت سے فارسی کے قدیم شعراء کے اشعار آپ کو سناتے نظر آتے ہیں۔آپ دلچسپی سے سنتے ،وجد فرماتے اور انعامات وتحائف سے بھی نوازتے ۔حد تو یہ ہے کہ آخری مجلس (۱۰/ ذی قعدہ ۷۱۵ھ) میں جب حضرت خواجہؒ مریدوں پر شفقت فرماتے ہوئے اپنے سفر آخرت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے ،اُس وقت بھی آپ کی گفتگو اور اس موقع کی مناسبت سے حاضرین نے ایک شعر پڑھنے کی اجازت طلب کی اور اجازت ملنے کے بعد انہوں نے مولانا شہاب الدّین میرٹھی کا شعر پیش بھی کیا ۔یہ کہانی امیر خسرو کی زبانی :

'' بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بخیر روی سوی حاضران کرد کہ
چنانچہ امروز یکجاایم امید اینست کہ یکجا میرویم و فردا نیز یکجا خواہم
ساخت۔آنگاہ خواجہؒ این سخن بر لفظ مبارک راند۔بندہ وعزیزان دیگر
روی بر زمین آوردند ۔عرض نمودند کہ مولانا شہاب الدّین میرٹھی انصاری
یکی از بندگان مخدوم بیتی نوشتہ است ۔اگر فرمان باشد،بگویم۔فرمود بگو۔
من از تو ہیچ مراد دگر نمی خواہم ہمیں قدر بکنی کز خودم جدا نکنی(۳۱)۔

اسی شعر پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے ۔

حواشی

(۱) امیر خسرو ۔وحید مرزا۔ص ۳۱۹
(۲) تاریخ مشایخ چشت (جلد اول) خلیق احمد نظامی۔ص ۴۴۴
(۳) امیر خسرو :احوال و آثار۔ڈاکٹر نور الحسن انصاری۔ص ۳۴۷

(۴) ایضاً۔ص ۳۴۶
(۵) افضل الفوائد۔قلمی ۔نسخہ خدا بخش ۔ص۱۰۴
(۶) امیر خسرو ۔وحید مرزا ۔ص ۳۱۶
(۷) حیات خسرو ۔ علامہ شبلی ۔ص ۲۳
(۸) حیات طیبہ حضرت محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ خواجہ محمد نظام الدّین اولیاء قدس سرہ۔مرتب:
علامہ اخلاق حسین دہلوی۔ص ۱۲۵
(۹) ایضاً۔ص ۱۴۸۔۱۴۹
(۱۰) امیر خسرو :احوال وآثار ۔ڈاکٹر نور الحسن انصاری۔ص۳۵۲
(۱۱) ایضاً۔ص ۳۵۹
(۱۲) سیر الاولیا۔امیر خورد کرمانی ۔باب پنجم ۔ص ۳۱۵
(۱۳) ایضاً۔ص ۳۱۵
(۱۴) افضل الفوائد۔قلمی ۔نسخہ خدا بخش۔ص۱
(۱۵) ایضاً ۔ص۲
(۱۶) امیر خسرو :احوال وآثار ۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری ۔ص۳۵۰
(۱۷) ایضاً۔ص۳۶۲
(۱۸) امیر خسرو ۔وحید مرزا ۔ص ۳۱۶
(۱۹) امیر خسرو :احوال وآثار ۔ڈاکٹر نور الحسن انصاری ۔ص ۳۵۰
(۲۰) افضل الفوائد ۔قلمی ۔نسخہ خدا بخش۔ص۶۱
(۲۱) ایضاً۔ص ۳۶
(۲۲) ایضاً۔ص۲۴
(۲۳) ایضاً۔ص ۸۵
(۲۴) ایضاً۔ص ۱۹
(۲۵) ایضاً ۔ص۱۷
(۲۶) ایضاً۔ص ۳ و۴

(۲۷) ایضاً۔ص ۱۶

(۲۸) امیر خسرو :احوال و آثار۔ڈاکٹر نور الحسن انصاری۔ص ۳۵۱

(۲۹) افضل الفوائد۔قلمی۔نسخہ خدا بخش۔ص ۱۰

(۳۰) ایضاً۔ص ۱۲

(۳۱) ایضاً ۔ص ۱۲۴

منابع

(۱) تاریخ ادبیات در ایران (جلد سوم) ۔ دکتر ذبیح اللہ صفا ۔انتشارات فردوس ۔ تہران ۔ ۱۳۶۹۔ چاپ ششم

(۲) ہشت بہشت ۔ملفوظات خواجگان چشت ۔ مکتبہ جام نور

(۳) فوائد الفواد ۔(اردو ترجمہ) پروفیسر محمد سرور۔ شعبۂ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب ۔ لاہور۔طبع سوم۔مئی ۱۹۴۵ء

(۴) حیات خسرو ۔علامہ شبلی ۔ جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی ۔

(۵) امیر خسرو ۔محمد وحید مرزا ۔مطبوعہ ہندوستانی اکادمی الہ باد ۔۱۹۴۹ء

(۶) نقد ملفوظات ۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی ۔ مکتبہ جامعہ ۔نئی دہلی۔ ۱۹۸۹ء

(۷) امیر خسرو:احوال و آثار ۔ڈاکٹر نور الحسن انصاری ۔مکتبہ شاہراہ۔ اردو بازار ۔دہلی ۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء

(۸) تاریخ مشائخ چشت (جلد اول) پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ ادارہ ادبیات دہلی ۔۱۹۸۰ء

(۹) سیرا لاولیا ۔امیر خورد کرمانی ۔مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۔اسلام آباد ۔۱۹۷۸ء

(۱۰) حیات طیبہ حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ محمد نظام الدّین اولیاء قدس سرہ۔مرتب: علامہ اخلاق حسین دہلوی۔طبع اول۔۱۹۶۴ء۔ناشر؛فضل برادران۔لال محل حضرت نظام الدّین، نئی دہلی۔

☆☆☆

پیشکش : ڈاکٹر فرد الحسن

قاضی عبد الودود کے خطوط

ڈاکٹر محمد حسن کے نام

پٹنہ، ۱۶/۵/۵۷ء

شفیق مکرم! آپ نے مآخذ کے متعلق دریافت کیا تھا اس سوال کا جواب دینا بھول گیا تھا، اس لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ متاخرین کے کئی تذکرے ایسے ہیں جن سے آپ نے کام نہیں لیا اور اخبارات و رسائل کے بہت سے مضامین ہیں جو ظاہرا آپ کی نظر سے نہیں گذرے مگر مفید مطلب ہو سکتے تھے، تفاصیل آئندہ۔

(۱) ''قبلہ گاہ من بہ فردوس آہ رفت'' ۱۲۹۶ ص۱۱۱ مگر اس سے ۱۲۹۱ مستخرج۔ ۱۲۹۶ بہ فردوس لکھنے سے نکلے گا۔ (۲) امید ہوگئی چہ ہر ایک مرد غریب= ۱۹۰۰، ص۱۱۹ مگر اس مصرع سے ۱۸۰۴ بر آمد ہوتا ہے، (۳) اردو کے محاورات اور مصطلحات میں سے کچھ تپش نے شمس البیان میں سے اسناد پیش کئے تھے۔ اور ان کا رسالہ چھپ بھی گیا ہے۔ اس کے بہت بعد نکہت دہلوی نے مخزن فوائد لکھی اور یہ بھی طبع ہوگئی ہے۔ اس کی ضخامت سرمایۂ اردو سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ ہوگی (اس وقت دونوں میں سے کوئی سامنے نہیں) اور اس میں اسناد بکثرت ہیں، فرہنگ آصفیہ پر کچھ تبصرے بھی کسی دوسرے نام سے سرمایہ زبان اردو سے قبل شایع ہو چکے تھے اس میں امیر الغات کے مولف کے متعلق یہ خیال کہ وہ سرمایۂ زبان اردو کے متعلم ہیں (ص۱۳۹) درست نہیں، سرمایۂ زبان اردو کی بحث آپ کی کتاب میں بالکل ناکافی ہے۔ کتاب کے مطالب پر زیادہ گہری نظر ڈالنی تھی۔ اوپر جو باتیں حوالۂ قلم ہوئی ہیں ان میں سے کوئی مکرر ہو تو معاف کیجئے گا۔

عبد الودود

☆

پٹنہ، ۲۰/۱۱/ ۵۸ء

شفیق مکرم! آپ کے خط کی رسید جا چکی ہے۔ جواب لکھتے وقت تلاش کیا تو نہ ملا، مجبورا جو کچھ یاد ہے، اسی جواب پر اکتفا کرتا ہوں، کسی سوال کی طرف توجہ نہ ہوئی ہو تو براہ کرم اسے پھر لکھیں۔

(۱) شیخ چاند مرحوم نے سودا کا جو سال ولادت بتایا ہے۔ اس سے مجھے قطعا اتفاق نہیں۔ سنہ ۱۱۲۵ بھی صحیح نہیں۔ میرے نزدیک سنہ ۱۱۱۵ تا سنہ ۱۱۱۸ زمانۂ پیدائش ہے۔ (۲) سودا کے ہاتھ کی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی۔ انڈیا آفس میں ایک دیوان ہے جس کے متعلق یہ خیال ہے کہ خود سودا نے نائب رزیڈنٹ اودھ کو دیا تھا، قدیم ترین نسخۂ کلیات وہ ہے جو کتب خانۂ حبیب گنج میں ہے۔ کوئی ایسا نسخہ جو جامع ہو نہیں ہے۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔

یہ میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جواب میں دیر ہوگی۔ خیال یہ تھا کہ مفصل جواب دیتا لیکن اس سے قطع نظر کہ آپ کا خط ہی غائب ہوگیا ہے۔ مختلف اقسام کی مصروفیتیں بیک وقت ہیں اور تفصیلی جواب فی الحال ممکن نہیں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا خط عجب اتفاق کہ تلاش کے بعد مل گیا۔ دوسرا کارڈ ملاحظہ ہو۔

مخلص، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱۰/۱۲/ ۵۸ء

شفیق مکرم! ابھی آپ کا خط ملا، مسلم یونیورسٹی گزٹ کا صرف ایک شمارہ اس وقت تک پہنچا ہے۔ اس کا شکریہ۔ آبرو وغیرہ کے متعلق یہاں بہت کم مواد آپ کو ملے گا۔ آبرو کے دیوان کا ایک نسخہ دیسنہ میں ہے۔ میرے پاس ایک بیاض میں ایک مثنوی ہے۔ مگر غالبا مکمل نہیں۔ یہ چھپ بھی چکی ہے۔ ''ایہام'' عربی لفظ ہے اور صنائع پر جو عربی کتابیں ہیں اسے دیکھیں۔ صنائع کی جو کتاب فرخی کی طرف منسوب ہے اور در اصل ایک اور شخص کی ہے ترکی میں طبع ہوگئی ہے، اس میں اور رشید وطواط کی کتاب میں بھی یہ ملے گا۔ فارسی کی مسلم صنائع میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اوائل عہد محمد شاہ میں اس کا غلبہ ہندی نہیں، بلکہ اس عہد کی فارسی کی وجہ سے ہے۔ میں چند دنوں میں کلکتہ جا رہا ہوں۔ پھر حیدر آباد کا ارادہ ہے۔ رام پور وغیرہ بھی جانا چاہتا ہوں، سوالات کا مختصر جواب اس وقت بھی دے سکتا ہوں۔ مفصل جواب دینے کا وقت

مہینوں کے بعد ملے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا ذاتی کر دیتا ہوں۔ یہ بڑا عیب ہے۔ مجھے یہ کام کرنا چاہیے، کہ سب سے پہلے ادھورے کاموں کو مکمل کروں مگر یہ نہیں ہوسکتا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص، عبدالودود

فی الحال کوئی بات دریافت طلب ہو تو لکھیں کتابوں کی طرف رجوع کئے بغیر جواب سے سکا تو ضرور دوں گا۔

☆

گیسٹ ہاؤس، ۶۱/۳/۱۱ء

شفیق مکرم! میں آپ کے ڈپارٹمنٹ میں دیر تک رہا مگر آپ سے ملاقات کی صورت نہ نکلی۔

میں چونکہ ۲۲/ مارچ کو پھر علی گڑھ آرہا ہوں۔ آپ کے یہاں آنا اس مرتبہ کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔

رائے بریلی کا نسخہ دیوان سودا آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ کیا یہ سمجھنے کی کوئی وجہ ہے کہ سودا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جواب براہ کرم پٹنہ کے پتے پر عنایت ہو۔

مخلص عبدالودود

خط کا جواب اگر ممکن ہو تو فوراً عنایت ہو۔

☆

پٹنہ، ۶۱/۳/۲۹ء

شفیق مکرم! آپ کا خط ملا۔ آپ سے اس بار ملاقات نہ ہونے کا بہت افسوس رہا۔

معاصر کے لئے میں نے سید حسن سے کہہ دیا ہے، وہ کہتے تھے کہ اس سلسلے میں آپ سے زبانی گفتگو ہوئی تھی۔

تذکرۂ مسرت افزا معاصر میں باقساط شایع ہوگیا ہے، مگر میں نے بہت سے اشعار اس بنا پر خارج کر دیے ہیں کہ وہ مطبوعہ تذکروں یا دواوین میں موجود ہیں۔

دیوان سودا (بریلی) کے متعلق یہ دعوی کیوں کیا جاتا ہے کہ خود سودا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور آپ کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ دعویٰ غلط ہے۔

اپریل میں بشرطیکہ کمیٹی کا جلسہ اس مہینے میں ہو، علی گڑھ آنا ہوگا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص، عبدالودود

☆

پٹنہ،۲۳/۵/۶۱ء

شفیق مکرم، ابھی آپ کا خط ملا، آپ نے اچھا کیا جو مجھے بتا یا کہ ڈاکٹر فاروقی نے میرے متعلق کیا لکھا ہے۔ موصوف حق بجانب ہیں، ایک برس کے لیے یورپ گئے، کیا کیا کرتے، فرانسیسی سیکھتے یا میتھوڈولوجی اوف ریسرچ پر لکچر سنتے۔ ذیل میں دتاسی کی فرانسیسی عبارت منقول ہے۔ آپ فرانسیسی نہ جانتے ہوں تو ثریا سلطان یا کسی اور سے ترجمہ کرالیں۔ عبارت حاشیہ میں ہے اور وہ مجلس فضلی سے متعلق ہے (طبع ثانی ص ۴۵۷)۔

...... est apparemment cet ouverage qu'on trovue manuscrit a la bibliotheque de Fort william, et non de گل مغفرت حیدر.

اس کا ترجمہ یہ ہے: ''ظاہرا یہی کتاب (یعنی وہ مجلس فضلی) کا مخطوطہ فورٹ ولیم کالج میں ہے۔ گل مغفرت کا خطی نسخہ نہیں''۔

آپ کو اطمینان ہوجائے کہ میرا ترجمہ صحیح ہے تو آپ اس کے بارے میں کچھ لکھیے، معاصر کے لئے منتظمین کو کہہ دیا تھا، پھر کہوں گا، بریلی والا نسخہ ضرور دیکھیں عیارستان میں جواضافہ میں نے کیا ہے، وہ بالکل آخر میں ہے بعنوان دیگر، اسے بھی بہت دن ہوئے، کیا یہ آپ کے پاس نہیں ہے؟ ہونا چاہیے۔

فورٹ ولیم کالج کی فہرست میں فضلی کی کتاب ہے یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ جب جب میں نے فہرست منگوائی نہ ملی۔ ایک کتاب ہے قلق کا شہر آشوب میں نے اڈٹ کیا ہے ابھی شایع نہیں ہوا چند اوراق کی طباعت باقی ہے، ایک تذکرہ تذکرہ الذکار کا خلاصہ کیا ہے، یہ زیر طبع ہے۔ کلیات سودا مطبوعہ پر ایک طویل مضمون ''سویرا'' کو بھیجا ہے، مگر یہ نامکمل ہے۔ میں نے واپس مانگا ہے، دیکھیں ایڈیٹر صاحب واپس کر دیتے ہیں یا نامکمل ہی شایع کرتے ہیں۔

مخلص، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۲۵/۵/۶۱ء

شفیق مکرم! عوامی دور کا شمارہ ۱۹/اپریل آج کسی صاحب نے بھیج دیا ہے۔ اس

میں یہ مرقوم ہے کہ آپ کسی ایسے فرد کے لئے کوشاں ہیں جس کا تعلق ف سے ہے، کل کے خط میں میں نے تردید کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اسے کالعدم سمجھئے، موجودہ حالات میں یہ آپ کے لئے مناسب نہ ہوگا۔

اتفاق یہ ہے کہ کلیات سودا مطبوعہ کا آخری ورق مل گیا، اور میں نے اسے لاہور بھیج دیا، پٹنہ میں کلیات سودا کا ایک خطی نسخہ ہے، میں نے اس پر بھی ایک مضمون لکھا ہے، مگر ابھی کسی رسالے کو بھیجا نہیں، بریلی والے نسخے کے متعلق جب آپ اسے دیکھیں اپنی رائے لکھیے گا۔

مخلص، عبد الودود

☆

پٹنہ، ۱/ جون ۶۱ء

شفیق مکرم! آپ کا خط ملا، ہماری زبان میں سرور کے متعلق کوئی تحریر نہیں چھپی۔

کلیات مطبوعہ سودا پہ جو مقالہ میں نے لکھا ہے، اس میں کلیات کے ایک خطی نسخے کا بھی ذکر ہے، جو ابھی حال میں کتب خانۂ خدا بخش کے لیے خریدا گیا ہے، اس مقالے میں اس نسخے سے کچھ کلام جس میں سے کچھ یقیناً الحاقی ہے۔ نقل کیا گیا ہے، اور مطبوعہ نسخے کے الحاقی کلام سے مفصل بحث کی گئی ہے، خطی نسخے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک قصیدہ جس کا ممدوح کلیات مطبوعہ میں شجاع الدولہ ہے، دراصل ایک اور شخص یعقوب علی خاں کی مدح میں تھا، مدیر ''سویرا'' کی فرمائش پر یہ مقالہ انہیں ''سویرا'' کے آیندہ شمارے میں اشاعت کے لیے دیا گیا تھا، لیکن آخری وقت بھیجتے وقت نہ ملا تھا، اور میں نے انہیں لکھ دیا تھا کہ یوں ہی چھاپ دیجئے، اس کی تکمیل بعد کو ہوجائے گی۔ انہوں نے یہ چاہا کہ تکمیل فوراً کر دی جائے۔ میں نے مضمون واپس مانگا لیکن چونکہ گمشدہ ورق چند ہی دنوں کے بعد مل گیا تھا۔ میں نے اسے ہوائی ڈاک سے انہیں روانہ کر دیا۔ دیکھیے یہ مقالہ آیندہ اشاعت میں چھپتا ہے یا نہیں۔ میں نے ایک دوسرے خطی نسخے پر بھی ایک مقالہ لکھا ہے اور اسے نوائے ادب کو بھیجا ہے۔ یہ نسخہ بھی ابھی حال میں حاصل کیا گیا ہے، اور اس میں بھی ایسا کلام ہے جو کلیات مطبوعہ میں نہیں۔ اس کا کچھ حصہ بھی مجھے الحاقی معلوم ہوتا ہے، سب رس میں کچھ دنوں قبل کچھ سودا کے بارے میں، جو مضمون میرا چھپا تھا، نظر سے نہ گزرا ہو تو اسے ضرور دیکھیے لیکن اس میں چھاپے کی غلطیاں ہیں۔

اس سال قاطع برہان اور رسائل متعلقہ کی اشاعت (ایک جلد میں) ضروری ہے۔

مصحفی کے بارے میں جو میرے مقالات ہیں انہیں بھی بعض نئے مقالات کے ساتھ اس سال شایع کرنا چاہتا ہوں۔ شہر آشوب کے بعض شعراء ابھی نہیں چھپے اور تذکرۃ الابرار کا خلاصہ کاتب لکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ مصنف کے سفرنامۂ لکھنؤ کا خلاصہ بھی ہوگا، یہ سب سید حسن صاحب نے (گورنمنٹ عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ) تیار کیا ہے۔ اپنی بیگم صاحبہ کو میری دعا کہیے اور میری طرف سے پرسش مزاج کیجئے۔ امید ہے کہ وہ جلد شفایاب ہو جائیں گی۔

عبد الودود

☆

پٹنہ، ۱۳/ جون ۶۱ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

کلکتہ میں حیدری کی گل مغفرت کا نسخہ ہے۔ یہ فارسی کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ فضلی کی کتاب اردو میں ہے، خود اردو میں اس کا کیا ترجمہ ہوتا، جاوید نہال صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

معیار لکھنؤ کا فائل میرے علم میں یہاں کہیں نہیں۔ رسوا کی غزلیں بتخلص مرزا 'ناول' نامی ایک رسالے میں بھی شایع ہوا کرتی تھیں۔ آپ کی بیگم صاحبہ کو دعائیں۔

خیر طلب، عبد الودود

☆

پٹنہ، ۲/ جولائی ۶۱ء

عزیزی! آپ کا خط مورخہ ۲۹/ جون ملا۔ ''تذکرۂ شوق'' کے دو نسخے حیدرآباد میں ہیں ایک کتب خانۂ آصفیہ میں (کتاب خانے کا نیا نام کچھ اور ہو) ایک نسخہ جو بیگم حبیب الرحمٰن رسوا کی مِلک تھا، فی الحال دار المصنفین علی گڑھ میں ہے۔ ایک نسخہ وہ ہے جس کے خلاصہ ابواللیث صدیقی نے تیار کیا تھا۔ غالباً یہ نسخہ انہیں کے پاس ہے۔ ایک نسخہ کتب خانۂ سر یرام کا تھا، جو کیفی صاحب کی تحویل میں تھا۔ ان کی کتابوں کے ساتھ جو لاہور میں تھیں ضایع ہوگیا۔ کسی اور نسخے کا مجھے علم نہیں، میرے پاس ایک نسخہ ہے، مگر حال کا اور ناقص۔

یادداشت قاضی عبد الودود کی پہلی قسط (متعلق فارسی) آہنگ دہلی کو اشاعت کے لیے دی گئی تھی اور چھپ گئی تھی، پروف میں نے دیکھا تھا، وہ رسالہ جس میں یہ قسط شامل ہوتی

اب تک نہیں نکلا۔ دوسری قسط معاصر میں شایع ہوئی ہے اور تیسری کی کتابت ہو رہی ہے، چوتھی میں نے اشارہ پٹنہ کو اشاعت کے لئے دی ہے۔

متعدد اصحاب نے میرے مضامین کی فہرست تیار کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن یہ ارادہ اب تک قوت سے فعل میں نہیں آیا۔

سودا سے متعلق میرا ایک مضمون سویرا اور دوسرا نوائے ادب میں شایع ہو گئے باقی معاصر میں ہیں، معاصر کی فائل کے بارے میں منتظمین سے کہوں گا۔ آپ کی بیگم صاحب کے امتحان کا کیا ہوا؟ انہیں دعا کہہ دیجئے، ڈاکٹر نذیر احمد کہاں ہیں؟ خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱۹/ جولائی ۶۱ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ بچی کی پیدائش کی مبارکباد۔ معاصر حصہ میں سودا کا کتب بھی شایع ہوا تھا، اور سودا سے متعلق میرا ایک مضمون سب رس میں نکلا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا خط آ گیا ہے۔

سوز کا کلیات جونیر صاحب نے مرتب کیا ہے، زیر طبع ہے چھ سات جز چھپ چکے ہیں۔

یادداشت اور فہرست مضامین کے بارے میں علی گڑھ میں گفتگو ہوگی۔ علی گڑھ والوں نے ابھی کمیٹی کے جلسے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی، غالبا اگست میں جلسہ ہوگا۔

آپ کی بیگم صاحبہ کو دعا اور بچی کی پیدایش کی مبارک باد

خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱۶/ اکتوبر ۶۱ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ ''ہوسکا'' کیا معنی، آپ ضرور پٹنہ آئیں۔

''تحقیق'' کی طباعت کا انتظام محمد عتیق صدیقی صاحب نے اپنے ذمے لیا تھا۔ لیکن وہ سری نگر چلے گئے اس کی وجہ سے یہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شایع نہ ہوسکا۔

اپنی بیگم صاحبہ کو میری دعا کہیے۔ خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ۔۴

عزیزی! ایک خط لکھ چکا ہوں، جواب نہیں آیا، کلیات سودا کا مطبوعہ نسخہ شائع کردہ سویرا کا ایک نسخہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے پاس آپ کے لئے بھیج چکا ہوں۔ اگر نہ ملا ہو تو ان سے منگوا لیں۔

معاصر کے لیے مضمون بھیجئے۔

اپنی بیگم صاحبہ کو میری دعا کہیے۔ امید ہے آپ ہمہ وجوہ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۲۳/ اگست ۶۲ء

عزیزی! معاملۂ معلومہ میں میرا کچھ کرنا ممکن نہیں، کچھ کروں تو آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے، فائدہ نہیں، تفصیل زبانی بیان کروں گا، چند ہفتوں میں علی گڑھ آنے کا ارادہ ہے۔

خیر طلب، عبدالودود

آج کل کچھ عدیم الفرصت ہوں، دو چار دن میں عازم کلکتہ ہوں، آپ نے بطور مقدمہ جو کچھ لکھا ہے وہ غالباً نقوش میں چھپ چکا ہے، ادارے میں دیکھ چکا ہوں، یہی وجہ ہوئی کہ اس بار اسے نہیں پڑھا۔ کچھ دنوں کے بعد اور یہ علی گڑھ سے واپسی کے بعد ہی ہوسکتا ہے، میں اسے پھر دیکھوں گا۔

تبصرۂ تذکرۂ سرور کی کتابت ہوچکی ہے۔

☆

پٹنہ، ۳۰/ اگست ۶۲ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ ناجی کا مختصر سا دیوان ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے، جس کے متعلق میں نے ایک یادداشت بھی لکھی تھی جو میرے کاغذات میں ہوگی، ضخیم دیوان جو آپ کے پاس مستعار آیا، اس تخلص کے کسی اور شاعر کا ہوگا۔ مسعود حسن رضوی صاحب پے ان ناجی کی بہت سی غزلیں ہیں، نقل منگوائی تو کسی اور شاعر کا کلام نکلا۔ میں کلکتہ جاؤں گا تو دیوان محمد شاکر ناجی کا شمارہ لیتا آؤں گا۔

آپ کا مقدمہ کچھ دنوں کے بعد پڑھوں گا۔

شخص معلوم مدتوں سے کبھی کھلم کھلا اور کبھی در پردہ میری مخالفت کرتے آئے ہیں۔

غالباً ستمبر میں علی گڑھ آؤں گا۔ اس کا بہت شکریہ کہ آپ مجھ کو ہی ساتھ ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں آیندہ لکھوں گا۔

تذکرۂ سرور کے تبصرے کی کتابت دہلی میں ہوئی ابھی کاپیوں کی تصحیح نہیں ہوئی، ''تحقیق''، میں چھپے گا، تین شمارے ایک ساتھ نکالیں گے۔

اپنی بیگم کو میری دعا کہیے۔ خیر طلب، عبدا لودود

☆

پٹنہ، ۸/ستمبر ۶۲ء

عزیزی، آپ کا خط ملا۔ میں تین چار دنوں کے بعد کلکتہ جاؤں گا، میں ایشیاٹک سوسائٹی کے کارکنوں کو بتا دوں گا کہ محمد شاکر ناجی کا دیوان دوسرے ناجی کے دیوان سے مختلف ہے۔ اس صورت میں اگر وہ مستعار دینے پر راضی ہوئے تو وہی نسخہ بھیجیں گے، جو آپ کو مطلوب ہے۔ یہ بات کہ نسخہ عاریۃً ملے گا یا نہیں، انہیں لوگوں سے معلوم ہو سکتی ہے، شخص معلوم کے متعلق میں کوئی صورت بتا نہیں سکتا۔ تذکرہ سرور کا نامکمل مسودہ بھی تو دہلی میں تھا، ابھی تک کاپیاں وہاں سے نہیں آئیں۔ ایسا تو نہیں چار صفحے اور لکھنے ہوں گے۔

علی گڑھ آؤں گا ضرور، لیکن ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ پہلے وہاں جاؤں یا دہلی۔ رام پور کا بھی ارادہ ہے۔

خیر طلب عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱۵/ستمبر ۶۲ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ میں منگل کو کلکتہ جاؤں گا۔ محمد شاکر ناجی کا دیوان آپ دیکھ ہی چکے ہیں، تو پھر آپ نے یہ کس طرح لکھا تھا کہ ناجی تخلص کے ایک دوسرے شاعر کا دیوان کلکتہ سے آیا تھا؟

مختار الدین احمد یہاں آئے ہوئے ہیں، ان سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مجنوں صاحب کا تقرر ہوا۔ یہ بات کہ اختر صاحب علی گڑھ نہ جائیں گے۔ میں سید حسن صاحب سے پہلے ہی سن چکا تھا، تذکرۂ سرور میرے پاس ہے؟ دوازدہ مجلس شایع ہوگئی یا نہیں؟

کلکتہ کا پتا۔ بوساطت شاہ مقبول احمد

16, wellesley squre, colcutta-16

اپنی بیگم صاحب کو دعا کہیے۔ خیر طلب، عبدالودود

☆

بوساطت شاہ مقبول احمد

16, E wellesty Squre, calcutta-16

۲۰/ستمبر ۶۲ء

دیوان ناجی کا شمار قلمی فہرست میں ۵۴ ہے، غالبًا میں نے ایک کو لکھا تھا کہ کلکتہ کی ایک خاتون اسے مرتب کرنا چاہتی تھیں، معلوم ہوا کہ یہ کتاب انہیں کو مستعار دی گئی ہے، اگر وہ مجھ سے ملیں تو یہ علم ہوگا کہ ان کا کام کس حد تک آگے بڑھا ہے۔

میں ایک ہفتہ یہاں ٹھہروں گا۔ ہاں،

یہ خبر ملی کہ اب سوسائٹی میں اس کا انتظام ہوگیا ہے کہ مائکروفلم کی جا سکے۔

عبدالودود

☆

۳/اکتوبر ۶۲ء

عزیزی! آپ کا خط مورخہ ۲۷/ستمبر آج ملا، فاطمہ محمود صاحبہ مجھ سے نہ ملیں، خبر نہیں میرے کلکتہ جانے کی انہیں اطلاع بھی لکھی یا نہیں، یہ بات کہ دیوان ناجی ان کے پاس ہے، مجھے ان صاحب سے معلوم ہوئی تھی جو سوسائٹی کے عربی، فارسی اردو مخطوطات و منظومات کے خازن ہیں۔

یہ شاید پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب سوسائٹی میں اس کا انتظام ہوگیا ہے کہ مائکروفلم باہر بھیجی جا سکے۔

میں اب اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر میں گھر سے باہر نکلوں گا۔

امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۸/نومبر ۶۸ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ میں اپنے بھائی کی سخت بیماری کی خبر سن کر یکا یک دہلی سے چلا آیا۔ انہیں قلب کا مرض ہوگیا ہے۔ حملہ شدید تھا لیکن اب پہلے سے بہتر ہیں۔

کتاب اگر کوئی صاحب دہلی سے نومبر کے تیسرے ہفتے میں آنے والے ہوں تو ان کی معرفت جیسا کہ آپ نے لکھا ہے بھیج دیں اور ممکن ہو تو کلیات سودا نسخۂ لندن کا ایک نسخہ بھی۔ اس کی قیمت میں ادا کر دوں گا۔ اگر وہ صاحب بعد کو آنے والے ہوں تو ڈاک سے روانہ ہو۔ امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر طلب، عبدالودود

☆

نئی دہلی، ۲۱/جنوری ۶۹ء

عزیزی! مجھ سے ایک شخص آ کر کہا کہ ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ۴ بجے آجائیں گے، میں نے کہا کہ اچھی بات ہے۔ ۴ بجے اس نے آ کر کہا کہ وہ صاحب آگئے اور وہ ہروانی صاحب نکلے۔ ساڑھے ۴ بجے کے بعد سخت ضرورت (کمیٹی کا کام) سے باہر جانا پڑا، بنظر احتیاط کہہ دیا کہ جلد واپس آجاؤں گا کوئی آئے تو بٹھا یا جائے۔ آپ آئے تو نہ جانے آپ سے کیا کہا گیا، مجھے آپ کا خط ملا، مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل ملاقات نہ ہوسکی۔

یہ کارڈ اگر آج مل جائے تو کل صبح آپ مجھے یہاں فون کریں اور میں یہاں نہ ملوں تو نورالدین احمد صاحب کے یہاں، میں اب تک ان کے یہاں نہ جا سکا ہوں۔ مصروفیت غیر معمولی رہی ہے۔ یہ بتایئے کہ دیوان وحشت کلکتوی یہاں ہے؟ پٹیالہ میں غالبا اس کے عہد سے متعلق کوئی اہم شئے ہے۔

میں ۲۳/ کی شب کو اگر نہیں گیا تو ۲۴/ کو ہوائی جہاز سے جاؤں گا۔

خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۲۶/جنوری ۶۹ء

عزیزی! مجھ سے فخر الدین علی احمد صاحب کے یہاں کے ملازمین میں سے کسی نے کہا تھا کہ ڈاکٹر حسن (محمد حسن نہیں) ۴ بجے شام کو ملنا چاہتے ہیں، میں نے جواب دیا کہ

اچھی بات ہے، ٹھیک چار بجے اس نے اطلاع دی کہ وہ صاحب جنھوں نے فون کیا تھا، ملنے آئے ہیں، میں سمجھا کہ آپ ہیں، مگر وہ ہروانی صاحب نکلے۔ اس کے بعد ایک اور صاحب آگئے جن کے ساتھ ضروری کام سے مجھ کو باہر جانا پڑا، مگر دفتر والوں کو میں نے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی صاحب آئیں تو وہ میرا انتظار کریں میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ آپ سے کسی نے اس بارے میں کہا ہی نہیں، اور آپ واپس چلے گئے، اس کا مجھے سخت افسوس ہے۔ دوسرے دن آپ اور آپ کی بیگم آئیں مگر جلسے میں شرکت کی وجہ سے ملاقات برائے نام ہی رہی اور جب میں جلسے سے فارغ ہوکر آیا تو معلوم ہوا کہ آپ چلے گئے، میں جلد ہی پھر آرہا ہوں، اور قبل سے ہی اطلاع دوں گا۔

ممکن ہو تو آپ مرکزی غالب اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر ۱۰۰/ روپے ادا کر کے بن جائیں آپ کل تقریبات متعلقہ میں بغیر کچھ ادا کئے ہی شریک ہوسکیں گے اور آئندہ بھی رعایات کے مستحق ہوں گے۔ آپ دوسروں کو بھی ممبر بنا سکتے ہیں، روپے فخر الدین علی احمد صاحب یا ٹریژرکونہیں بیگم فخر الدین علی احمد کو میرے حوالے سے بھیجے جائیں، وہ رسیدیں بھجوا دیں گی، اور ان کے ذریعے سے جو لوگ ممبر ہوں گے ان کے ٹکٹ وغیرہ انہیں کی وساطت سے ملیں گے وہ کمیٹی کی چیرمین ہیں، اب آپ کی بیگم صاحبہ یا کچھ اور لوگ ان کی مدد کرنا چاہیں تو انہیں اس کے بارے میں کہہ دیں وہ نام لکھ لیں گی۔ امید ہے کہ کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

دہلی، ۲۳/ اکتوبر ۰۷ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ دسمبر میں جلسۂ عام ہونے والا ہے، جس میں یہ تجویز پیش ہوگی کہ ٹرسٹ قائم ہو۔ منظور ہوگئی تو ٹرسٹ قائم ہوگا اور کل معاملات کا وہی فیصلہ کیا کرے گا۔

آپ نے جس امر کے متعلق لکھا ہے میں اس کا خیال رکھوں گا، مگر ابھی ایسی کوئی بات زیرغور نہیں، اور نہ یہ خبر ہے کہ مالی حالت اس کا اجازت بھی دے گی یا نہیں۔

ویزا مل گیا اور ابھی یہ معلوم ہوا کہ عراقی ایرویز کے جہاز میں دوشنبے کی صبح کو روانہ ہوتا ہے۔ جگہ مل سکتی ہے۔ میں نے فخر الدین صاحب کے ایک پرسنل اسٹنٹ کو ٹکٹ کی

خریداری کے لئے روپے دے دئے ہیں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ، ۶/ اپریل ۷۱ء

عزیزی! عصری ادب کا ایک شمارہ ملا، شکریہ۔

میری طبیعت ٹھیک نہ تھی، اس لیے اس سے قبل اس کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا۔ آخری بار جو میں دہلی میں تھا، تو مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے ٹیلی فون پر وعدہ کیا تھا کہ ملوں گا۔ مگر یہ وعدہ ایفا نہ ہوسکا، ممکن ہے اپریل میں دہلی میں آؤں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

ہاں، یہ نہرو یونیورسٹی کیا ہے؟ کن امور میں یہ دوسری یونیورسٹیوں سے الگ ہے؟

☆

پٹنہ، ۵/ اکتوبر ۷۱ء

عزیزی! میں جلد دہلی آنے والا ہوں، میں یا تو 1، ولنگڈن کریسنٹ میں ٹھہروں گا یا وہاں سے معلوم ہوسکے گا کہ کہاں مقیم ہوں، معاملۂ معلومہ کے متعلق زبانی گفتگو ہوگی۔

اپنی بیوی کو میری دعا کہیے۔ خیر طلب، قاضی عبدالودود

ہاتھوں کا وہی حال ہے جو تھا۔

☆

دہلی، ۱۸/ اکتوبر ۷۱ء

عزیزی! میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ میں ۱۱/ اکتوبر کو دہلی پہنچوں گا، نہ آپ ملے، نہ آپ نے ٹیلی فون کیا۔

ابھی یہاں ہوں۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ، ۲۹/ مارچ ۷۲ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

خطبہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں اگر کوئی چیز لکھوں گا تو اسی نوع کی ہوگی جیسی

میں نے آج کل کے لئے لکھی تھی۔ آپ اور کن اصحاب کو بلانا چاہتے ہیں؟ کوئی سیاسی مقصد تو نہیں؟ سیمی نار کب ہوگا؟ ان سوالات کا جواب آجائے تو میں یہ بتاؤں کہ میں شریک ہوں گا یا نہیں۔

شمس الدین احمد صاحب سے ملنا ہو تو براہ کرم کہہ دیجئے کہ میں ان کے خط کا بہت دن ہوئے جواب دے چکا ہوں۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

۳۱/ مارچ ۷۲ء

عزیزی! خط لکھا تو کچھ باتوں کا جواب دینا بھول گیا، مجھے یاد آتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پاکستان میں انجمن ترقی اردو نے شایع کی ہے۔ یہ نہیں تو مجھے اقامت کراچی کے دوران میں مشفق خواجہ سے معلوم ہوا تھا کہ انجمن کی طرف سے شایع ہونے والی ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ سخاوت مرزا کا اس سے کچھ تعلق ہے یا نہیں۔ سخاوت مرزا صاحب کا پتا مجھے معلوم نہیں، یہ بھی مجھے خبر نہیں کہ وہ ہندستان میں ہیں یا پاکستان میں۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے سلسلے میں کچھ ہو تو کیوں کر، فخر الدین علی احمد صاحب اور ان کے شرکائے کار ساری دنیا کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کی طرف توجہ کا وقت ہی کہاں ہے؟ اس سلسلے میں ایک رجسٹرڈ خط میں نے پرسوں انہیں لکھا ہے۔ دیکھیے جواب دینے کا وقت بھی انہیں ملتا ہے یا نہیں۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ ۱۷/ اگست ۷۲ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

اگر مجھے حافظ کشمیری کے متعلق دریافت کرنا ہوتا تو میں شمس الدین احمد کو خط نہ لکھتا اور انہیں یہ اطلاع نہ دیتا کہ آپ کے ذمے میرے ایک خط کا جواب باقی ہے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ سری نگر سے جو خط آپ نے مجھے لکھا تھا، اس کا جواب آپ تک پہنچا ہی نہیں۔ وہ جس نوع کا خط تھا اس کے پیش نظر آپ کو چاہیے تھا کہ ایک رجسٹرڈ خط لکھ کر مجھ سے دریافت کرتے کہ مجھے آپ کی دعوت قبول ہے یا نہیں، آپ کی طویل خاموشی سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ واضح ہے اور اس صورت میں آپ معاف کریں اگر میں آپ کی دعوت قبول نہ کروں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں آپ سے رنجیدہ ہوں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کے سری نگر والے خط کو کالعدم سمجھتا ہوں اور بس۔

آپ کا دہلی والا خط نہ جانے کہاں رکھ دیا ہے۔ اگر کسی بات کا جواب رہ گیا ہو تو لکھیے۔ مستقبل قریب میں میرے دہلی آنے کا ابھی کچھ ٹھیک نہیں، ہاں !نومبر میں فخر الدین علی احمد کی صاحبزادی کی شادی ہے۔ اس میں شرکت ہوگی۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

ہاں، یہ بتائیں کہ کشمیر میں کون سی کتابیں فارسی، اردو ایسی ملتی ہیں جو غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں رکھی جا سکتی ہیں اگر یہ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کی ہیں تو مفت مل سکتی ہیں؟ انسٹی چیوٹ کی شایع کردہ کتابیں وہاں مفت بھیجی جا سکتی ہیں۔

☆

پٹنہ، ۹/نومبر۷۲ء

عزیزی! آپ کے خط کا جواب میں نے دیا یا نہیں، یاد نہیں۔ یاد آئے تو ڈاکٹر شمس الدین احمد سے ذکر کردیں کہ میں نے ایک خط انہیں لکھا ہے۔ یہ اس لئے کہ خط اگر ضائع ہوجائے تو یہ نہ سمجھیں کہ میں نے جواب دیا ہی نہیں۔

ایک صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اردو سے متعلق آپ کی ایک تحریر ہندستان ٹائمس میں چھپی ہے، مضمون یہ کہ حکومت کو شاخوں کی بڑی فکر ہے لیکن جڑ کی مطلق پروا نہیں، مجھے اس سے بالکل اتفاق ہے۔

میں کل دہلی روانہ ہوں گا، فخر الدین علی احمد کی بیٹی کی شادی ۱۳/نومبر کو ہے۔ اگر غالب ٹرسٹ کا جلسہ مستقبل قریب میں ہوا تو دو چار ہفتے وہاں رہ سکتا ہوں۔ یہ نہیں تو پھر واپس آؤں گا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

ڈاکٹر اختر اور ینوی کو لقوہ ہوگیا تھا، وہ علاج کے لئے کناڈا گئے ہوئے ہیں۔ ۱۷/ستمبر تک کی انہوں نے چھٹی لی تھی، اب سنا ہے کہ نومبر میں واپس آئیں گے۔ ان کی جگہ

ڈاکٹر صدرالدین فضا کام کر رہے ہیں اور اگست ۷۳ء میں مقدم الذکر کی مدت ملازمت ختم ہوگئی تو موخر الذکر صدر شعبہ ہوں گے۔ رہا شعبے کا حال، تو شعبے کا ماضی اتنا برا ہے کہ اس کی درستگی کے لئے مدت چاہیے۔ ’’ہوائے چرخ زنگاری جو آگے تھی (سو/وہ) اب بھی ہے‘‘، اور نہ جانے کب تک رہے گی۔

آپ نے جس کتاب کا نام لکھا ہے وہ مجھے نہیں ملی۔

ڈاکٹر شمس الدین احمد کے چھوٹے بھائی جو ڈاکٹر (طب) ہیں بقول مقدم الذکر ستمبر میں پٹنہ آنے والے تھے، اب تک نہیں آئے۔ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو براہ مہربانی مجھے مطلع کریں۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

نئی دہلی، ۳۰/نومبر ۷۲ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

مطلوبہ کتابیں یہیں دہلی میں آپ کو مل جائیں گی۔ ظل عباس عباسی صاحب سے کتابوں کے متعلق دریافت کریں۔

۳/نومبر کو غالب ٹرسٹ کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہے۔ ۳/تک تو میں یقیناً یہاں ہوں۔ اگر کوئی کام نکل آیا تو دو تین دن اور ٹھہر جاؤں گا، آپ سے ملاقات نہ ہوئی تو اس کا رنج ہوگا۔

خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

۲۷/فروری ۷۳ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

ڈاکٹر شمس الدیدن احمد صاحب سے ملاقات ہو تو میری طرف سے شکایت کیجئے کہ انہوں نے میرے خط کا جواب نہ دیا۔ اور یہ بھی معلوم کیجئے کہ ان کے بھائی پٹنہ آئے تھے یا نہیں۔ شکریہ۔ خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ، ۵/اپریل ۷۳ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔

ایوان غالب کی پہلی منزل میں ڈائریکٹر کا دفتر، کتبخانہ اور میوزیم وغیرہ ہیں، دوسری منزل انکم ٹیکس والوں نے کرائے پر لے لی ہے، تیسری منزل میں صرف ۲ کمرے ہیں۔ ایک انکم ٹیکس والوں نے لیا ہے، دوسرے میں انسٹی چیوٹ کا کوئی ملازم رہتا ہے، مجھے تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی جہاں آپ کا دفتر رہ سکے، اگر آپ ایسی جگہ بتا سکیں تو میں فخر الدین علی احمد صاحب کو اس کے بارے میں لکھ سکتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں۔ وظیفہ دیا ہی نہیں جاتا کہ اس کا سوال ہو۔ آپ کی فرمائش کی تعمیل کس طرح کروں؟

مسز فخر الدین علی احمد غالب سے متعلق ایک ڈرامہ لکھوانا چاہتی ہیں، انہیں خط لکھ رہا ہوں اگر وہ سلسلہ جنبانی کریں تو ان سے میں ___

اس کا افسوس ہے بہت ہے کہ اس بار آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، روشن آرا سلمہا کو دعاء

خیر طلب، ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ، ۸/نومبر ۷۳ء

عزیزی! آپ کا خط ملا، طبیعت ناساز تھی اور ہے لیکن طبیعت پر جبر کر کے جواب دے رہا ہوں، اوارڈ دینے والے خود انعام نہ لیں گے، ان کا ضمیر اگر مطمئن ہے تو شکایت کی مطلقا پروا نہیں، ہونا چاہیے۔

میرا پہلے ہی خیال تھا کہ ایوان غالب میں جگہ نہیں۔

سہ ماہی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، پہلے شمارے میں اس وقت تک کی کارروائی کی روداد، ارکان اور متعلقین کی فہرست بھی رہے گی۔ طبیعت بہتر ہو تو اس کے متعلق مزید تفاصیل ___

روشن سلمہا کو دعاء خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۹/ جولائی ۷۴ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا سفر علمی نقطۂ نظر سے کامیاب

رہا، مبارکباد کا شکریہ، فخر الدین صاحب کی نامزدگی کے بعد کامیابی یقینی ہے، اور باتیں اس سلسلے میں جو آپ نے لکھی ہیں، مجھے ان سے اتفاق نہیں، ایک ان کے صدر ہوجانے سے ایک سوال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ ان کی جگہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا سکریٹری کون ہوگا، اگست میں ٹرسٹیز بورڈ کا سکریٹری کے انتخاب کی غرض سے جلسہ ہوگا، ابھی تاریخ کا مجھے علم نہیں صحت ٹھیک رہی تو میں اس جلسے میں شریک ہوں گا، آپ پٹنہ آنا چاہیں تو جولائی میں آسکتے ہیں۔ رہے ہنگامے تو کون سی جگہ اس سے بچی ہوئی ہے؟

آپ کے مضامین متعلق سفر لندن کا شوق مطالعہ کروں گا۔

رحمانی صاحب کا ایک خط (ظاہرا یا بہ ایمائے مسنر فخر الدین علی احمد اس مضمون کا آیا تھا کہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا ڈراما آپ کے پاس تو نہیں، مجھے دیکھنے کے لئے دیا ضرور گیا تھا، اور میں نے واپس کر دیا تھا، ورنہ ان کاغذات کے ساتھ ہوگا جو میرے ساتھ دہلی سے آئے ہیں، یہ ایک سوٹ لیس میں ہیں، منتشر نہیں ہوئے۔ خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۸/ اکتوبر ۷۴ء

عزیزی، کل آپ کا ٹیلی فون آیا۔ میری عمر کے ۷۸ سال گزر چکے، یہ سال ہفتاد و نہم ہے، نقوش کی آپ بیتی نمبر میں جو سال ہے اس کے مطابق ہے تو صحیح ہے۔ ورنہ غلط ہے۔ اِس وقت حساب سے جو عمر صحیح نکلی اور جس کی صحت میں سہو کی گنجائش بہت کم ہے اوپر درج ہے۔

آج کل رمضان کی وجہ سے کتب خانہ خدا بخش ۹/ بجے صبح کو کھلتا ہے اور ۲/ بجے بند ہوجاتا ہے، تعطیل ۱۷/ اکتوبر سے ۲۸/ تک رہے گی، آپ جب چاہیں آئیں۔

یہاں کے حالات اخباروں سے معلوم ہوتے ہوں گے، کوئی بات نئی قابل ذکر نہیں، آپ کا ٹیلی فون نمبر کیا ہے؟ خیر طلب، ق، ع، و

☆

پٹنہ، ۱۰/ اکتوبر ۷۴ء

عزیزی! میرا خط جس میں، میں نے اطلاع دی تھی کہ کتب خانۂ خدا بخش آجکل ۸/ بجے صبح کو کھلتا ہے، اور ۲/ بجے بند ہوجاتا ہے۔ ۱۷ سے تعطیل ہے اور ۲۸ کو کتب خانہ کھلے گا۔

اس کے بعد آپ کا خط مورخہ ۸ ملا۔

آپ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ کے ساتھ بے انصافی ہوئی لیکن کوشش کیجئے کہ طبیعت پر اس کا کم سے کم اثر ہو۔

ہندستان میں دیوان حافظ کے جو نسخے طبع ہوئے ہیں، ان میں ایک غزل 'می بینم' ردیف والی ہے اور یہ یہاں بہت مشہور ہے، آپ نے بھی ضرور دیکھی ہوگی، آپ کو یہ معلوم ہے کہ دیوان حافظ کے معتبر نسخوں میں یہ غزل نہیں؟

اس کا افسوس ہے کہ آپ کا ڈراما نہ دیکھ سکا۔

آپ نے جن بزرگ کا ذکر کیا ہے، وہ مجسم ...... ہیں، اور توڑ جوڑ کے فن کے ماہر خصوصی، ایک زمانے میں میری ان کی دوستی تھی، ویسی تو نہیں جیسی احمدین (بصیغۂ تثنیہ) سے ہے، لیکن محض ملاقات نہ تھی، اس کے بعد ان کی حرکتیں دیکھ کر طبیعت بیزار ہوگئی۔ یہ واضح رہے کہ ان حرکتوں سے ذاتی طور پر مجھے کچھ ضرر نہیں پہنچا۔ اب محض رسمی تعلقات رہ گئے ہیں۔

روشن سلمہا کو دعاء　　　　　　　　　　　　خیر طلب، ق۔ع۔و

☆

پٹنہ، ۱۱/اکتوبر ۸۴ء

عزیزی! آپ کا خط نوشتہ ۲۰/ستمبر چند روز قبل ملا تھا، طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔

آپ کا جو کام کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں، مگر یہ پہلے سوچ لیں کہ اس کے لئے آپ وقت نکال سکیں گے یا نہیں، اور روپے کی فراہمی کی کیا شکل ہوگی، ایسا نہ ہو کچھ وقت صرف کرنے کے بعد کام آگے نہ بڑھنے کی وجہ سے پشیمانی ہو۔

آپ پٹنہ جب آنا چاہیں آئیں۔ پونا کی خبر متعلق ف آپ نے اخباروں میں دیکھی ہوگی، اس کی تردید ہوگئی۔ میں پہلے ہی سمجھا تھا کہ 'زیب داستاں'' کے لیے، کچھ نہیں، ''بہت کچھ'' بڑھا دیا گیا ہے۔

خیر طلب، ق ع و

ٹیلی فون نمبر 50810

☆

پٹنہ

عزیزی! آپ کا خط مورخہ ۲۱ ملا، میں نے آپ کو دو خط لکھے، ایک میں یہ بات تھی کہ آپ جب چاہیں پٹنہ آسکتے ہیں، ظاہرا یہ آپ کو نہیں ملا۔

ی کے تقرر کا ذمہ دار میں ہوں، ف کشمیر کے ایک صاحب کا جو دہلی میں ڈپٹی یا اسسٹنٹ منسٹر ہیں سکریٹری بنانا چاہتے تھے، وہ ٹرسٹی درکنار، انسٹی ٹیوٹ کے رکن بھی اس وقت نہ تھے، اور غالب یا اردو ادب سے ان کی دلچسپی کا کوئی ثبوت موجود نہیں، میں نے مخالفت کی اور انہوں نے ی کا سکریٹری ہونا منظور کر لیا، اگر ڈائریکٹر فعال ہے تو سکریٹری کے فعال ہونے کی ضرورت نہیں، جو صاحب چیف سکریٹری تھے، انسٹی ٹیوٹ کو کتنا وقت دیا کرتے تھے، ایک اور صاحب میری نظر میں تھے مگر مجھے یقین ہے کہ جو اس زمانے میں ف کے لیے نا قابل قبول ہوتے۔

روشن سلہما کو دعا۔ خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۲۹/اکتوبر ۷۴ء

عزیزی! خط ملا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ کل ڈاکٹر کے این، سنہا آئے۔ انہوں نے الکٹرو کارڈ یوگرام لیا۔ مگر اس میں کوئی خاص بات نہ نکلی، اصلی شکایت تنفس سے تعلق رکھتی ہے، اور چند دنوں میں ضعف اتنا آ گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہفتوں سے بیمار ہوں اس کا امکان کم نظر آتا ہے، کہ ۵/ تک طبیعت اتنی درست ہوجائے کہ آپ کے ساتھ کسی کام میں اشتراک کر سکوں۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس کے چند دنوں کے بعد آئیں، میں آئندہ بھی صحت کے بارے میں لکھتا رہوں گا۔

خوشی ہوئی کہ ڈراما کامیاب ہوا۔ خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۲۰/نومبر ۷۴ء

(اس کے ساتھ ایک کارڈ بھی)

عزیزی، ابھی آپ کا خط ملا، ایک خط جس میں، میں نے مجوزہ انعام برائے ڈراما کے متعلق مفصلا لکھا تھا، ظاہرا آپ کو نہیں ملا۔ اب میری طبیعت بہتر ہے۔ آپ جب چاہیں

آ سکتے ہیں، ہاں، اس کا امکان ہے کہ ......کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس میں شرکت کے لئے اواسط دسمبر میں دہلی آؤں گا۔

خط سے معلوم ہوا کہ سازشی لوگ کس فکر میں ہیں۔ آپ ف سے کہیے یا مسنرف کے ذریعہ کہلوایئے۔ میں دونوں کو الگ الگ آپ کے بارے میں لکھ چکا ہوں، اور پھر لکھ سکتا ہوں دہلی آنا ہو تو زبانی گفتگو بھی ہوسکتی ہے۔

آپ نے ابو الکلام آزاد کے ایک خاص خطبۂ صدارت کے متعلق دریافت کیا ہے، مجھے تو اس کے بارے میں مطلق علم نہیں کہ مکمل خطبہ کہاں مل سکتا ہے، تحقیق کرنے سے ممکن ہے معلوم ہوجائے۔

بہار میں ہندستانی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک ہوئی تو اس اندیشے کی بنا پر کہ اس روپ میں ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانا منظور ہے۔ اردو والوں نے اس کی مخالفت کی۔ ایک جلسہ ہوا جس میں، میں بھی شریک تھا، میں اس زمانے میں صوبے کی انجمن ترقی اردو کا معتمد تھا، لوگوں نے بالاتفاق ہندستانی کا معاملہ انجمن مذکور کے سپرد کیا، ڈاکٹر عبدالحق مرکزی انجمن کے معتمد تھے میں نے انھیں اس کے بارے میں لکھا۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ کل ضروری معلومات اکٹھا کر کے ڈاکٹر عبدالحق کو بھیج دوں، اس سلسلے میں مرکزی انجمن کی طرف سے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ جس کے سامنے وہ معلومات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، بلکہ کمیٹی کے ارکان کو پہلے ہی بھیج دی جائیں۔ ڈاکٹر عبد الحق نے ایک کتابچہ اپنے نام سے شایع کیا اور اس میں اشارۃً بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئے، معلومات ہی نہیں الفاظ بھی باستثنا بعض میرے تھے۔ اس کتابچے میں اگر وہ مل جائے تو آپ کو اپنے سوالات کے جواب مل جائیں گے۔ میرے پاس یہ کتابچہ نہیں، کمیٹی کے ارکان سید سلیمان ندوی، دتاتریہ کیفی، محمد مجیب، آل احمد سرور، ڈاکٹر ذاکر حسین (ممکن ہے یہ نہ ہوں، حافظہ دھوکا دے رہا ہو) غلام السیدین، ظفر الملک علوی، الطاف علی بریلوی تھے۔

صبح ہوئی الخ کے مصنف کا نام مجھے غالباً کسی زمانے میں معلوم تھا، اب بالکل ذہن میں نہیں کہ کس کا شعر ہے۔

اس سے تو آپ کو اتفاق ہوگا کہ ہر شخص ہر کام کے لیے موزوں نہ ہو اور کام بجائے خود کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر کسی ...... کے مقاصد میں شامل نہیں تو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ

غلط قسم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا مقصد اردو زبان اور ادب کی ترقی ہے، اس کا آئین دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اس کا مقصد غالب شناسی میں مدد دینا ہے، زبان اردو کی ترقی ضمناً ہوجائے تو اور بات ہے۔ مسنر ف نے سال گذشتہ جب وہ ٹرسٹی نہیں تھیں، یہ خیال ظاہر کیا تھا (ف بھی اس وقت موجود تھے) کہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ڈرامے کے لیے خاص انعام مقرر ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ادب لطیف میں یہ بھی شامل ہے۔ اور اسے خصوصی جگہ دینے کی، جبکہ غالب سے اس کا مطلقاً تعلق نہ تھا، بلکہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ڈرامے کا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ یہ بالکل غیر متوازن اور نامناسب بات ہے۔ اس پر بھی وہ مصِر ہیں تو میں نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا غرض، آپ نہ ٹرسٹی ہیں نہ اوارڈ کمیٹی کی ممبر۔ مجھے یہ نہیں کہنا تھا مگر میرے لاشعور میں یہ بات تھی کہ انہوں نے میوزیم کمیٹی سے مجھے اور حمیدہ کو خارج کر دیا تھا۔ مجھے تو اس کی مطلقاً پروانہ تھی مگر ح کو بہت رنج ہوا۔ اب وہ ٹرسٹی بھی ہیں اور اکزیکیٹو کمیٹی کی ممبر بھی۔ میری رائے جاننے کے بعد انہوں نے پھر یہ تحریک پیش کی ہے اور اس مسئلے کو کہ انعام کسی ڈرامے پر دیا جائے وہ اپنی قایم کردہ کمیٹی کے جلسہ میں رکھنا چاہتی ہیں، مجھے یاد نہیں کہ اس کے رکن کون کون ہیں، مگر حافظے میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کی نسبت یہ کہا جا سکے کہ وہ قریب کے بہترین ڈراما لکھنے والوں کے نام سے بھی واقف ہو۔ ایسی کمیٹی اچھے برے کا کیا فیصلہ کرے گی؟ بدنامی انسٹی ٹیوٹ بلکہ اوارڈ کمیٹی کی ہوگی، خدا جانے کیوں لوگ اب بھی غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی میں فرق نہیں کرتے، اگر وہ ان کی کمیٹی اور اوارڈ کمیٹی میں فرق نہ کریں تو مجھے ...... تعجب نہ ہوگا۔ میں اپنی رائے پر قائم ہوں، ڈاکٹر ...... میں نے لکھ دیا ہے کہ انہیں اور مسنر ف کو اس معاملے میں بطور خود کچھ کرنے کا حق نہیں، اگر میری رائے جاننے کے بعد بھی وہ تبدیلی نہ کرسکیں تو باقاعدہ تجویز بھیجیں جو بورڈ یا اکزیکیٹو کے سامنے پیش ہوگی۔

[کارڈ] ۲۰/جون ۷۴ء

اگر فیصلہ میرے خلاف ہوا، تو میں انسٹی ٹیوٹ سے الگ ہوجاؤں گا، اس لئے کہ میرے نزدیک کوئی معقول بات مسنر ف کی تجویز کے حق میں نہیں کہی جا سکتی، اور فیصلہ خلاف ہوگا تو صرف اس لئے کہ لوگ انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتے۔ ناراض میں بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن کسی غلط تجویز کی اس ڈر سے کہ وہ ناراض ہوجائیں گی، حمایت بھی نہیں کرسکتا۔

ممکن ہوتو انہیں سمجھائیں کہ اس تجویز پر اصرار نہ کریں، اگر ڈراما کی ترقی ان کی رائے میں انعام دینے سے ہوسکتی ہے تو اس کے لئے نیا ادارہ قائم کریں، اس میں جسے چاہیں رکھیں اور اس کی طرف سے جسے چاہیں انعام دیں۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ کسی شخص کو اس پر راضی کریں کہ وہ ۵/ ہزار سالانہ (اس سے کم نہیں) غالب انسٹی ٹیوٹ کو اس کے لیے دیا کرے کہ بہترین ڈراما لکھنے والوں کو دیا جائے۔ اس صورت میں ان کی کمیٹی یہ فیصلہ نہ کر سکے گی کہ انعام کسے دیے جائیں، یہ کام اوارڈ کمیٹی کا ہوگا۔ اسے میں اس لیے قبول کرنے کو تیار ہوں کہ یہ اوارڈ دوسرے شخص کی طرف سے ہوگا اور انسٹی ٹیوٹ پر ایسا کام کرنے کا اعتراض نہ ہو سکے گا، جو اس کے آئین ومقاصد سے باہر ہے۔ (اس کے ساتھ ایک خط)۔ روشن سلمہا کو دعا۔

خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۲۶/ دسمبر ۷۴ء

عزیزی! خطوط ملے، آپ بہ شوق یہاں ۳ جنوری کو پہنچیں، امید تو ہے کہ صحت اس وقت تک ٹھیک ہوجائے۔

نور الدین صاحب کی وفات کا بہت صدمہ ہوا، بڑے زندہ دل اور باغ و بہار آدمی تھے، انہیں کم از کم ۱۰۰ سال تو اس دنیا میں رہنا تھا، مگر کارکنان قضا وقدر کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔

کسی بات کا جواب اس خط میں نہیں ہے، تو وہ زبانی مل جائے گا۔

خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۲۰/ جنوری ۷۵ء

عزیزی! عصری ادب کے بارے میں جو ہدایت ہے اس پر مسعود عمل کریں گے، میری صحت ابھی تک ویسی ہی ہے، جیسی آپ نے دیکھی۔ ف کے یہاں سے کوئی اطلاع پوتے کی ولادت کی نہیں آئی۔ میں نے انہیں پرسوں ایک رجسٹرڈ خط بھیجا ہے جس میں مبارک باد دی ہے۔ میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک معاملۂ خاص میں ان کی بیگم صاحبہ کی کنارہ کشی ہے، اور میرا کیا رویہ ہے۔ اس اختلاف رائے کو ظاہرا ان کے نزدیک اتنی اہمیت ہے کہ میرے خطوں کا

جواب نہیں دیتیں، اور اس کی بھی روداد نہیں کہ میں ثمینہ کو بچے کی پیدائش پر کچھ دوں (آج تک چک کی رسید نہیں آئی) میں نے لکھا ہے کہ یہ ناخوشگواریاں میں انہیں نہیں بتاتا، لیکن اس روپے کا اثر خود مجھ پر بھی ہو سکتا ہے، اور اس کا امکان ہے کہ واقعات غلط شکل میں تم تک پہنچیں۔ اگر مسزف کی روش بدلی نہیں تو میں دہلی آیا تو ان کے یہاں نہ ٹھہروں گا۔

اور امور کا جواب بعد میں دیا جائے گا۔ آج کل کچھ لکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی، ف کا اگر اطمینان بخش خط نہ آیا تو آئندہ سے مراسلت بند۔ رہا آپ کا معاملہ تو میں پہلے ہی انہیں اس کے بارے میں لکھ چکا ہوں، اگر میں پھر نہ لکھ سکا تو اپنے حالات آپ خود انہیں بھیج دیں اور بتائیں کہ ق ع و میرے بارے میں آپ کو لکھ چکے ہیں۔

روشن سلمہا کو دعا　　　　　　خیر طلب، ق ع و

☆

۱۰/علی پور روڈ، دہلی

۳/مارچ ۷۵ء

عزیزی! میں نے رشید حسن خاں کو پٹنہ سے خط لکھا تھا کہ آپ کو مطلع کر دیں کہ میں ۲۱ فروری کو دہلی پہنچ جاؤں گا اور فخر الدین علی احمد صاحب کے ساتھ مقیم ہوں گا، نہ جانے انہوں نے آپ کو اس کی اطلاع دی تھی یا نہیں، اس وقت میں نور الدین احمد صاحب کے ساتھ ہوں مگر جلد ہی علی گڑھ واپس چلا جاؤں گا۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔　　　　　　خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۲۸/اپریل ۷۵ء

شفیق مکرم! میں نے آپ کی کتاب ''جلال لکھنوی'' توجہ کے ساتھ پڑھی اور اسے دلچسپ پایا، یہ خیال کہ یہ از سر نو لکھی جائے اور اس میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ ہو بہت اچھا ہے، اس سلسلے میں جو باتیں میرے ذہن میں آئیں گی، ان سے وقتاً فوقتاً حسب وعدہ، مطلع کرتا رہوں گا، مگر یہ واضح رہے کہ جلال کی بیشتر تصانیف پٹنہ میں نہیں اور ان کی حالات زندگی سے متعلق بھی جو مواد ہے اس کا بڑا حصہ یہاں موجود نہیں، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں میں مشورے کا حق ادا نہیں کر سکتا، یہ بھی نشاط خاطر رہے کہ مشیر کو صاف گو ہونا ضروری ہے۔

آپ کو یہ پسند نہ ہو تو بے تکلف لکھ دیں، میں بار خاطر ہونا نہیں چاہتا۔

(۱) کتاب کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہونی چاہیے: باب اول میں دوسروں نے جلال کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی ترتیب سے پیش کیا جائے، زوائد حذف کیے جا سکتے ہیں، اور اغلاط کی اپنی اپنی جگہ پر تصحیح ہو سکتی ہے۔ باب دوم میں جلال کے حالات زندگی تاریخی ترتیب سے ہونی چاہئیں، کسی واقعے کی طرف اس کی وقوع کے ذکر سے قبل اشارہ نہیں ہونا چاہیے۔ مثلا یہ کہ تاریخ ولادت ی بحث میں سال وفات کا ذکر نہ آنا چاہیے اور یہ ناگزیر ہو تو یہ بحث حاشیے میں ہونی چاہیے، متن کتاب میں یہ کافی ہے کہ صحیح سال ولادت معلوم نہیں، قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ سنہ...... کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ جلال کے خاندان کا ذکر خود ان کی پیدائش کے ذکر سے قبل ہو، تصانیف کا مجمل بیان (مثلاً یہ کہ فلاں سنہ میں فلاں کتاب لکھی یا فلاں کتاب شایع ہوئی) اور معاصرین سے تعلقات کا حال بھی اسی باب میں ہونا چاہیے۔ موخر الذکر کے لیے ایک علیحدہ باب کی حاجت نہیں، اگر کسی واقعے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں تو اس زمانے کی قیاسی تعیین کرنی چاہیے، یہ کسی نہ کسی حد تک تو ہو ہی جائے گی۔ تیسرا باب تصانیف کے مفصل بیان کے لئے وقف ہونا چاہیے، دواوین کے ذکر میں تنقید بھی آ سکتی ہے اور آپ چاہیں تو اس کے لئے ایک الگ باب بھی مخصوص کر سکتے ہیں، آخری باب میں کل دواوین کا الگ الگ انتخاب ہونا چاہیے۔

(۲) آپ نے بہت سے مآخذ سے کام نہیں لیا، اخباروں کی طرف تو بالکل توجہ ہی نہیں کی (تفاصیل آئندہ)۔

(۳) فہرست تصانیف میں دیوان ۴ کا ذکر ہی نہیں، یہ فروگذاشت کس طرح ہوئی سمجھ میں نہیں آتا، یہ بھی نہیں کہ دیوان پنجم کو دیکھنے کی بھی آپ نے کوشش نہیں کی، ممکن ہو تو اس کا مطالعہ ضرور کیجئے اور اس کا پتہ بھی لگائیں کہ تذکروں اور گل دستوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں یا نہیں، جو دواوین سے غیر حاضر ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے کسی جگہ نظم نگاری کو دیوان ۳ اور کہیں دیوان ۴ لکھا ہے۔

(۴) ص ۴۰ میں رسالہ عروض وقوافی کے متعلق مرقوم ہے کہ ''اس رسالے میں صرف مختلف قوافی کی فہرست دی گئی ہے''، اس عبارت کا مطلب میں نہ سمجھا، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس میں صرف قوافی سے بحث ہے، تو اس کا نام رسالۂ عروض وقوافی کیوں ہے؟

(۵) ص۶۵ میں رشک کے کربلا جانے کا ذکر ہے، جلال کے دیوان اول میں اس سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ ہے۔

(۶) ص۱۶، میں ''مظفر حسین'' اسیر۔ یہ سہو قلم ہے، مظفر علی اسیر چاہیے، امداد علی **ہجر** (= **بحر**) طباعت کی غلطی ہے۔

(۷) یہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ اصغر علی قمر کے شاگرد تھے؟ مجھے اس میں بہت شبہ ہے، اصغر علی کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہیے، ''شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں''، نامی کتاب میں ان کی کئی داستانوں کا ذکر ہے۔

ص۱۷۵ و ص۱۷۰۔ آپ نے ایرج نامہ کے سوا کسی کا ذکر نہیں کیا، آپ کو ان کی عبارت کا نمونہ بھی دینا چاہیے۔

(۸) ص ۱۵۸ و۱۵۹ میں ہے کہ جلال نے اپنے والد کی محنت کو ......داستان بالا باختر کی شکل میں جاری رکھا۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ بالا باختر ایرجنامہ کے بعد کی داستان ہے، حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔

(۹) ص ۱۵۹، میں جو عبارت بالا باختر کی نقل ہوئی ہے اس میں یہ فقرے ہیں:
''جب ایرج نامہ کے اردو کرنے سے فرصت ہوئی...... بالا باختر رنگنے کے واسطے عنایت ہوئی''، اس سے تو مترشح ہوتا ہے کہ ایرج نامہ سے بھی جلال کا تعلق تھا، حقیقت کیا ہے؟

(۱۰) ایک ''بالا باختر'' نول کشور نے شایع کی ہے جو کوچک باختر کے بعد اور ایرج نامہ سے قبل ہے۔ جلال کی بالا باختر کا نولکشوری بالا باختر سے مقابلہ ضروری ہے، مقدم الذکر کے طویل اقتباسات بھی دینے چاہیں کہ نثر نگار اردو داستان گو کی حیثیت سے جلال کا مرتبہ معلوم ہو سکے۔

(۱۱) سری رام اور آرزو کے اقوال (متعلق وفات جلال) میں کسے ترجیح ہے، اس کے فیصلے کے لئے اخباروں کی طرف رجوع کیا جائے۔ صحیح تاریخ وفات بآسانی معلوم ہوجائے گی۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ سریرام کی خمخانۂ جاوید کی جلد۲ کئی سال میں لکھی گئی ہے اور یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے جلال کی عمر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کیا تھا، یہ بات آپ سے مخفی نہ ہوگی کہ وہ نہایت غیر محتاط مصنف تھے۔

(۱۲) ص ۳۰ ''میر ضامن علی جلال آہ آہ'' سے سال وفات ۱۳۲۴سنہ نکلتا ہے''، یہ

صحیح نہیں، اس سے سنہ ۱۳۲۷ مستخرج ہوتا ہے۔

(۱۳) ص۱۲ ''جلال ۲۵/۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے'' قطعیت کہاں سے آ گئی؟ سال ولادت کی بحث بالکل اطمینان بخش نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ انتخاب یادگار میں بعض شعراء کا حال ۱۲۹۰ھ کے بعد لکھا گیا ہے، یہ دیکھئے کہ جلال بھی ان شعراء میں ہیں۔ یا مزید یہ کہ امیر نے عمر ''تخمینا نہیں لکھی''، آپ ''تخمینا'' کہاں سے لائے؟

(۱۴) ص۱۸ میں عہد یوسف علی خاں میں جلال کے رام پور بلائے جانے، ۵۰ روپے ماہوار پر ملازم ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ ''یہ واقعہ اواخر ۱۸۸۰ء یا اوئل ۱۸۸۱ء کا ہے''، اور ثبوت میں امیر کے خط مورخہ ۳/ جنوری ۸۱ء کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''جلال آئے اور پچاس روپے مشاہرہ پر نوکر ہوئے'' امیر کی عبارت کا تعلق عہد یوسف علی خاں سے نہیں، عہد کلب علی خاں میں نوکر ہونے سے ہے اور مشاہرہ بھی وہی ہے جو کلب علی خاں نے مقرر کیا تھا۔ عہد یوسف علی خاں میں کیا مشاہرہ تھا، معلوم نہیں۔ واضح رہے کہ یوسف علی خاں ۱۸۸۰ء سے بہت قبل وفات پا چکے تھے۔

(۱۵) ص۱۴۹ میں ہے کہ تنقیح اللغات کے خلاف جو رسائل شوق نیموی نے لکھی تھی ''ذاتی مخاصمت اور جلال وتسلیم کے جھگڑوں کی بنا پر لکھی گئی''، یہ صحیح نہیں۔ تسلیم وجلال کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا، تسلیم اس قسم کے آدمی بھی نہ تھے، کہ معاصرین سے جھگڑتے۔ ہوا یہ کہ شوق نے سرمۂ تحقیق ''ازاحۃ الاغلاط'' میں تنقیح اللغات کے بعض مطالب پر معترضانہ بحث کی۔ جلال کے ایک شاگرد نے اس کے رد میں ایک رسالہ لکھا (شوق کا بیان کہ خود جلال نے لکھا اس کی قطعی تردید ممکن نہیں)، اور پھر مناظرہ شروع ہوگیا، جس کا نہایت مفصل حال شوق کی ''یادگار وطن'' میں موجود ہے، یہ کتاب آپ کو کچھ دن کے لئے مستعار بھجوائی جا سکتی ہے۔

(۱۶) ص ۱۵۱ میں شوق کی جو عبارت نقل ہوئی ہے اس سے آپ کا دعوی کلاً ثابت نہیں۔ یہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ ''جلال نے جہاں کہیں ذاتی طور سے فیصلہ دیا اور اجتہاد کیا ہے وہ بھی انہیں (بہارعجم وغیاث اللغات) کی روشنی میں ہے''۔ آپ نے شوق کے احوال میں جو تضاد دکھایا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ بہارعجم وغیاث اللغات میں بہت سے اغلاط ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ جلال نے ان اغلاط کا اعادہ کیا ہو اور ان دونوں کتابوں کا ۲ جگہ پر فیصلہ کر لیا ہو؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا ہے۔ آپ تنقیح اللغات کو ڈھونڈ کر نکالیں اور جو کچھ لکھیں اس

کے اور ازاحۃ الاغلاط سرمۂ تحقیق کے تقابلی مطالعے کے بعد! شوق کے اس اعتراض کا کہ بہار عجم کے لائے ہوئے اشعار کی بھر مار ہے، تتبع وتفحص کی تو ہوا تک نہیں لگی۔ فیصلہ بھی تنقیح کی طرف رجوع کئے بغیر نہیں ہوسکتا۔ شوق کا مطلب یہ نہیں کہ اسناد دور ازکار ہیں، وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ اسناد فقط جلال نے ڈھونڈ کر نہیں لگائے، وہ کسی تعریف کے مستحق نہیں، اگر یہ واقعہ ہے کہ اشعار زیادہ تر وہی ہیں جو بہار عجم میں ہیں تو اعتراض صحیح ہے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ خیر طلب، عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱۵/نومبر ۷۵ء

عزیزی! عصری ادب کا تازہ شمارہ ملا، شکریہ، ڈاکٹر وہاب اشرفی جو متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، نہرو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں کس جگہ کے امیدوار ہیں، میں نے ان کی سب کتابیں تو نہیں دیکھیں مگر ایک کے متعلق میں نے اپنی رائے ظاہر کی ہے جو اسی کتاب میں ملے گی۔ اگر ان سے بہتر امیدوار کوئی اور ہو تو مجھے کچھ کہنا نہیں، اگر نہیں اور نا اہل لوگ محض ......کی وجہ سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں، تو مجھے امید ہے کہ آپ جہاں تک ممکن ہے ڈاکٹر وہاب اشرفی کو اس کے مضر اثرات سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ میں ممنون ہوں گا۔

روشن سلمہا کو دعاء خیر طلب، ق ع و

مسعود سلام کہتے ہیں۔

☆

۲۰/مئی ۱۹۷۶ء

عزیزی! دیوان آبرو کا ایک نسخہ درکار ہے، کتب خانۂ خدا بخش کے لئے، قیمت میں کچھ رعایت چاہیے، قیمت حمیرہ خاتون جو اس خط کو لے کر جا رہی ہیں، ادا کر دیں گی، یہ دہلی جا تو رہی ہیں ایک ذاتی کام سے لیکن اس کی خواہش مند بھی ہیں کہ وہاں کے خاص ادیبوں سے ملیں، اگر آپ کچھ لوگوں سے ان کا تعارف کرا دیں تو شکر گذار ہوں گا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے، میرا حال آپ کو حمیرہ خاتون سے معلوم ہوگا۔

قاضی عبدالودود

☆

۱۸/ جون ۸۷ء، پٹنہ

عزیزی! خط ملا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کراچی میں دیوان آبرو کے دو نسخے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو صرف ایک نسخے کا عکس آپ کے پاس نہیں۔ باقی کے عکس موجود ہیں، اگر واقعی ۲ نسخے کراچی میں ہیں تو دونوں کا عکس رہنا ضروری ہے۔ غالبا میں نے مشفق خواجہ صاحب سے کہا تھا کہ وہ کلیات قائم کا عکس مجھے دیں اور وہ اس پر راضی تھے۔ اس پر جو رقم صرف ہوگی، وہ میں نے انہیں بھیجنے کے لئے کہہ دیا تھا کہ ان کے حوالے کر دیں، کراچی سے میری کتابیں حمیدہ سلطان لائیں مگر ان میں عکس نہ تھا، اب تک کراچی سے کسی نے مجھے قطعی طور پر یہ نہیں بتایا کہ عکس لیا گیا تھا یا نہیں۔ میں نے مشفق خواجہ کو اس کے بارے میں بھی لکھا ہے، اس کا عکس رہنا بھی ضروری ہے۔ دیوان سجاد مرتبہ ڈاکٹر شمیم احمد اردو اکیڈمی صوبۂ بہار نے شایع کر دیا ہے، دیوان یکروہ چھپوا چکے تھے اور دوبارہ چھپوا رہے ہیں، مجھ سے شاید وہ خفا ہیں۔ آپ انہیں براہ راست دیوان یکرو کے لئے لکھیں۔ پرانے نسخے سے بھی کام چل جائے گا۔

شعبۂ اردو، Langat Singh College، مظفر پور

لغت کے بارے میں زبانی گفتگو ہوگی، میرا خیال بھی تھا کہ ہر دور کی لغت الگ الگ ہو اور ابتدا ایہام بندی سے ہو۔

آبرو کے ایک شعر میں لفظ 'چاہ' آیا ہے اور گو یہ بمعنی 'چاہے' نہیں آیا صاف ظاہر ہے کہ یہ معنی بھی شاعر کے ذہن میں ہیں یہ شعر مطلوب ہے، یاد ہو یا بآسانی مل جائے تو اس کی ضرورت ہے۔

روشن سلمہا کو دعا۔ خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۲۸/مئی ۷۷ء

عزیزی! آپ کا خط آیا تھا، طویل علالت نے قوت ارادی اور حافظہ دونوں کو کمزور کر دیا ہے، ایسی حالت میں جواب میں جو دیر ہوئی وہ قابل عفو ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے لکھا تھا کہ فخر الدین صاحب کی وفات کے بعد خودغرض لوگ غالب انسٹی ٹیوٹ پر قابض ہونا چاہیں گے، ایسا ہونا متیقن ہے اور افسوس یہ ہے کہ وہاں کوئی نہیں جو ان لوگوں کا مقابلہ کر سکے، عابدہ بیگم تو جو بھی خوشامد کرے اس کو پسند کرتی ہیں،

رہے ، تو خرابی صحت کی وجہ سے کسی سے مقابلے کی ان میں ہمت نہیں رہی، غالب نامے کے لئے ف کو ۴۰۰ روپے ماہوار کی تنخواہ پر نوکر رکھ لیا، میں نے سختی سے اس کی مخالفت کی ، بلکہ ایک تجویز بھیج دی کہ وہ علیحدہ کر دیے جائیں۔ اس کے بعد رسالے کی ادارت کی ذمہ داری میں نے قبول کی مگر چند روز قبل میں نے لکھ دیا کہ مجھ سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بہت سی باتیں میری مرضی کے خلاف ہوں گی، اور ذمہ داری میری ہوگی۔

آپ سے جہاں تک ہو سکے خودغرض لوگوں کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ عمل جراحی کے بغیر چارہ نہیں اور جلد ہونا چاہیے۔

روشن سلمہا کا مقالہ مکمل ہوا، انھیں دعا، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔مسعود کا سلام

خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۲۵/ جون ۷۷ء

عزیزی! آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا، تعجب ہے، کیتھیڑ خود بخود بارے تیرہ دن قبل نکل گیا۔ اس کے بغیر پیشاب کسی تکلیف کے ہو رہا ہے، مگر دن میں پندرہ سولہ بار ہوتا ہے، چند دنوں کے بعد اطبا سے مشورہ لوں گا کہ کیا کیا جائے، برائے مہربانی غالب انسٹی ٹیوٹ کے حالات لکھیں اور ذرا تفصیل کے ساتھ۔ یوسف صاحب مدتوں سے خاموش ہیں اور عباسی صاحب کا بھی بہت دنوں سے کوئی خط نہیں آیا۔

روشن سلمہا کا کام کس مرحلے میں ہے۔مسعود سلام کہتے ہیں۔

خیر طلب، ق ع و

☆

پٹنہ، ۳۰/نومبر ۷۷ء

عزیزی! آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا، اور رانچی آ کر بھی مجھے دیکھنے نہ آئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ میں دہلی کے قریب آتا، اور آپ میری طرح ایک سال سے علیل ہوتے اور مین آپ کو دیکھنے نہ آتا، اس کی وجہ وہ خط تو نہیں جو میں نے آپ کو لکھا تھا؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ آپ کو ع غ میں ایک کو منتخب کرنا ہے، ع اورس، غ پر قابض ہوگئے تو غ کھیل تماشہ کی جگہ رہ جائے گی اور بس ع کا المیہ یہ نہیں کہ وہ کم فہم ہیں ، یہ ہے کہ وہ اپنے کو بیسویں صدی کا

بقراط سمجھتی ہیں، انہیں قریب سے دیکھنے کا جو موقع مجھے ملا ہے، وہ آپ کو نہیں ملا، اس کے بارے میں اتنا ذاتی علم سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے اور باتیں جو دوسروں سے معلوم ہوئی ہیں ایسی ہیں کہ وہ صحیح ہیں (اور انہیں غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں) تو ایک لمحے کے لئے بھی اسے غ میں رہنا نہیں چاہیے، کوشش کرنی چاہیے کہ ع صدر نہ ہوں اور ڈائریکٹر نہ ہوں۔ دوسری بات میں نے ہی لکھی تھی کہ آپ ادارۂ تحقیقات پٹنہ کی کونسل کے رکن بنیں (چندہ ایک مشت ۱۰۰ روپے ماہانہ ۲۰ روپے۔

دونوں باتیں ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ شاید آپ کے لیے ضروری نہ تھا کہ کسی کو بھی قبول کرتے، مگر خط کا جواب دینا ضروری تھا، ہاں آپ وہ محمد حسن نہ رہے ہیں جو پہلے تھے۔

....

....

نوٹ: تحریر نہیں پڑھی جاسکی، روشنائی مدھم پڑ گئی ہے۔[آخری سطور ع غ سے متعلق]

☆

پٹنہ، ۱۱/اگست ۷۸ء

عزیزی! خط ملا۔ مجھے بخار آ گیا تھا، اور ساتھ ساتھ کھانسی بھی تھی بخار دو تین دن کے بعد اتر گیا، کھانسی کسی قدر اب بھی ہے۔

یوسف صاحب کی تقریب کی رسم بھی انجام پا گئی؟ حکومت نے اس کے کچھ نسخے خریدے؟

مسعود سلام کہتے، روشن سلمہا دعا۔

عہد آبرو کی زبان کی ایک فرہنگ بنے تو بڑی اچھی بات ہے، ادارۂ تحقیقات اردو اکادمی سے اس معاملے میں اشتراک عمل کے لئے آمادہ ہے۔ آپ کیسے ہیں۔

خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ، ۱/جون ۷۹ء

عزیزی! آپ کا خط ملا۔ آپ دیوان آبرو کو دوبارہ شایع کریں تو کل نسخے سے جو موجود ہیں (کیمبرج، لاہور، پاکستان، کلکتہ، پٹنہ، پٹیالہ) سے مدد لیں، یہ اپنے دور کا سب سے

بڑا ریختہ گو ہے، ساتھ ساتھ ایک مکمل لفظ نامہ ہونا چاہیے، صحت متن کی ہر ممکن کوشش ضروری ہے، آپ دو چار دن کے لئے پٹنہ آئیں تو میں مشورہ دینے کو آمادہ ہوں۔

میں نے حال میں کلیم صاحب کی فرمایش سے اپنے متعلق ایک مضمون لکھا ہے، اگر آپ کے مضمون میں واقعات کی کوئی غلطی ہے تو کلیم صاحب میرے مضمون کی مدد سے اسے درست کر دیں گے۔ آپ انہیں اس کی اجازت دے دیں، سوال و جواب کا معاملہ ہو تو الگ بات ہے، ورنہ میں اپنے متعلق مضمون اشاعت سے قبل دیکھنا پسند کرتا۔

روشن سلمہا کو دعا، آج کل وہ کیا کر رہی ہیں؟ خیر طلب، ق ع و

☆

میر چھجو اور حاجی مونس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

میر حسن سے پہلے کسی نے یہ نہیں لکھا کہ شفائی و میر کی طرزوں میں مماثلت ہے، شفائی کے متعلق آرزو نے کچھ لکھا ہے جو ان کے تذکرے میں ملے گا، سوز کی جو غزلیں سودا کے کلیات میں داخل ہوگئی ہیں (مطبوعہ کلیات) ان کی مکمل (یا نامکمل) فہرست مہر نیم روز میں ملے گی، یہ رسالہ کراچی سے ملے گا، یہ فہرست آوارہ گرد اشعار کے ذیل میں ہے۔

میں نے سودا کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ منتشر ہے کسی ایک جگہ نہیں اور اس وقت خود بھی یاد نہیں کہ کہاں کہاں اور کیا کیا لکھا ہے۔ میرا ارادہ ''سودا'' مصنفہ شیخ چاند پر تنقید لکھنے کا ہے، اس میں بہت سی باتیں ملیں گی۔ زمانۂ وفات جو شیخ چاند نے بتایا ہے ٹھیک ہے لیکن فرخ آباد جانے کا جو زمانہ انہوں نے لکھا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں؛ میرا خیال ہے کہ ان کے بتائے ہوئے زمانے کے کئی سال بعد وہاں جانا ہوا۔ وہاں سے فیض آباد آنا ۱۱۸۵ یا ۱۱۸۶ھ میں ہوا، اس وقت قطعی طور پر اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سودا ۱۱۷۲ھ کے لگ بھگ دہلی سے بارہ تیرہ برس فرخ آباد، چند سال فیض آباد میں رہے اور لکھنؤ میں مرے، شجاع الدولہ کے عہد میں دار الحکومت فیض آباد ہوگیا تھا، آصف الدولہ لکھنؤ چلے گئے ___ الحاقی کلام کی مکمل فہرست میرے ذہن میں ہے مگر اس کے لکھنے کی فرصت نہیں ___ عام طور پر جو قلمی نسخے ملتے ہیں ان میں الحاقی کلام یا تو ہے ہی نہیں یا برائے نام ہے، الحاقی کلام، اس نسخے میں ہے جو غلام احمد نے مرتب کیا تھا اور جس پر ....

(اس کے بعد والا صفحہ دستیاب نہیں ہو سکا)

☆

پٹنہ، ۱/جنوری/۸۰ء

سالِ نو مبارک۔

عزیزی! کل سرجن آئے تھے، انہوں نے کہا کہ اگر طبیعت مانع نہ ہوں تو باہر نکلا کریں، ۳۰/جنوری کو اس کا فیصلہ ہوگا۔ آپ کا مستقبل قریب میں یہاں آنا ہوگا؟ آپ کے لیے جو مضمون لکھ رہا تھا، نامکمل رہ گیا۔ کوشش کروں گا کہ دو تین دن کے اندر مکمل ہوجائے خواہ اس سے اگلے شمارے میں شایع ہو یا نہ ہو۔ ظل عباس عباسی مدتوں سے خاموش ہیں، انہوں نے تعزیت کا خط تک نہ لکھا، ادارۂ تحقیقات اردو کی کتابیں برائے فروخت ان کے پاس بھیجا اور دیوان غالب فارسی جلدا کے کل نسخے...... جمع تھے، ان کی تحویل میں تھے۔ ان سب کا کیا حشر ہوا؟ آپ براہ کرم اس طرح دریافت کریں کہ میرا اس سے تعلق نہ معلوم ہو۔

ادارۂ تحقیقات اردو کا احیا ہوگا، اس موقع پر گورنر صاحب نے صدارت منظور کر لی ہے۔ آپ کے سو روپے کا چک بھی تھا وہ بے کار ہوگیا۔ براہ مہربانی دوسرا چک بھیج دیں۔ مگر قاضی محمد مسعود کے نام۔ ادارے کا حساب ابھی بینک میں نہیں کھلا ہے۔ روشن سلمہ کو بھی سال نو مبارک۔ دیوان آبرو کسی طرح سے گھر لائیے گا۔

ق۔ ع۔ و

☆

پٹنہ، ۵/اکتوبر، ۸۰ء

عزیزی، خوش رہیں، عمر دراز پائیں اور اردو کی خدمت کرتے رہیں، نرد (Nirad) چودھری نے اپنے ناول میں دکھایا تھا کہ ہزار سالہ سیاسی غلامی نے ہندوؤں کے کردار کو بری طرح متاثر کیا ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان غلاموں کے غلام ہیں اور ہندوؤں سے بد تر ہیں، تقی رحیم صاحب کے متعلق آخری خط میں ایک بات لکھنی بھول گیا، اور وہ یہ ہے کہ اقلیت کے حقوق کی حفاظت کو لے کر حکومت بہار نے جو ایک کمیٹی بنائی تھی، وہ حقوق سے انکار کے باوجود اس کے رکن تھے اور غالبا یہی وجہ ان کے انتخاب کی تھی، آج کل وہ اس کے رکن ہیں یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا، سر سلطان احمد نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ مسلمان وزرا سے جو نقصان مسلمانوں کو پہنچتا ہے۔ وہ کسی اور سے نہیں۔ بہار میں ایک صاحب ش۔ن۔ جن کا نام رذائل

شقی کہنا بہتر ہے، وہ آج کل اسٹیٹ منسٹر ہیں، ان سے میں ایک جن سنگھی کو بہتر سمجھتا ہوں، اور خوبیاں درکنار، پکے اٹھائی گیرے بھی ہیں۔ یہ ذاتی تجربے سے، کہتا ہوں۔

میں نے آپ کو بہت دن ہوئے لکھا تھا کہ دیوان آبرو، کل قلمی نسخوں کے عکس جمع کرنے کے بعد پھر مرتب کیجئے، بہت اہم کام ہے اس سلسلے میں کچھ ہوا؟

دیوان ناجی بہت برا شایع ہوا ہے، ڈاکٹر فضل الحق مطلقاً اس کی صلاحیت نہیں رکھتے، کہ قدیم متون کی تصحیح کریں۔

عزیزہ روشن آرا کا مقالہ امتحان مکمل ہوا؟

میری صحت بدتر ہوگئی ہے، کمر کے درد نے پریشان کر رکھا ہے۔

عصری ادب کا جدید شمارہ ملا، شکریہ، کیا اس کے لئے ایک مقالہ بھیجوں؟ یہ الفاظ سے متعلق ہوگا، پٹنہ آنے کا ارادہ ہے؟ مسعود سلام کہتے ہیں۔ خیر طلب، قاضی عبدالودود

☆

پٹنہ۔۴

عزیزی! خط ملا۔ میں ۲۱ کو آسام سبل سے عازم دہلی ہوں گا۔

اگر مسزف آپ کی سفارش کریں تو اچھا ہوگا، میں انہیں لکھ چکا ہوں اب تو لکھنے کا وقت نہیں، ان سے زبانی گفتگو کے لیے تیار ہوں، جو بہتر ہوگا اگر آپ کے لئے ......ہو۔

خیر طلب، ق ع و

☆☆☆

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

غالب کی جدیدیت اور انگریزی استعمار

بیسویں صدی میں عام طور پر غالب کو اردو کا پہلا جدید شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔مثلاً یوسف حسین خاں کے بہ قول :''غالب اردو زبان کے پہلے جدید شاعر ہیں....ان کی غزل اور نثر دونوں نے جدید اردو ادب کی ابتدا کی''[۱]۔ان سے پہلے حالی ،عبد الرحمٰن بجنوری ، میراجی، راشداور چند دوسرے لوگ بھی غالب کی جدیدیت کی نشان دہی ایک یا دوسرے طریقے سے کر چکے تھے۔ اسی طرح منٹو کو غالب سے غیر معمولی دل چسپی تھی ۔بعد میں غالب کی جدیدیت کو وزیر آغا،شمس الرحمٰن فاروقی اورشمیم حنفی نے واضح کیا۔

مرزا اسداللہ خاں غالب (۱۷۹۷ء ۔ ۱۸۶۹ء) کا بچپن آگرہ میں ،باقی عمر دہلی میں گزری۔ غالب چودہ پندرہ برس کی عمر میں جس وقت دہلی پہنچے ہیں ، اس وقت ایک فقرہ کثرت سے دہرایا جاتا تھا:'' خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا،حکم کمپنی بہادرکا''۔اس کا سیدھا سادہ مطلب تھا کہ خلق خدا ،بادشاہ اور ملک تینوں اسی کے رحم وکرم پر ہیں جس کا حکم چلتا ہے۔پندرہ سالہ شادی شدہ مرزا نوشہ، اسداللہ جب(۱۸۱۲ء) دہلی آئے ہیں تو اس کے تخت پر اکبر شاہ ثانی متمکن تھے ،سکہ بھی انھی کے نام کا چلتا تھا ،مگرحکم کمپنی بہادر کے نمائندے چارلس مٹکاف کا چلتا تھا ۔غالب کے لیے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دہلی میں غالب کے لیے یہ بات دل چسپ موازنے کا باعث ضرور رہی ہوگی ،مگر حیرت انگیز نہیں کہ بادشاہِ دہلی بھی ان ہی کی مانند انگریزی حکومت کے وظیفہ خوار تھے ۔بعد میں غالب کی زندگی جس ڈھب سے گزری ، وہ بڑی حدتک 'بادشاہ دہلی،اور قلعہ معلیٰ' کی زندگی سے مماثل تھی!

غالب کے چچا نصر اللہ بیگ (جنھوں نے ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی،اور جومغلوں نہیں مرہٹوں کی ملازمت میں تھے) آگرہ کے قلعہ دار تھے ، انھوں نے ''بغیرلڑائی کے آگرہ کا قلعہ جنرل لیک کے حوالے کردیا تھا''[۲]۔نصراللہ بیگ نے لڑنے کے

بجائے ہتھیار ڈالنے ،اور کمپنی بہادر سے انعام پانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ان کا 'ذاتی یعنی شخصی، انفرادی' فیصلہ نہیں تھا، بلکہ اس زمانے کے اشراف کے عمومی انتخاب کی ہو بہو نقل تھی جنھیں اپنی بقا، انگریزوں یا مرہٹوں میں سے ایک کی سرپرستی میں نظر آتی تھی ۔نصراللہ بیگ کو نواب احمد بخش ،والی لوہارو فیروز پور جھرکہ کی طرف سے پیغام بھیجا گیا تھا ،جس میں مزاحمت نہ کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔نواب احمد بخش، نصر اللہ بیگ کے بہنوئی تھے ،اور غالب کے سسر نواب الہی بخش معروف کے بڑے بھائی تھے۔ اس 'خدمت' کے صلے میں نصراللہ بیگ کو چارسوسوار کی رسالداری، سترہ سو ماہانہ مشاہرہ اور جاگیریں ملی تھیں۔راجہ بختاور سنگھ، والی الور نے غالب اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف بیگ کے لیے روزینہ مقرر کیا تھا ،اور دو گاؤں ان کے نام کیے تھے[۳]۔نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد جنرل لیک نے جاگیریں واپس لے لیں اور ان کے خاندان کی پنشن مقرر کردی تھی۔جس نواب احمد بخش کے پیغام پر نصراللہ بیگ نے آگرے کا قلعہ لیک کے حوالے کیا تھا، نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد انھی سے جنرل لیک نے کہا کہ جاگیروں کے بدلے ان کے خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ پنشن ملا کرے گی۔نواب صاحب نے پنشن کی رقم نہ صرف نصف کردی، بلکہ نصر اللہ بیگ کے پس ماندگان میں خواجہ حاجی نامی ان کے ملازم کو بھی شامل کردیا، جس کے لیے دوہزار روپے کی رقم سالانہ مختص کی،جب کہ غالب اور نصراللہ بیگ کی بیوہ کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار مقرر کی۔یہ وہ اینٹ تھی جو ٹیڑھی رکھی گئی ،اور غالب کی آئندہ زندگی کا سب سے بڑا روگ بنی۔غالب نے اپنے باپ دادا کی مانند سپاہیانہ زندگی کا انتخاب کرنے کے بجائے، انھی کی پنشن پر گزارا کرنے کا فیصلہ کیا،اور یہ پنشن ہی تھی ،جو انگریزوں سے ان کے تعلق کا واحد سبب اور وسیلہ تھی!

غالب کو وراثت میں ایک طرف انگریزوں کی جاری کی ہوئی خاندانی پنشن ملی، اور دوسری طرف انگریزی حکومت کی طرف داری ۔غالب خود کہتے ہیں:" بچپن سے انگریزی حکومت کے نان ونمک سے پرورش پائی ہے ،اور جب سے منھ میں دانت نکلے ہیں، ان فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چیں ہوں"[۴]۔حقیقت یہ ہے کہ غالب نے انگریزی حکومت کے علاوہ ،انگریزی پنشن پر گزارہ کرنے والی مغل حکومت کا نان ونمک بھی کھایا،اور جہاں سے نان ونمک کی امید ہوسکتی تھی ،وہاں کوششیں کیں۔غالب جب دہلی آئے ہیں تو ان کی سب سے

بڑی آرزو مغل دربار تک رسائی ،اور استاد شاہ بننے کی تھی ،جو کہیں تیس سال بعد ، ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد پوری ہوئی۔اپنے زمانے کی مقتدر قوتوں تک رسائی،تا کہ ان سے اپنے شاعرانہ مرتبے کی سند بہ صورت اعزاز وخطاب وخلعت حاصل کی جاسکے:یہ تھی غالب کی زندگی کی عملی جدوجہد ۔ انھوں نے ملکہ معظّمہ ، شاہ دہلی اور بادشاہ اودھ کی خدمت میں قصائد ارسال کیے۔سب کا مضمون ایک تھا: انعام واعزاز وخطاب وخلعت کی آرزو۔

حقیقت یہ ہے کہ غالب کی یہ دونو ں آرزوئیں،نہ محض ایک شاعر کی عمومی آرزوئیں ہیں، نہ انیسویں صدی کے اشراف طبقے سے تعلق رکھنے والے اس شخص کی آرزوئیں ہیں جسے اپنا وقار اور اپنی معاشی بقا دونوں خطرے کی زد پر محسوس ہورہی تھیں، بلکہ یہ آرزوئیں ،ایک عظیم نصب العین کی اس تخفیفی صورت کو بیان کرتی ہیں، جس کی زد پر قلعہ معلّٰی تھا۔غالب کی شاعری مغل جمالیات کو پیش کرتی ہے ، بالکل بجا،مگر غالب کی زندگی عظیم مغلیہ سیاسی نصب العین کے انحطاط سے حیرت انگیز طور پر مماثل ہے۔ پنشن میں اضافے اور تیموری وقار کی بحالی کی درخواستیں .....شاہ عالم ثانی سے بہادر شاہ ظفر تک سب تیموری'بادشاہوں' کی مساعی انھی دو باتوں تک سمٹ گئی تھیں۔یہ درخواستیں انگریز ریزیڈنٹ، گورنر جنرل اور انگلستان کی مرکزی حکومت تک (رام موہن رائے ،جنھیں راجہ کا خطاب لال قلعے نے دیا تھا، یہ درخواست لے کر گئے تھے) پہنچائی جاتی رہیں۔یہی کام غالب بھی کرتے رہے۔ جو سلوک غالب کی پنشن سے ہوا، وہی سلوک لال قلعے کے مکینوں کی درخواستوں سے ہوتا رہا۔شروع میں انگریز ریزیڈنٹ مغل دربار کے آداب کا لحاظ کرتا رہا، یعنی نذر پیش کرتا رہااور تسلیم بجا لاتا رہا، بعد میں انھیں بھی ترک کردیا گیا۔ انیسویں صدی کے شاہان مغلیہ کی قلعہ معلّٰی کے اندر حکمرانی برقرار تھی۔" قلعے کے بازار کے مکین بادشاہ کے محکوم تھے،اور شاہی خاندان کی فوج ظفر موج کو شاہی سفارتی استثنا حاصل تھا۔شاہی آداب کا پاس کیا جاتا تھا،عظیم مغل بادشاہوں کے خطابات اور زبان برقرار تھی ....اگر چہ پورے ہندوستان میں مغلوں کو پنشن یافتہ کہا جاتا تھا ،مگر قلعے کے اندر انھیں خودمختاری حاصل تھی"(۵)۔اگر ہم قلعہ معلّٰی کی تمثیل کوغالب کی زندگی کو سمجھنے کی کلید بنالیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جو خودمختاری تیموری شاہان کو قلعے کے اندر حاصل تھی ، اسی سے ملتی جلتی خودمختاری غالب کو اپنی شاعری میں حاصل تھی۔بس ایک اہم فرق تھا دونوں میں۔ قلعے کے اندر کی دنیا کی خود

مختاری 'معمائی' یعنی Problematic تھی؛ اسے مغل بادشاہوں نے تین صدیوں کی بہترین عسکری اور ثقافتی پالیسیوں کی مدد سے تخلیق کیا تھا،لیکن وہ پہلے مرہٹوں اور اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھی۔حقیقت میں یہ خود مختاری، ایک نہایت کمزور سمجھوتے کے سہارے قائم تھی، جسے شاہ عالم ثانی تا بہادر شاہ ظفر انگریزوں سے کرتے چلے آرہے تھے،اور جس میں ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۵۷ء (سوائے سوروزہ آزاد حکومت کے) کے عرصے میں بس ایک ہی تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی؛ یہ کہ خود مختاری مسلسل سکڑتی جارہی تھی۔دوسری طرف غالب کی شاعری کی خود مختار دنیامیں انگریز کا عمل دخل نہیں تھا۔نام کے مغل شاہان دربار کے آداب ہوں کہ اپنے جاں نشین مقرر کرنے کی روایات ....ان میں سے کسی شے کی حفاظت نہ کرسکے۔اس عہد میں واحد غالب تھے ،جنھوں نے مغل ہندوستانی جمالیات اور شعریات کی نہ صرف حفاظت کی ،بلکہ ان کی داخلی تخلیقی صلاحیت کو منتہاے کمال تک پہنچایا۔

دہلی میں غالب کے شب وروز وہی تھے جو ہندوستانی اشراف کے تھے: حویلی، ملازمین، عمدہ لباس، عمائدین شہر سے بہ اہتمام ملاقاتیں؛ کھیل، علمی مجالس ،مشاعرے اورشراب۔ یہی طبقہ اشراف ایک طرف اپنی وضع داری قائم رکھتا تھا ،اور دوسری طرف نئے خیالات، نئے بندوبست، نئے مواقع سے استفادے پر ہمہ دم مائل رہتا تھا۔ غالب نے نودس برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔کلکتہ جانے سے پہلے تک وہ اردو ہی میں لکھتے رہے، سوائے چند فارسی رباعیات کے۔ہم غالب کے انگریزوں اور یورپی کلچر سے تعلق کو سمجھنے کی جو کوشش کررہے ہیں ،اس کے تناظر میں دیکھیں تو اردو شاعری غالب کے لیے اطمینان کا باعث ہوگی۔انگریزوں کی طرف سے خالص سیاسی مصلحتوں سے نہ صرف رفتہ رفتہ فارسی رخصت کی جارہی تھی، بلکہ اس کی جگہ اردو کی سرپرستی کی جارہی تھی۔دہلی میں قلعے سے باہر کچھ اہم تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ ۱۷۹۲ء میں مدرسہ غازی الدین حیدر سے شروع ہونے والا،اور۱۸۲۵ء میں کالج بننے والا، دہلی کالج ،ان تبدیلیوں کا ایک مرکز تھا۔اردو قارئین کے حافظے میں'' دہلی کالج علامت ہے ،انگریزوں اور ہندمسلم کلچر کے مابین رابطے کی ،جواردو کے ذریعے قائم ہوا''(۶)۔ اردو مؤرخوں نے مبالغے سے کام لیتے ہوئے اس کالج کومغرب ومشرق کے درمیان رابطے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اصل سوال یہی ہے کہ مذکورہ رابطے کی نوعیت کیا تھی؟

کیا یہ ایک ایسا ادارہ تھا، جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی استعماری حکمت عملی کے کارفرما ہونے کی راہ مسدود کردی تھی ، اور جہاں یورپی اور مشرقی علوم قدری اور افادی سطحوں پر برابر سمجھے گئے تھے،اور جس تحقیری رویے کا اظہار لارڈ میکالے کی یادداشت میں ہوا،اس کا شائبہ یہاں موجودنہیں تھا؟دوسرے لفظوں میں یہ کالج اردو میں منتقل ہونے والے جدید یورپی علوم کے ذریعے ثقافتی برتری کا احساس دلانے کا منشا رکھتا تھا یا اس جدیدیت کی روشنی پھیلا نا چاہتا تھا جس کے علم بردار برطانوی حکام تھے؟ اکثر مؤرخوں نے ان سوالوں سے صرفِ نظر کیا ہے۔تاہم مذکورہ سوالوں کے جواب چند حقائق سے مل سکتے ہیں۔۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کرتے وقت یہ شق شامل کی گئی کہ وہ ایک لاکھ روپیہ ''علم و ادب کے احیا،ہندستانی علما کی حوصلہ افزائی اورعلم و سائنس کو ہندستان کے برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں رائج کرنے'' پرخرچ کرے گی(۷)۔ دس سال تک اس پرعمل درآمدنہیں ہوا۔ جب عمل درآمد شروع ہوا تو دہلی کالج کے لیے پانچ سو روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک سو پچہتر روپے(بعد میں تین سو روپے) پرنسپل کی تنخواہ ، ایک سوبیس روپے ہیڈ مولوی کی تنخواہ اور دو دو مولوی پچاس پچاس روپے کے رکھے گئے(۸)۔بعد میں دیسی مولویوں کی تنخواہیں دس روپے تک رہیں۔ ۱۸۲۹ء میں نواب اعتمادالدولہ سیدفضل علی خان بہادر وزیر اودھ نے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم کالج کے لیے وقف قائم کیا۔ یہ رقم اس وعدے کے ساتھ لے لی گئی کہ نواب صاحب کے نام سے پروفیسروں کا تقرر ہوگا اور اور طلبا کے لیے وظائف جاری ہوں گے۔ ایک سال بعد نواب صاحب کا انتقال ہوگیا مگر یہ رقم کالج پرکبھی خرچ نہ ہوسکی۔ ۱۸۳۵ء میں طے ہوا کہ'' آئندہ [رقوم]دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی علم ادب اور سائنس کی اشاعت میں صرف کی جائیں''(۹)۔

یہاں تفصیل سے اس موضوع پر بحث کی گنجائش نہیں۔ہم خودکو غالب کے ضمن میں اٹھائے گئے اس سوال تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، جو غالب کی جدیدیت کے ضمن میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے لیے دہلی میں اگر واقعی کچھ نیا تھا تو اس کا تعلق اسی کالج سے تھا۔ غالب کے چند قریبی احباب اس کالج سے وابستہ تھے(امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ)۔لیکن یہ حضرات اس کالج میں اپنے روایتی علوم کی تدریس پر مامور تھے،یعنی ان کے

پاس جو کچھ 'نیا' تھا وہ یورپی الاصل نہیں، مشرقی الاصل تھا۔اسی کالج میں غالب کو فارسی کے استاد کی پیش کش ہوئی۔غالب نے یہ پیشکش ٹھکرادی۔اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ غالب کا استقبال نہیں ہوا۔خود غالب نے بھی اپنے خط میں یہی وجہ بیان کی ہے۔لیکن کیا واقعی وجہ صرف یہی تھی؟غالب کے انکار کو محض ان کی انانیت سے تعبیر کرنے کے بجائے، کچھ اور باتوں کو بھی ملحوظ رکھنا مناسب ہوگا۔پہلی بات یہ کہ دہلی کالج کے بارے میں مسلمانوں میں یہ رائے عام تھی کہ وہ ایک خیراتی ادارہ ہے۔مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مسلمان شرفا، نواب اور سلاطین دلی کالج کو ایک خیراتی درس گاہ تصور کرتے تھے، اور اس بنا پر اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کی غرض سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے''(۱۰)۔جس خیراتی ادارے میں مسلمان شرفا اپنے بچوں کو داخل نہیں کراتے تھے، اس میں 'شریف غالب' کیسے پڑھانا پسند کرسکتے تھے؟نیز اگر دہلی کالج واقعی مشرق ومغرب کے درمیان یا کم ازکم انگریزوں اورمسلمانوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھا تو غالب کو اور کیا چاہیے تھا؟

دہلی میں مغربی اثرات سے جو ایک نئی چیز رفتہ رفتہ وجود میں آرہی تھی، اور دہلی کی ثقافتی، ذہنی زندگی میں تبدیلی لارہی تھی، وہ دہلی سے جاری ہونے والے اردواخبارات تھے، اور لیتھو پریس تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ اخبارات کا اجرا دہلی کالج کے اساتذہ اور سابق طلبا کا مرہون ہے۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی میں پہلا سنگی مطبع قائم ہوا،اور دو برس بعد دہلی کالج کے فارغ التحصیل مولوی محمد باقر نے دہلی اردو اخبار کے نام سے اخبار جاری کیا(۱۱)۔بعد میں دہلی کالج کے پرنسپل شپرنگر(قران السعدین) اور اسی کالج سے تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر(فوائد الناظرین، محبّ ہند) نے بھی اخبارات جاری کیے تھے۔ بہ قول طاہر مسعود'' اردو اخبارات کے اجرا وترقی میں انگریزوں اور اس کے افسروں کی امداد، تعاون اور سرپرستی کا خصوصی دخل تھا''(۱۲)۔ اس کا ایک اثر دہلی کی ثقافتی زندگی پر یہ پڑا کہ ایک نیا اجتماعی تخیل پیدا ہونا شروع ہوا،جس کی باگ ڈور اخبارات کے ہاتھ میں عمومی طور پر اور چھپے ہوئے لفظ کے ہاتھ میں خصوصی طور پر تھی۔یہیں سے چھپے ہوئے لفظ پر اختیار کی کش مکش بھی شروع ہوئی۔ غالب نے اپنا دیوان ۱۸۳۳ء میں مرتب کیا تھا مگر اس کی اشاعت ۱۸۴۱ء میں مطبع سید الاخبار سے ہوئی تھی۔ غالب کے لیے دیوان کی اشاعت ایک نیا تجربہ تھا، جسے یورپی ٹیکنالوجی نے ممکن بنایا تھا۔اس کے ذریعے ان

کا کلام ان لوگوں تک بھی پہنچا،جن سے غالب آشنا نہیں تھے۔

دہلی میں غالب کی گزر بسر انگریزی پنشن پر تھی ،تاہم وہ قلعہ معلیٰ سے تعلق استوار کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے ۔شاید اسی بنا پر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ ’’ان [غالب] کی وفاداری بھی منقسم تھی ۔وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں‘‘(۱۳)۔غالب کی معاشی جدوجہد کے سلسلے میں ’وفاداری‘ کا لفظ شاید مناسب نہیں،البتہ ’طرف داری‘ کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔خود غالب نے کہہ رکھا ہے :

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اسی سے ملتی جلتی بات میر نے بھی کہی ہے:

مر رہیں اس میں یا رہیں جیتے
شیوہ اپنا تو ہے وفاداری

گویا وفاداری میں استورای ، استقلال کے ساتھ جاں کو نثار کرنے کا وافر جذبہ بھی ہوتا ہے۔ غالب بہ طور شاعر وفاداری کے معنی سے واقف ہی نہیں تھے، اس معنی کو پر شکوہ بنانے کے بھی قائل نظر آتے ہیں، نیز اپنے خاندان ،اپنے بھائی، اپنے نوکروں اور اپنے احباب کے ضمن میں وہ وفاداری کے جذبات رکھتے تھے،مگر مقتدر لوگوں کے سلسلے میں نہیں۔لہٰذا یہ بات غلط نہیں کہ ’’جب تک ہندوستان کا پلہ بھاری رہا ،غالب قلعے جاتے رہے،اور جب ہندوستانیوں کو شکست ہوگئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہوگئے‘‘(۱۴)۔اپنے خاندانی بزرگوں اور اس زمانے کے اکثر اشراف کی مانند غالب کے لیے سیاسی وفاداری کا تصور،استواری کی شرط نہیں رکھتا تھا۔ان کے خاندان کی تلوار کی طرح، ان کی تیغِ مدح کو اپنا ممدوح اور سرپرست تبدیل کرنے میں عار نہیں تھا۔وہ شاعری میں تقلید بزرگاں کے قائل نہیں تھے،مگر عملی زندگی میں تھے۔

اپنے قصائد اور دستنبو میں غالب نے جس طرح بڑھ چڑھ کرانگریزوں کی طرف داری کی ہے ، اور اپنی طرف داری کو حق پر مبنی ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے، وہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ پہلے دستنبو سے کچھ اقتباسات دیکھیے :

اس جہاں سوز منحوس دن میرٹھ کی کینہ پرور فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سپاہی شہر میں آئے ۔یہ سب بے حیا اور مفسد اور نمک حرامی کے سبب انگریزوں کے خون کے پیاسے ۔شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے، بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہوگئی ہو، شہر کی حفاظت اور ذمے داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے(۱۵)۔

اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمھاری زبان اور تمھارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرز عمل یاد کرو۔اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو(ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی جو گناہ ہے.....سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے(اس کے مقابلے میں ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیےلڑنے اٹھے اور گناہگاروں کو سزا دینے کے لیےلشکر آراستہ کیا ،چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو اس کا موقع تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی ،لیکن انھوں نے ضبط کیا(۱۶)۔

غالب نے 'جنگ آزادی' کو بغاوت ہی کا نام نہیں دیا، ہندوستانی فوج کی سخت ترین الفاظ میں مذمت بھی کی ۔اسے کینہ پرور، بے حیا، مفسد،نمک حرام کہا۔اسی پر بس نہیں کی۔ظلم و انصاف کو سمجھنے والوں اور ظلم کو برا کہنے والوں کومخاطب کرکے یہ باور کرانے کی کوشش بھی کہ ہندوستانی تلوار اٹھا کر بے وفائی کے مرتکب ہوئے ،اور گناہ کیا۔دوسرے لفظوں میں ستاون کی رستخیز میں غالب ،ہندوستانیوں کے ساتھ نہیں ، انگریزوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ غالب کو اپنے ترک سلجوقی ہونے پر فخر تھا،مگر ان کی روح ہندوستانی تھی؛وہ روح جس

کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے،اور ان کی عام اخلاقی سماجی زندگی میں ہوا ہے۔ پھر غالب نے ان 'کافر فرنگیوں' کا دفاع کیوں کیا ، جنھوں نے ہندوستان کی دولت وحشمت کھینچ لی تھی،اور جس کا اثر خود غالب پر بھی پڑا؟[بہ قول مصحفی: ہندستاں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی/کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی] ۔ اس کا جواب آسان نہیں۔تاہم جواب تلاش کرنے کی کوشش کرنے میں حرج نہیں۔

غالب کی انگریزوں کی طرف داری کا دفاع نہیں کیا جاسکتا ۔صرف اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسا شاعر جو انسانی ہستی کے رموز کا عارف ہو، جو اشیا کے عارضی پن کا عرفان رکھتا ہو،جس کی نظرِ تخیل میں دنیا بازیچۂ اطفال ہو، جو دنیا ، سماج ، مذہب کے کبیری بیانیوں پر استفہام قائم کرنے کی جرأت رکھتا ہو، وہ کیوں کر استعمار کار کی حمایت میں رطب اللسان ہوتا ہے؟ زیادہ تر لوگوں نے اس ضمن میں غالب کی کہن سالی اور ضعف کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے،لیکن یہ کافی کمزور اور سادہ لوحی پر مبنی دلیل ہے۔اوّل یہ کہ کیا ضعیفی اور کہن سالی مزید جینے کے لالچ کا دوسرا نام ہے؟دوم، اس دلیل میں جسمانی طاقت اور اخلاقی جرأت کو گڈ مڈ کردیا گیا ہے۔سقراط سے برٹرینڈرسل تک کئی بوڑھوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا۔گمان غالب ہے کہ غالب عدم تحفظ کے نفسیاتی عارضے کا شکار تھے،جو معاشی طور پر منحصر ہونے کی اس حقیقت کا نتیجہ تھا جو برابر غیر یقینی کا شکار تھی۔یہی وہ عارضہ تھا جو انھیں پنشن کی بحالی کو زندگی کی بڑی جدوجہد بنانے کی تحریک دیتا تھا۔غالب کی حقیقی زندگی میں ہم جس عملی جدوجہد کو دیکھتے ہیں،اور اس دوران میں ان کی مایوسی ، ناکامی ، انا کی شکست ،مصائب پر مصائب کو آشکار ہوتا دیکھتے ہیں، وہ سب پنشن کے اس قضیے سے پھوٹتا ہے،جس کا تعلق انگریزی حکومت سے تھا۔غالب کی اس جدوجہد میں وہی سرگرمی، جرأت ،اور اپنی بہترین جسمانی وذہنی توانائیوں کو صرف کرنے کا عمل دکھائی دیتا ہے جو ایک عظیم جدوجہد کے تصور کے بغیر ممکن نہیں۔ سب سے عظیم جدوجہد 'بقا' کی ہے۔ غالب کے لیے بقا بہ یک وقت معیشت اورآبرو کا مفہوم رکھتی تھی۔غالب اشراف کے طرز زندگی اوراعتراف عظمت کے طور پر خلعت وخطاب کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔

علاوہ ازیں یہی وہ عارضہ تھا جو انھیں قومی سطح کے واقعات کو بھی خالص شخصی نظر سے

دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ دستنبو ہی میں غالب نے لکھا ہے کہ'' میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم ونسق (غدر میں)تباہ نہ ہوتا اور ناخداترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اجڑ جاتیں تو گلستان انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہوجاتیں اور میری آنکھیں اور میرادل دونوں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ''[۱۷]۔ ہندوستان کی تاریخ وتقدیر کو بدل کر رکھ دینے والے واقعے کی بابت یہ رائے وہی شخص دے سکتا ہے جسے اپنے تحفظ کا خوف بے بس کردینے والا ہو۔اپنے تحفظ کے خوف کا شکار شخص ، سماجی زندگی میں فعال کردار ادانہیں کرسکتا۔ چوں کہ وہ تباہی کے ڈر سے برابر دوچار رہتا ہے ،اس لیے جیسے ہی تباہی کے مناظر دیکھتا ہے تو اس کا دل بری طرح افسردہ ہوجاتا ہے۔دہلی کی تباہی پر غالب کی افسردگی کو اسی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے:

> دل ہے ،پتھر یا لوہے کا ٹکڑا نہیں،کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں ہیں،روشندان یا دیوار میں سوراخ نہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ہاں حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیے[۱۸]۔

بعض نے غالب کی طرف داری کی توجیہہ میں اشتراکی دلیل سے کام لیا ہے ۔ ان کے مطابق غالب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس کے مفادات انگریزوں سے تھے۔ مثلاً شمیم طارق کہتے ہیں کہ غالب نئے روشن خیال طبقے کے فرد تھے،جن کی دولت وسماجی حیثیت کا دارومدارانگریزوں کی دولت پر تھا،اس لیے انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔شمیم طارق کا یہ بھی خیال ہے کہ غالب کی کسی تحریر سے واضح نہیں ہوتا کہ انھوں نے''عزت کی زندگی کے لیے ملک کی آزادی کو ضروری سمجھا ہو،حالاں کہ ان کے سامنے احیا پسند مجاہدین اور حریت پسندسپاہیوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے ،جو انگریزوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجودان کی مخالفت یاان سے بیزاری کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے''[۱۹]۔ان میں مفتی صدرالدین آزردہ اور امام بخش صہبائی قابل ذکر ہیں۔دونوں غالب کے دوستوں میں شامل تھے۔ اس دلیل میں وزن ہے۔ بایں ہمہ چند دوسری باتوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ غالب کی فرنگیوں کی حمایت کا جائزہ اس قومی شعور کے تحت لیا گیا ہے جو انیسویں صدی ہی میں پیدا ہوا تھا،اور سب سے پہلے بنگال میں۔ ادیب و دانشور کی ذمہ داری کا سوال بھی اسی

قومی شعور کی راست پیداوار ہے۔انیسویں صدی کے بعد سے قوم پرستی، قومی شعور، قومی احساس، حب الوطنی آسیب کی طرح ہماری ہر فکر پر چھائے ہوئے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ غالب ہی کے زمانے میں قومی شعور بیدار ہونے لگا تھا،مگر غالب اس میں شریک نہیں تھے۔بجا کہ غالب جب کلکتہ گئے ،تب وہاں راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک چل رہی تھی۔یہ بھی درست کہ غالب کی دلی پر جس سال(۱۸۰۳ء) لارڈ لیک نے قبضہ کیا ،اسی سال دہلی کے شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔اسی طرح غالب ہی کے ہم عصر مومن نے سید احمد شہید کی تحریک میں باقاعدہ شرکت کی غرض سے مثنوی لکھی....لیکن غالب ان سب سے دور رہے۔

قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ہم نے ادیب وشاعر ودانشور کی شخصی اور ذہنی زندگی دونوں کے سلسلے میں ایک اصول تسلیم کرلیا ہے کہ اس نے'قو می وسماجی' ذمہ داری کس حد تک ادا کی۔یہ اصول نو آبادیاتی اصلاحی تحریکوں (جن کی نمائندگی اردو میں انجمن پنجاب اور علی گڑھ تحریک نے کی ،اوربیسویں صدی میں اشترا کی منشور کے ساتھ ترقی پسند تحریک نے کی) کی دین ہے ،جنھوں نے ادیب کی شخصی اور ذہنی زندگی کو سماجی زندگی،اور اس سے بھی بڑھ کر اس ڈسکورس کے تابع کرنے کا بیڑہ اٹھایا، جسے نو آبادیاتی جدیدیت کا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا تھا۔ایک اور بات بھی تھی ۔ یہ اصول نہ تو اس علمیات سے اخذ کیا گیا تھا ،جو شاعری کی تفہیم کے لیے صدیوں سے چلی آتی تھی، اور جسے غالب نے بھی جذب کر رکھا تھا ،اور نہ اس نفسیاتی عمل میں یہ اصول جڑیں رکھتا تھا ،جو شاعری کا محرک ہوتی ہیں۔البتہ اس میں لکھے ہوئے لفظ کی اس طاقت کا ادارک ضرور موجود تھا، جس کی ضرورت کا احساس تازہ تازہ ظہور میں آنے والی قوم پرستی نے دلایا تھا اور جس کے لیے کچھ ضعیف سی شہادتیں قدیم عربی شاعری سے حالی کو ملی تھیں۔ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں غالب کے لیے یہ اصول سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔وہ جس شعریات کے تحت شاعری تخلیق کررہے تھے، وہ مادی وذہنی زندگی ، یا دنیویت و مابعد الطبیعیات میں تفریق نہیں کرتی تھی:

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
ہرزہ ہے نغمہ زیر وبم ہستی و عدم
لغو ہے آئنہ فرق جنون و تمکیں

اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ غالب کو قومی انقلابی خیالات سے عاری ثابت کرنے کے لیے ان کی نثر کو بنیاد بنایا گیا ہے،اور شاعری سے بہت کم تعرض کیا گیا ہے،سوائے ان دو چار اشعار کے:

بس کہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

ان اشعار کا مضمون وہی ہے جسے غالب اپنے اردو خطوط اور دستنبو میں بھی پیش کر چکے ہیں۔ دہلی کی تباہی پر ملال کا اظہار۔ دہلی کی تباہی اس استعماری عمل کا نقطۂ عروج کہی جاسکتی ہے، جس کا باقاعدہ آغاز غالب کی پیدائش سے کم وبیش پچاس سال پہلے ہو چکا تھا،اور جسے ایک یا دوسرے طریقے سے غالب اپنی معاشی جدوجہد میں بھگت رہے تھے۔

غالب، یا کسی بھی شاعر کے لیے اس کی شاعری ان سب سوالوں سے نبرد آزما ہونے کا تخیلی میدان ہوتی ہے جو اسے حقیقی طور پر درپیش ہوتے ہیں، اسے دعوت مبارزت دیتے ہیں، اس کی بشری استعداد کا امتحان ہوتے ہیں،اس کے شعور کی حدوں کو پگھلانے لگتے ہیں، اور اس کے سماجی رشتوں اور بندھنوں کے بنے بنائے تصورات پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ تخیلی میدان ،حقیقت سے مکالمے ،حقیقت کو پلٹانے، حقیقت سے گریز اور حقیقت کی نئی تشکیل اورنئی

حقیقت کی تخلیق کا ذریعہ ہوتا ہے۔اگر تخیل محدود ہو، یعنی محض شخصی نظر سے اوجھل چیزوں کا ،یا سنی سنائی باتوں کا خیال منفعل انداز میں باندھ سکتا ہو یا تصور کرسکتا ہو تو وہ حقیقت کی تشکیل تو دور کی بات ہے ،وہ حقیقت سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم ہوتا ہے ؛ لیکن جس شاعر کا تخیل وسیع ہو، یعنی تاریخ اور اجتماعی یادداشت سے اوجھل چیزوں کا فعال انداز میں تصور کرسکتا ہو، اور ان میں نئی ترتیب پیدا کرسکتا ہو، اور تاریخ و یادداشت میں موجود چیزوں کے باہمی رشتوں کو توڑ کر ،ان میں نئے رشتوں کو جنم دے سکتا ہو، وہ حقیقت کے سلسلے میں وہ سب کرسکتا ہے ،جس کی طرف اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔تخیلی میدان میں حقیقت سے مکالمہ لازماً تاریخی جہت رکھتا ہے۔یعنی شعری تخیل اور سماجی وتہذیبی حقیقت کے بیچ 'تاریخیت' موجود ہوتی ہے ۔تاریخیت کو ہم مخصوص تاریخی لمحے یا صورتِ حال سے شاعر کی اس کشمکش ،مصالحت ،زیر ہونے یا پلٹانے جیسے متضاد رویوں کا نام دے سکتے ہیں ،جس سے وہ اپنی شاعری میں نہ صرف معنی پیدا کرتا ہے، بلکہ معنی کو استحکام بھی دیتا ہے،اور وہ مستحکم معنی ، اس مخصوص تاریخی لمحے کے اندر اپنا جواز حاصل کرتا ہے۔

غالب کی شاعری کو اس تناظر میں دیکھیں تو وہ تین طرح سے اس استعماری تاریخی لمحے (جو رفتہ رفتہ بننے کے عمل سے نقطہ عروج تک پہنچا) سے نبردآزما ہوتی ہے۔یعنی تین طرح کی حکمت عملی اختیار کرتی ہے۔ پہلی حکمت عملی 'سپر نہ ڈالنے' سے عبارت ہے۔ غالب انگریزی طور طریقوں کی تعریفیں کرنے کے باوجود ،انگریزی شاعری ،اور یورپی فکر کو سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ وہ جس انگریزی آئین کو 'جدید' سمجھتے تھے، اور جسے اپنے زمانے کی حقیقت قرار دیتے تھے ، اور یہ بھی خیال کرتے تھے کہ وہ ایک سیل کی طرح ہندوستانی آئین کو بہالے جانے والی ہے، اسے انھوں نے اپنی شعریات کا حصہ نہیں بنایا۔ وہ سرسید کو تو اس جانب متوجہ کرتے ہیں ،مگر خود اپنے ذہن کو اس سے الگ رکھتے ہیں ۔کیوں؟ غالب کا شعری تخیل جب اس نئی تاریخی حقیقت سے دوچار ہوتا ہے تو سپر نہ ڈالنے کا فیصلہ کرتا ہے،اور اس لیے کرتا ہے کہ اس کے پاس سپر ہے ،یعنی اپنی جدید شعریات! غالب کو اپنی شعریات کے قدیم ہونے کا احساس سرے سے تھا ہی نہیں۔ غالب خودکو اپنے پیش روفارسی واردوشعرا سے الگ سمجھتے تھے۔

ہم یہ تصور نہیں کرسکتے کہ غالب کی شاعری جس تہذیب کی پیداوار تھی ،اور جس کی

نمائندگی ان کی شاعری میں ہورہی تھی ،غالب اس تہذیب پر استعماری یلغار کومحسوس نہ کرتے ہوں،اور اس کے ضمن میں ایک خاص طرز عمل اختیار کرنے کی انھیں فکر نہ ہو۔ غالب سماجی ومعاشی سطح پر عدم تحفظ کا شکار ضرور تھے،مگر شعری تخیلی سطح اور شعریات کی سطح پر کسی کمزوری کا شکارنہیں تھے؛وہ بلا شبہ غیر معمولی وسیع تخیل کے حامل تھے۔ کہنے کا مقصود یہ نہیں کہ غالب نے شاعری میں اپنی نثر کے برعکس لکھا ہے ،اور انگریزوں کی مذمت کی ہے۔ اگر ایسا کرتے تو اپنی شاعری کی قربانی دیتے۔

غالب نے انگریزوں کی طرف داری کی ،انگریزی آئین اور دخانی تہذیب کی بھی تحسین کی ،لیکن کیا خود بھی انگریزی ریورپی تہذیب سے بھی استفادہ کیا؟ مغربی جدیدیت کی طرف سرسید کو متوجہ کرنے کے سلسلے میں غالب کے سفر کلکتہ کا ذکر خاصا کیا جاتا ہے۔غالب کے اس سفر کا محرک ، اپنی خاندانی پنشن کی بحالی کی امید تھی۔اکبر شاہ ثانی کی دلی میں بھی اگر چہ حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا ،مگر کمپنی کے بڑے صاحب بہادر کلکتہ میں تھے ،جو انگریزی حکومت کا صدر مقام تھا۔ غالب ۲۰ ءفروری ۱۸۲۸ءکو'فیروزپور، کانپور، لکھنؤ، باندہ، الہ آباد، بنارس، عظیم آباد اور مرشد آباد سے ہوتے ہوئے، کلکتہ پہنچے'[۲۰]۔ یہ ایک طویل صعوبت بھرا سفر تھا،اور غالب کو کچھ ایسے'معارف' سے آگاہ کرنے کا وسیلہ بنا ،جن سے اکتیس سالہ غالب بے خبر تھے۔اسی سفر کے دوران میں غالب پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ شاعرکومعاشی وسماجی زندگی کے تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی برادری سے بھی معرکہ درپیش ہوتا ہے،اور وہ آدمی کی کمر توڑ سکتا ہے۔ اس معرکے کی یادگار مثنوی بادمخالف ہے۔یہ وطن سے دور ایک بڑے شاعر کی طرف سے آشتی کا پیغام تھا۔اسی سفر کے دوران میں غالب نے چراغ دیر تصنیف کی اور گل رعنا(فارسی واردو شاعری کا انتخاب) مرتب کیا۔دہلی میں غالب نے فارسی میں بہت کم لکھا ،سفر کلکتہ کے دوران میں انھوں نے فارسی میں زیادہ لکھا۔ مکاتیب اور شاعری دونوں۔فارسی کو ذریعہ اظہار بنانے کا فیصلہ بھی بے حد اہم تھا۔پنشن کے حوالے سے یہ سفر کچھ کامیاب نہیں ہوا،مگر تخلیقی حوالے سے اس کے ثمرات زیادہ تھے۔شاید اسی لیے کلکتہ غالب کے یہاں رنج و راحت کے ان جذبات کی یاد بن گیا،جنھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اس میں شک نہیں کہ غالب نے آئین اکبری کی تقریظ میں سرسید کو یورپ کی دخانی تہذیب کا احساس دلایا، مگر سوال یہ ہے کہ خود غالب اس تہذیب کی روح سے متاثر ہوئے تھے، اور کیا اس امر کی شہادت ان کی شاعری سے ملتی ہے؟ پہلے یوسف حسین خان کا اقتباس دیکھیے ،جس میں غالب کی جدیدیت کو مغربی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

> میرے خیال میں اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں جب کہ دہلی والوں کو انگریزوں سے براہ راست واسطہ پڑا، غالب ان چندلوگوں میں شامل تھے جنھوں نے انگریزی عمل داری اور اس کی کارگزاری کو خیر وبرکت خیال کیا،اور مغربی تہذیب کے بنیادی اصول کا خیر مقدم کیا۔یہ اصول انیسویں صدی کے شروع میں لبرل ازم کے ساتھ ہم آمیز تھے،جن کی تہ میں آزادی ،انفرادیت،قانونی مساوات ،انسان دوستی ،رواداری اور علمی تنقید کی لہریں انسانی ذہن کو سیراب کررہی تھیں۔یہ سچ ہے کہ غالب کا خاندان اور وہ خود انگریزوں سے وابستہ تھے ،لیکن ان کی یہ وابستگی افادی ہونے کے ساتھ ذہنی بھی تھی ۔غالب کی فراست نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ انگریزی عملداری جن انتظامی اور علمی اصولوں پر قائم ہے ،وہ شاہی اور جاگیرداری نظام سے اعلا وارفع ہے[۲۱]۔

یوسف حسین خان نے یہ تو درست کہا ہے کہ غالب کی انگریزی حکومت سے وابستگی افادی تھی ،مگر یہ کہنا درست نہیں کہ ذہنی بھی تھی ۔انھوں نے غالب کی شعریات میں مغربی عناصر کی نشان دہی نہیں کی۔حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں ملک واقعی بادشاہ کا تھا اور حکم کمپنی بہادر کا۔غالب کا دلی تعلق بادشاہ کے ملک دہلی سے تھا۔ دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ ضرور موجود تھا؛ انگریزوں نے دہلی کالج بھی قائم کردیا تھا جہاں انگریزی و اردو میں نئے علوم کی تعلیم دی جارہی تھی۔ قلعے کے معاملات میں کمپنی کا عمل دخل مسلسل بڑھ رہا تھا،اور غالب کا گزارہ کمپنی کی پنشن اورفرنچ وائن پر تھا،مگر اسی دہلی کی ثقافت،فن تعمیر،مدارس، مشاعرے، خانقاہیں وہی تھیں جن کی

تعمیر مغل جمالیات سے ہوئی تھی۔ غالب نے انگریزوں کے نمک خوار ہونے کا ذکر جابجا کیا ہے، ان کا ۱۸۵۷ء میں دفاع بھی کیا(جس کا تفصیلی جائزہ ہم لے چکے ہیں)،مگر انھوں نے پنشن کی جدوجہد کے بعد دوسری جدوجہد استاد شاہ بننے کے سلسلے میں کی۔ غالب کی شخصیت اور طرزِ زندگی اپنی اصل میں مغل اشراف کا تھا۔ غالب نے قیام دہلی میں انگریزی آئین کی تعریف نہیں کی۔ جب وہ کلکتہ پہنچے ہیں تو انھیں وہ شہر دہلی سے مختلف نظر آیا۔ کلکتے ہی نے انھیں اس ثنویت سے مطلع کیا جو گورے اور کالے، کولونیل شہر اور ہندوستانی شہر، انگریزی تہذیب و آئین اور مغلیہ ہندوستانی تہذیب و آئین سے عبارت تھی۔ دہلی میں وہ مٹکاف برادران سے ملتے رہے، کلکتے کے سفر کے بعد ولیم فریزر نے انھیں دہلی کالج میں فارسی استاد بننے کی پیش کش بھی کی، مگر انھیں دہلی میں رہتے ہوئے یورپی تہذیب کا قصیدہ لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ انھوں نے دہلی کا مرثیہ ضرور لکھا، جسے دخانی تہذیب والوں نے برباد کیا۔ کیا یہ غور طلب بات نہیں کہ اپنی مشہور تقریظ میں نئی دخانی تہذیب کی طرف سرسید کو متوجہ کرنے کے باوجود، خود اس کی طرف راغب نہیں ہوئے؟

دہلی میں بھی غالب کا واسطہ انگریزوں، ان کی تہذیب کے مظاہر، انگریزی اداروں (دہلی کالج) سے پڑتا رہا، ۱۸۵۷ء میں انھوں نے ان کی اسی طاقت کا بھیانک چہرہ بھی دیکھا، جس کی ستائش انھوں نے سفر کلکتہ میں کی تھی، مگر ان کی شاعری پر نئی یورپی تہذیب کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس شعریات کے حامل تھے، اس کی عظمت اور خود مختاریت کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور رکھتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے یہاں ایک کمی، ایک خلا، ایک شگاف کا ضرور احساس پیدا ہوتا، جسے وہ اس جدیدیت سے باقاعدہ استفادے یا استفادے کی آرزو کی مدد سے پورا کرتے، جس کی نمائندگی دہلی کالج کررہا تھا۔ ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ عام طور پر نئے رجحانات، نئے نظریوں اور نئی تہذیبی روشوں کو سب سے پہلے اشرافیہ قبول کرتی ہے، اور غالب کا تعلق اسی اشرافیہ سے تھا۔ دستنبو میں انگریزوں کی تعریف کرنے کے باوجود اگر انھوں نے اپنی شاعری میں انگریزی اثر نہیں آنے دیا تو اس کا سبب اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ ان کی شعریات اس جدیدیت کے سلسلے میں خود کفیل ہونے کے یقین سے سرشار تھی، جس کی وکالت ان کے دوست اور شاگرد، ان کی زندگی ہی میں کرنے لگے تھے۔

نو آبادیاتی جدیدیت سے اردو شعرا کا تعلق دو جذبیت کا تھا؛ وہ اس کی طرف کھنچتے بھی تھے ،اور اس سے بھاگتے بھی تھے۔وہ ایک دبدھے میں گرفتار تھے۔ جب وہ نو آبادیاتی جدیدیت کی طرف لپکتے تھے تو ایک طرف اس کا نیا پن (جو یورپی علوم وٹیکنالوجی کے شکوہ کا تاثر بھی لیے ہوتا تھا)انھیں اپنی طرف کھینچتا تھا،اور دوسری طرف وہ خود اپنی مقامی دنیا و روایت سے بے دخل اور معزول ہوتامحسوس کرتے تھے۔اگرچہ مقامی دنیا وروایت کے 'پس ماندہ، تاریک،قبل جدید' ہونے کا حاوی بیانیہ،انھیں وقتی طور پراس سے بے دخل ہونے کا جواز فراہم کرتا تھا،مگر اس حاوی بیانیے کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ وہ یادداشت کی گم شدگی کی بنیاد پر استوار تھا،اورگم شدہ یادداشت کے لوٹ آنے کا احتمال رہتا تھا۔(خاص طور پر انیسویں صدی سے شروع ہونے والی احیا پسندی کی تحریکیں گم شدہ یادداشت کو واپس لانے کی محرک بن جاتی تھیں)۔یادداشت کی واپسی ان کی ثقافتی بے دخلی کے تجربے کو ایک شدید نفسیاتی بحران میں تبدیل کردیتی تھی۔ایسے میں وہ نوآبادیاتی جدیدیت سے گریز اختیار کرتے تھے،اورطوفان میں گھرے جہاز کے مسافروں کی طرح انھیں ایک محفوظ لنگر کی تلاش ہوتی تھی۔ یہ لنگر غالب نے فراہم کیا۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا شاید ہی کوئی نقاد اور تخلیق کار ہو جس نے غالب کی جدیدیت کو نہ سراہا ہو!سوائے ان چند نقادوں نے جنھوں نے 'مابعد الطبعیاتی روایت' کا علم بلند کیا،جن میں حسن عسکری،سلیم احمد اور جیلانی کامران شامل ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگ غالب، غالب اکیڈمی ،نئی دہلی، ۱۹۷۱ء (۱۹۶۸ء)ص۵۳

۲۔ ایضاً،ص۲۲

۳۔ ایضاً

۴۔ غالب، دستنبو(ترجمہ شریف حسین قاسمی)،غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۷ء،ص ۷۸

۵۔ پرسیول سپئیر،Twilight of Mughal، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۷۳ء،ص ۳۸

۶۔ مارگریٹ پرناؤ،The Delhi College،اوکسفرڈ،ص ۱

۷۔ مالک رام، قدیم دلی کالج، ص۲۲

۸۔ مولوی عبد الحق، مرحوم دہلی کالج، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶

۹۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۱۔ طاہر مسعود، ،اردو صحافت انیسویں صدی میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۶ء ص ۱۶۳۔۱۶۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۳۔ خلیق انجم، غالب اور شاہانہ تیموریہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۹ء (۱۹۷۴ء) ص ۲۱

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ غالب، دستنبو، ص ۸۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۹۔ شمیم طارق، غالب اور ہماری تحریک آزادی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، ۲۰۰۷ء (۲۰۰۲ء) ص ۲۹

۲۰۔ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ص ۷۵

۲۱۔ یوسف حسین خان، غالب اور آہنگ غالب، ص ۲۰۔۲۱

☆☆☆

پیشکش: ڈاکٹر اسد فیض

علامہ اقبال پر دو قدیم ترین تحریریں

از: خلیل احمد (منٹگمری)

علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) برصغیر میں اسلامی تہذیب وتمدن اور فلسفہ کے شارح تھے۔انہوں نے اپنی شاعری سے جو اہم کارنامہ انجام دیا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔علامہ اقبال کی شاعری پر بے پناہ کام ہوا ہے ۔سوانح اقبال پر مزید کام اورمعلومات اقبالیات میں اضافہ ثابت ہوں گی۔راقم نے ماہ نامہ رومان لاہور سے خلیل احمد کا تحریر کردہ ایک مضمون دریافت کیا ہے[۱]۔ یہ ستمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔خلیل احمد۔بی اے کون تھے اس بارے میں اس سے زیادہ معلومات دستیاب نہیں کہ وہ رومان کے ادارہ تحریر میں شامل تھے اور خلیل منٹگمروی کے نام سے اُن کے افسانے بھی اس دور کے ادبی رسائل میں چھپتے رہے ہیں[۲]۔منٹگمری ساہی وال کا پرانا نام ہے یہ شہر سنٹرل پنجاب میں لاہور سے تقریبا ۱۶۰رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے یہ رابرٹ منٹگمری کے نام پر ۱۸۶۵ء میں قائم ہوا۔۱۹۶۷ء میں اس کا نام تبدیل کر کے ساہی وال کر دیا گیا۔یہ ستلج اور راوی کے درمیان واقع پاکستان کا انتہائی زرخیز زرعی علاقہ ہے[۳]۔ذیل میں خلیل احمد کے مضمون کا مکمل متن قارئین کی دلچسپی کیلئے پیش خدمت ہے:

یہ دسمبر ۱۹۳۰ کا واقعہ ہے۔میں منٹگمری کے ڈاک بنگلے میں ٹھیرا ہوا تھا۔دن کا کھانا کھا چکنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا۔باغیچے کے چھوٹے سے میدان میں میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز پر سگریٹ کا ڈبہ بھی رکھا تھا اور اس ڈبے میں اتنی جاذبیت تھی کہ میں اس کی طرف کھچا کھچا چلا گیا،غالبا کوئی صاحب یہاں پر بیٹھے بیٹھے اپنے کمرے میں گئے تھے میں نے وہاں پہنچتے ہی سگریٹ کے ڈبہ کو ہاتھ میں سنبھالا اور سگریٹ سلگا کر کرسی پر گر پڑا، چند لمحوں بعد کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ اقبال میرے ساتھ والے کمرے سے نکل کر میری طرف

بڑھے چلے آرہے ہیں ،حیران تھا کہ حضرت علامہ اقبال منٹگمری جیسے خشک اور ادب کش شہر میں کیونکر پہنچ گئے،کہیں آنکھوں کو دھوکا تو نہیں ہورہا ؟...... شاید میرے بچپن کا خواب آج پورا ہورہا ہو، میں استقبال کے لئے آگے بڑھا،میں نے کہا: ''مدت سے آرزوتھی کہ جناب کا نیاز حاصل کروں،شکر ہے آج اچانک میری آرزو پوری ہوئی،کسے معلوم تھا کہ آپ اس خطے کوبھی سرفراز فرمائیں گے اورمنٹگمری کے رہنے والوں کی بدقسمتی دیکھئے کہ ان لوگوں کوآپ کے آنے کا علم تک نہیں''۔ فرمانے لگے: ''میں مقدمے کے سلسلے میں آج صبح ہی یہاں پہنچا ہوں،سوچ رہا تھا کہ کراچی میل چھوٹنے کو ابھی چار گھنٹے باقی ہیں، باتوں کے بغیر وقت کیونکر کٹے گا، اس سگریٹ کے ڈبہ کا بھلا ہو کہ آپ کو کھینچ کر یہاں لے آیا ورنہ ممکن ہے آپ اپنے کمرے سے باہر ہی نہ نکلتے''۔

ان دنوں پنجاب میں کانگریس کا زور تھا۔راوی کے کنارے کانگریس کا اجلاس ہو چکا تھا اور کانگریسی لیڈروں کی آوازیں ابھی تک فضا میں گونج رہی تھیں اور علامہ مرحوم کوعوام ٹوڈی کے لفظ سے یاد کرتے تھے،یہاں تک کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی ان کی سرکار پرستی پر چہ میگوئیاں کررہی تھی اور اسی باعث ان کی شاعرانہ سطوت کوبھی کچھ عرصہ کے لئے گہن لگ چکا تھا۔میں نے کہا ''آپ کی شاعرانہ عظمت سے جسے انکار ہو وہ کافر ہے،لیکن قوم کی بہبود کے لئے جو راستہ آپ نے تجویز کیا ہے وہ کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔میرے خیال میں اس وقت کانگریس ہی ایک ایسی جماعت ہے جو ہندوستانی قوم کوقعرِگمنامی سے باہر نکال رہی ہے۔آپ نے سگریٹ سلگایا اور مطمئن لہجہ میں گفتگو کرنے لگے: ''مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ لوگوں نے پہلے بھی میری بات کونہیں سمجھا اور نہ اب سمجھیں گے،عوام ہنگامہ خیزیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں''، اس کے بعد انہوں نے واعتصموا بحبل الله کی تفسیر شروع کردی، دریا کا ایک دھارا تھا کہ ٹوٹ کر بہہ نکلا اب تک ان کی باتیں کانوں میں گونج رہی ہیں آیۂ مذکور کا بیان اس قدر جامع تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا قرآن پاک کی عظمت کا راز اسی آیت

میں مضمر ہے پہلی دفعہ مجھے اس بات کا احساس ہوا آج بھی قرآن کو سمجھنے والا دنیا میں ایک شخص موجود ہے۔علامہ مرحوم نے ان تین لفظوں کو پھیلا کر ایک سمندر بنا دیا۔فرمانے لگے ''میں نوجوانوں کو دوسری جماعتوں میں شامل ہونے سے نہیں روکتا مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر خدا کرے اس رشتے سے کوئی مضبوط تر رشتہ ان کے ہاتھ آجائے تو وہ بے دھڑک اس سے منسلک ہوجائیں''علامہ مرحوم تفسیر قرآنی میں اس قدر محو تھے کہ انہیں وقت کا بھی احساس نہ رہا،متواتر ساڑھے تین گھنٹے تک وہ گفتگو کرتے رہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو گاڑی پہنچنے میں چند منٹ باقی تھی، میں نے عرض کیا: ''کراچی میل تو آیا چاہتی ہے''، فرمانے لگے: ''افسوس وقت تھوڑا تھا ورنہ ممکن ہے میں آپ کے شکوک رفع کرسکتا''۔ میں نے فرطِ عقیدت سے اُن کے ہاتھوں کو چوم لیا۔وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا''۔

-2-

ساہیوال کی ادبی تاریخ بھی مرتب کی جانی چاہیے تا کہ اس طرح کے ماضی کے ادیبوں کا تعارف و تفصیل تصانیف دستیاب ہوسکے۔خلیل احمد نے اختر شیرانی کے رومان کے اپریل ۱۹۳۸ کا اداریہ بھی ''علامہ اقبال کا انتقال'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔اس میں وہ علامہ اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہندوستان کا شاعر اعظم اپنی موت سے چند منٹ پیشتر یہ اشعار کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ یہ ایسا جانگداز حادثہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں کہرام مچ گیا ہے اور اقصائے عالم کے کونے کونے میں صف ماتم بچھ گئی ہے ۔اقبال کی موت ایک معمولی واقعہ نہیں ۔قومیں صدیوں کے بعد اس رتبے کا شاعر پیدا کیا کرتی ہیں اور اس کی موت کے بعد صدیوں تک اس کا ماتم کرتی

ہیں ۔اقبال یقیناً مشرق کا بہت بڑا شاعر تھا جس کے بعد شعر و شاعری،علم و فضل،فلسفہ وتصوف کی محفلیں سونی ہوچکی ہیں۔وہ دانائے راز جو ایک سرنہاں کو تمام دنیا اورخصوصاًعالم اسلام پر منکشف کرنے کے لئے اس نفسانفسی کے زمانے میں ظاہر ہوا تھا اب ہمیشہ کے لئے اس ابدی راز کی تاریکی میں روپوش ہوگیا، جسے ہم موت سے تعبیر کرتے ہیں ۔لیکن اس کی موت میں قوم کی زندگی کا راز مضمر ہے، وہ ابدی نیند سو چکا ہے،چاروں طرف رنج وغم کی گھٹائیں چھا چکی ہیں۔دنیا کی آنکھ میں آنسو اُمڈ آئے ہیں لیکن فطرت انسانی کے ہونٹوں پر تبسم ظاہر ہے کیونکہ وہ حیات انسانی کے وہ رموز بیان کرکے رخصت ہوا ہے، جس سے قوم اپنے اندر بیداری محسوس کرنے لگی ہے اور ایسا کھلا ہوا راستہ محسوس کررہی ہے جس پر گامزن ہونے کو وہ اپنی نجات تصور کرتی ہے۔علامہ مرحوم ایک مدت سے بیمار چلے آتے تھے لیکن تین چار ماہ سے مرض خطرناک صورت اختیار کرچکا تھا آخر اس پیغام کا وقت آپہنچا جس کے سامنے دنیا کی عظیم ترین شخصیتوں کے سر جھک جاتے ہیں۔وہ اقبال جو مدت سے اپنی قوم کو زندگی کا پیغام دے رہا تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا،لیکن اس کے نغمے ابدتک فضا میں گونج پیدا کرتے رہیں گے اور وہ خودی کی وہ زبردست تعلیم جس کے لئے اس نے اپنی دنیائے تخیل کو وقف کردیا تھا کائنات کے ذرے ذرے سے ہمیشہ خراج تحسین وآفرین حاصل کرتی رہے گی۔اس بے مثال شاعر کے کارنامے کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔موت کا پردہ اس آفتاب عالمتاب کی نور افشانیوں کونہیں روک سکتا۔شاعر مشرق کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کے پر ہونے کی توقع صدیوں تک ایک واہمہ ہے ۔ فطرت انسانی کے سب سے بڑے نباض کے چلے جانے سے ہر ایک روح افسردہ ہوچکی ہے لیکن اس کے نغمے جو اس وقت فضائے عالم پر مسلط ہیں ایک نئے مستقبل کی نوید پیش کررہے ہیں،وہ خودی کی تعلیم دیتے وقت انسان کو یہ خوش خبری دیتا ہے :

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود
خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود

ولیکن چوں بخود نگریستم من
کران بیکراں در من نہاں بود

وہ اپنی قوم کو یہ پیغام دے کر رخصت ہوگیا، لیکن اس کی روح قوم کی حیات میں سما چکی ہے خودی کے ضمن میں جو اسرار حیات اس نے بے نقاب کئے ہیں۔اس پر مغرب اپنی انتہائی تہذیب کے باوجود انگشت بدنداں ہے۔رموز انسانیت کے سب سے بڑے رازداں کی موت پر ساری کائنات ماتم کناں ہے۔ کیا اس کا بدل قوم کو میسر آسکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ صدیاں دیں گی اقبال کی آواز نے مشرق کی آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ حقیقت میں مشرق کا شاعر تھا۔اس نے مشرق کی روح کو پہچانا اور اپنے بلند ترین تخیل میں مشرقیت کو بسا کر اقوام عالم کو پیغام دیا،مغرب کا قلیل ترین اثر بھی اس نے اپنے خیالات میں ظاہر نہیں ہونے دیا اور یہی اس کے مشرق کے بہت بڑے شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ آج مشرق کے ذہنی رجحانات کو بیدار کرنے والا ہم میں موجود نہیں، لیکن اس کے وطنیت کے نغمے ہمیں ابد تک سرگرم عمل رکھیں گے۔اس شاعر اعظم کی یاد سے دلوں کو گرمانے کے لئے ایک ایسی یادگار قائم کرنے کی توقع کی جارہی ہے جس سے اس عظیم ترین شخصیت سے قوم کی عقیدت کا اظہار ہوسکے"۔

حواشی وحوالے:

۱۔ علامہ اقبال کی صحبت میں چند لمحے،خلیل احمد بی اے،ماہ نامہ رومان لاہور،ستمبر ۱۹۳۸،ص ۹ تا۱۰

۲۔ خلیل احمد کے بہت سے افسانے اس دور کے ادبی جرائد میں چھپے ان میں سے ایک افسانہ خلیل احمد منٹگمروی کے نام سے بھی ،ماہ نامہ نیرنگ خیال لاہور، ستمبر ۱۹۲۹ ،جلد ۹، شمارہ ۶۴ میں "کانتی" کے نام سے ص ۴۱ پر طبع ہوا ہے۔

(خ۔احمد، حوالہ: رومان لاہور جلد ۶ شمارہ نمبر ۶ اپریل ۱۹۳۸ص ۶ تا ۷)

☆☆☆

پروفیسر عبدالخالق رشید

راجا مہندر پرتاپ کی تین تاریخی باتیں

افغانستان کا حصہ ہندستان کی آزادی میں

ہندوستان کے جدید عہد کی تاریخ میں راجا مہندر پرتاپ کا نام انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے سلسلے میں ایک خاص مقام کا حامل اور جہد آزادی کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔راجا مہندر پرتاپ ہندو جاٹ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔جاٹ کا شمار شمالی ہند کی بہت مشہور قوموں میں ہوتا ہے۔جس طرح پشتون قوم تاریخ کے طویل سفر میں کابل کے گردونواح میں آباد رہی اور کابل کی نعمتوں اور شہری سہولیات سے کبھی بھی فیضیاب نہ ہوئی،ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں جاٹ دہلی کے گردونواح میں آباد رہے اور برطانوی دورِ حکومت تک پسماندگی میں رہے۔بہت سی شہری اور تمدنی سہولیات سے محروم رہے۔جاٹوں کے سلسلے میں ایک دوسری تاریخی صداقت کی طرف متوجہ دلانا چاہوں گا۔وہ یہ ہے کہ جاٹ قوم اٹھارہویں اورانیسویں صدی کے درمیان نہ تو سکھوں اورمرہٹوں سے برسرِ پیکار ہوئی اور نہ ہی مغلوں اور درّانیوں کے خلاف لڑائی کی۔ اس کے برخلاف جاٹ قوم بھی ہندوستان کی دوسری کئی قوموں کی طرح مرہٹوں کے حملے اورمظالم کے سامنے تاب نہ لا پائی۔یہی وجہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی کے دور میں بھی ان میں سے کئی قومیں شاہ ولی اللہ کی اُس جماعت میں شامل ہوئیں جو احمد شاہ ابدالی کی دعوت پر مرہٹوں کی لوٹ ماراور حملوں کے خلاف صف آرا تھی۔اس طاقتور قوم کی دوسری شاخیں دہلی کے شمال مغرب،شمال مشرق،جنوب اور دوسرے علاقوں میں آباد تھیں،جس کی شمالی کڑی خاص طور پر صوبہ اتر پردیش کے موجودہ علی گڑھ تک پہنچی۔علی گڑھ کے علاقے میں جاٹ قوم کے راجاؤں کا ایک خاندان آباد تھا جس کا مذکورہ علاقے میں پورا دبدبہ تھا۔یہ خاندان میرے اس مقالے کی نامور شخصیت راجا مہندر پرتاپ کا خاندان تھا جو یہاں شان وشوکت کے ساتھ

زندگی بسر کر رہا تھا۔موجودہ علی گڑھ کے اسی علاقے میں پہلی بار ۱۸۷۷ء میں سرسید احمد خاں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی ۔یہ کالج بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ اس کالج کی تعمیر میں صرف مسلمانوں کا ہی حصہ تھا۔حالانکہ مذکورہ کالج کے ۱۲۰ معاونین میں ایک نمایاں تعداد غیر مسلم خاندان اوراس علاقے میں رہنے والے بااثر ہندوحضرات کی بھی تھی۔ ان ابتدائی معاونین میں چودھری شیر سنگھ، کنور لاکھراج، راجا شیونارائن سنگھ، لالہ پھول چند، واسدیو سہائے اورراجا مہندر پرتاپ کے والد راجا اودے پرتاپ سنگھ چند اہم نام ہیں ۔ راجا اودے پرتاپ سنگھ نے اپنے صاحبزادے راجا مہندر پرتاپ کوتعلیم کے لیے اسی کالج میں داخل کیا۔راجا مہندر پرتاپ کا نام بھی کالج کے ابتدائی اہم طالب علموں کی فہرست میں شامل ہے۔میں یہاں راجا صاحب کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ ذکرنہیں کروں گا کیوں کہ اس سلسلے میں مختلف دانشوروں کی بہت سی تحریروں میں بالواسطہ اور براہ راست ذکر کیا گیا ہے۔

ایسے حالات میں جب بہت سی ہندواحیا پرست جماعتیں بھی راجا مہندر پرتاپ کی سرگرمیاں کو مشکوک نظروں سے دیکھتی ہیں، اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں ان کی کاوشوں سے صرف نظر کر جاتی ہیں۔ ہمارے لیے راجا صاحب کا نام نہ صرف ایک ہندوستانی کی حیثیت سے قابل ذکر ہے بلکہ ایک افغان شہری کی حیثیت سے بھی کیونکہ وہ خود کہتے ہیں کہ:

> ’’میں ہمیشہ تمام خارجی اسفار کے لیے افغان حکمراں کا عطا کردہ افغانستان کا پاسپورٹ اورشہری شناختی کارڈ استعمال کرتا تھا۔اس لیے میں اپنے آپ کو افغان بھی کہہ سکتا ہوں۔‘‘

قابل ذکر ہے کہ راجا مہندر پرتاپ سے متعلق مذکورہ دستاویزات اوران کے حالات زندگی سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے والے دستاویزات اب ہندوستان کے نیشنل آرکائیوز کی طرف سے محققین کے لیے دستیاب ہیں۔ان دستاویزات میں ایک بڑا حصہ افغانستان اور افغان معاشرے سے متعلق ہے۔ان کا ایک رسالہ جسے انہوں نے چین میں تحریر کیا وہ ’’افغانستان: دلِ آریا‘‘ ہے، جو انگریزی زبان میں ہے، اور ان سے متعلق دستاویزات

کے حصے میں شامل ہے۔مذکورہ رسالہ چند سال قبل پروفیسر رحیمہ کے ذریعے پشتوزبان میں ترجمہ ہوکر اب تک دوبار شائع ہوچکا ہے۔راجا صاحب نے مذکورہ رسالے کی ابتدامیں ایک پُرلطف مگرمختصر پیش لفظ بھی تحریرکیاہے۔جس کی وجہ سے میں اس قابل ہواکہ راجا مہندر پرتاپ کی افغانستان اورافغانستان کے لوگوں سے بے انتہا محبت کا اچھی طرح احاطہ کرسکوں۔راجا صاحب کہتے ہیں کہ:

''افغانستان:خشکی سے گھرا ملک، ثمرداردرختوں سے بھراہوا، معدنی ذخائرسے مالامال پہاڑیاں، یہی افغانستان ہے ۔ زرخیز زمین، چنگاری کی طرح چمکتی ندیاں،ٹھنڈی اورصحت بخش آب وہوا، یہ تمام چیزیں افغانستان میں ہیں۔یہاں کے لوگ بہادر،توانا اورپرکشش ہیں، جومہمان نوازی کے لیے ہمہ وقت تیاررہتے ہیں۔ہرمعاملے میں ان پر اعتبارکیا جا سکتا ہے ۔ ہاں، یہ تمام خصوصیات افغانستان میں ہیں۔''

(راجامہندر پرتاپ،سروینٹ آف مینکائنڈ)

راجا صاحب کے دستاویزات میں افغانستان کی جدید تاریخ کے بہت سے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ان میں بہت سے واقعات ہمیں جدید تاریخ قلم بند کرنے میں خاص طورپرمعاون ہوسکتے ہیں۔راجا مہندر پرتاپ جن چاراہم افغان حکمرانوں کے ساتھ قریبی روابط رکھتے تھے وہ امیرحبیب اللہ خاں،غازی امان اللہ خاں،غازی نادرشاہ اور محمدظاہرشاہ تھے۔ وہ پہلی بار۱۹۱۵ء میں کابل آئے اور نامورمسلم سیاسی مدبرین،افغان الاصل مولانابرکت اللہ بھوپالی،مولانا عبیداللہ سندھی، ترکی اورجرمنی کے نمائندوں کے ساتھ کابل میں ہندوستان کی عبوری حکومت کے قیام سےمتعلق افغان امیر کے ساتھ گفت وشنید کی۔افغان امیر سےعبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں سردارنصراللہ خاں اور بہت سے دوسرے انگریز مخالف افرادکی مدد سے معاہد ہ کیا۔جس کے لیے ہندوستانی عوام آج تک افغانوں کےممنون ہیں، اور ہندوستان کی جدوجہدآزادی کے اسی آغازکوان دونوں ممالک کے درمیان تاریخی دوستی کی ابتداکے لیےسب سے اہم اور قابل قدرسنگ میل گردانا جاتا ہے۔

راجا صاحب کی یادداشتوں میں افغانستان میں قیام کے دوران ابتدائی

مہمان نوازیوں کا ذکر بھی ہے۔ اسی میں راجا صاحب کی امیر حبیب اللہ عرف امیر شہید کے ساتھ ملاقات کا ذکر بھی ہے جو ان کے بھائی کے محل (غالباً موجودہ افغان صدارتی محل) میں ہوئی تھی۔ جہاں راجا صاحب اور ان کے نمائندوں نے امیر شہید کے ساتھ بہت سے مسائل پر باتیں کیں۔جنھیں اختصار کے ساتھ قارئین کرام کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

راجا صاحب کی پہلی بات۔امیر حبیب اللہ خاں کے ساتھ ظہرانہ:

راجا صاحب لکھتے ہیں کہ''وہ ظہرانہ سردار نصراللہ خاں،جو امیر کے چھوٹے بھائی اور وزیراعظم تھے، کے ذریعے دیا گیا تھا۔یہ پہلی بار تھا کہ میں نے امیر کو ان کے بھائی کے گھر میں دیکھا تھا۔ بادشاہ اور ان کے اے ڈی سی(ADC) آئے۔ہم سب لوگ کھانے کی میز پر ایک ساتھ بیٹھے،بادشاہ درمیان میں تھے،میں ان کے دائیں طرف بیٹھا،اور ان کے بائیں طرف سردار نصراللہ خاں،مولانا برکت اللہ اور کاظم بیگ ،جو میرے دوست تھے، بیٹھے۔ہم سب لوگ مذکورہ ظہرانے کے لیے مدعو تھے۔کاظم بیگ نے ،مجھ سے مشورہ کیے بغیر،دفعتاً کہا کہ راجا کہتے ہیں کہ ہندوؤں پر لال اور پیلی پگڑی کی پابندی ختم کر دینی چاہیے ۔میرے لیے یہ بات باعث حیرت تھی۔ایک لمحے کے لیے میں اس قدر حواس باختہ ہوگیا کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔لیکن امیر نے دفعتاً کہا کہ یہ ناممکن ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ یہ ایک مذہبی سوال ہے،کیونکہ مسلم اجازت نہیں دیتے ہیں کہ غیر مسلموں کو السلام علیکم کہے۔ایسی صورت میں یہ ضروری ہے کہ ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ لال یا پیلی پگڑی پہنیں تا کہ مسلمان جان جائے کہ مذکورہ پگڑی والا شخص مسلم نہیں ہے۔امیر نے مزید کہا کہ ان کے والد صاحب کے زمانے میں اور بھی پابندیاں تھیں جنھیں اب ختم کر دی گئی ہیں،مثلاً مندروں کی تجدید،شہر میں گھوڑوں پر سواری اور اسی طرح اور بھی دوسری پابندیاں۔اس موقع پر میں نے کہا '' آنجناب نے مذکورہ پابندیاں ختم کی ہیں،ہوسکتا ہے کوئی اور بادشاہ آپ کے نقش قدم پر چلے اور اس طرح کی دوسری پابندیاں بھی ختم کر دے۔'' میں نے بہت روانی کے ساتھ اپنی باتوں کو جاری رکھا اور کاظم بیگ کی باتوں پر غور نہ کیا۔کپتان کاظم بیگ نے مذہبی مسائل پر پھر کچھ اظہار خیال کیا،لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہندوازم اور اسلام بنیادی طور پر ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔مثال کے طور پر ابراہیم نام پر غور کیجیے جو عبرانی زبان میں'' اَبراہام'' تھا۔جب اس

سے'' الف'' کو الگ کیاجائے گا تو'' براہم'' باقی رہتا ہے۔جو ہندو مذہب میں خدائے بزرگ کا نام ہے۔''میری ان باتوں نے امیر کو بہت متاثر کیا، اوروہ میرے استدلال سے خوش ہوئے۔میں نے اسی طرح اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ'' آدم'' لفظ کا کوئی خاص معنی نہیں ہے،لیکن '' آتما'' سنسکرت میں''روح اور نفس'' کے معنی میں ہے۔بائبل کے قصے کے مطابق ،جسے اسلام بھی مانتاہے، اللہ نے زمین یا مٹی سے پتلا بنایا اور پھر اپنی روح اس میں پھونکی ،اس لیے اس نفس کو'' آتما'' یا'' آدم'' یا''روح'' کہا جاتا ہے۔ میں نے اسی طرح بہت سے فارسی الفاظ جن کی ادائیگی ہندی اور سنسکرت میں ایک طرح ہوتی ہے بیان کیے مثلاً'' پدر''، ''پیترا''، ''مادر'' ،''ماترا''جن کی ادائیگی میں بہت حد تک مشابہت ہے۔

امیر نے پھر دونوں زبانوں میں مذکورہ یکسانیت اور قربت کی ستائش کی۔اسی موقع پر ایک افغان سردار نے مجھ سے کہا کہ امیر بودھ مذہب کی تعلیمات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ بودھ مذہب کی بہت سی کتابیں جو فارسی زبان میں ترجمہ ہوئی ہیں ان کے پاس موجود ہیں۔

راجا صاحب کی دوسری بات۔سردار عنایت اللہ خاں کی یاد:

راجا صاحب اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں کہ''ایک مرتبہ سردار عنایت اللہ خاں نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں اپنی کوئی تصویر پیش کروں۔میں نے ان سے عرض کیا کہ میں تو کوئی خوبصورت آدمی نہیں ہوں، پھر میری تصویر بھی ٹھیک نہیں بنتی ہے۔ساتھ ہی میں اتنا بیتاب بھی نہیں ہوں کہ کسی کو اپنی تصویر دوں۔میں نے ان سے کہا کہ میں اپنی تصویر کے بجائے اپنے خیالات آپ کو دوں گا۔شہزادہ عنایت اللہ خاں ہنسا اور پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میں انھیں اپنی تصویر پیش کروں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے فوٹوگرافر کو، جو ایک ہندو ہے، میرے پاس بھیجے گا،وہ میری تصویر عکس بند کرے گا اور میں اپنے خیالات بھی اس کے ساتھ بھیج دوں ۔ بہرحال میں نے اپنے خیالات ریشم کے ایک پیلے ٹکڑے پر لکھے اور پھر ایک روز اس ریشمی ٹکڑے کو انھیں تحفتاً پیش کر دیا۔ چند دنوں بعد، میں، کپتان کاظم بیگ اور مولانا برکت اللہ نے شہزادہ سے ملاقات کا ارادہ کیا۔دفعتاً کاظم بیگ نے سامنے والی دیوار پر کچھ دیکھ کر کہا'' راجا صاحب دیکھیے وہ ہیں آپ کے خیالات''۔ جب میں نے اپنے خیالات کو ایک خوبصورت اور بڑے فریم میں،جو کہ کلمہ کے فریم سے مشابہ تھا،اس دیوار پر دیکھا تو میں بہت جذباتی

ہوگیا۔واقعی وہ ایک آزادخیال شہزادہ تھا۔

ہندوستان میں جولوگ سوچتے ہیں کہ افغانستان کے باشندے متعصب اور قدامت پسندہوتے ہیں،انھیں مذکورہ واقعات سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ان یادوں کے سہارے، میں ہرلمحہ دل کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعا کرتا ہوں ۔ جب میں ہندوستان واپس آ گیاتو سنا کہ مذکورہ آزادخیال شہزادہ ۱۹۴۶ء میں ایران میں انتقال کرگیا۔‘‘

راجا صاحب کی تیسری بات۔ہندوستان کی آزادی اور افغانوں کی ناقابل فراموش خدمات

راجا صاحب تحریرکرتے ہیں کہ:

’’یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ امیرحبیب اللہ خاں انگریزوں کے حمایتی تھے۔ان کا بیشتر وقت حرم میں گزرتا تھا، اور دوسرے سنجیدہ مسائل کے لیے بہ مشکل ہی وقت نکال پاتے تھے۔وہ شاید اپنے عیش ونشاط کے لیے فکرمندرہتے تھے۔لیکن ان کے چھوٹے بھائی وزیراعظم سردار نصراللہ خاں انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔یہ وہی شخص تھے جنھوں نے مجھے اپنے دونمائندے کوزارِروس تک بھیجنے میں میرامالی تعاون کیاتھا۔یہ وہی شخص تھے جنھوں نے آفریدی قبائلی علاقے میں آفریدی فوج تیارکرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کیا تھا۔سردارنصراللہ خاں کی عظیم امداد کومیں یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے قاصرہوں جوانھوں نے ہمارے مقصد کے حصول کے لیے فراہم کیں۔‘‘

راجا صاحب کی تیسری بات ہندوستان کی آزادی میں افغانستان اور افغان عوام کے کردار پر مشتمل ہے۔اس موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی باتیں لکھی ہیں۔حالانکہ عہدحاضر کے ہندوستانی دانشوران ان حقائق کے تئیں شعوری یا معلومات کی کمی کے باعث بسااوقات آنکھیں بندکرلیتے ہیں۔یہ مضمون بہت سی معاصرتحریروں کے مابین محض ایک فروعی حیثیت سے معاصر تاریخ پر روشنی ڈال رہا ہے ۔کیونکہ بہت سے ہندوستانی اورغیرہندوستانی مصنفین کابل میں ہندوستان کی عبوری حکومت کو جرمنی ، ترکوں اور افغانوں کا محض ایک منصوبہ گردانتے ہیں جو انگریزوں کے خلاف شروع کر رکھا تھا ۔جو کچھ بھی راجا

صاحب نے اپنی کتاب (Afghanistan: The Heart of Aryan) میں تحریر کیا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بیشک اس مشن میں مذکورہ ممالک کا ہاتھ تھا۔

راجا صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ" ۱۹۱۵ء کے اگست کے مہینے میں ہم لوگ افغانستان میں داخل ہوئے۔صوبہ ہرات کے گورنر نے ہمارا بہت ہی گرم جوشی سے استقبال کیا۔اکتوبر کے مہینے میں ہمارے نمائندے کابل پہنچے۔وہاں ہم سے سرکاری مہمانوں کی طرح سلوک کیا گیا۔افغانستان اور جرمنی کے درمیان اگر کوئی سیاسی رشتے اور روابط تھے تو ان کی تمام تر ذمہ داریاں ہمارے وفد کے اراکین ڈاکٹر ہروان ہن تنگ (Hervon Henting)اور کپتان نیدرمایر (Neidermayer) کے کندھوں پر تھیں ۔ ہندوستان سے متعلق اگر کوئی کام اور ذمہ داری ہوتی تو وہ میری اور مولانا برکت اللہ کی ہوتی۔کپتان کاظم بیگ پھر ہمارے ترکی سے متعلق امور کے ذمہ دار تھے۔

شاہ حبیب اللہ جرمنی کے ساتھ اپنے ایک خفیہ معاہدے کوتسلیم کرتے ہیں ۔ میں نے بھی اس معاہدے پر ایک غیرجانب دار گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔اس معاہدے میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ جرمنی افغانستان کو اسلحہ دے گا۔ان اسلحوں کے افغانستان پہنچتے ہی افغان بادشاہ انگریزوں کے خلاف جہادکا اعلان کردے گا۔لیکن ان تمام کوششوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ انگریز اور روسی سامراج ایران میں بہت سے مشترک اقدامات کرنے کے ساتھ ہی ہم خیال ہوگئے۔ دونوں نے مشترکہ طور پر اس ملک کو اپنے زیراثر کرلیا۔اس عمل کے باعث افغانستان، ترک۔جرمن معاہدے سے الگ ہوگیا۔۔۔" (افغانستان: دلِ آریا، پشتو ترجمہ،ص ۲۲)

راجا صاحب کی بات، جیساکہ ابتدامیں امیر کی کارگزاریوں کے بارے میں بتائی گئی، درست تھی۔ لیکن بعدمیں، جیساکہ ظفرحسن ایبک نے بھی اپنی کتاب(آپ بیتی)میں اشارہ کیاہے کہ امیرنے یہ بات تسلیم کرلی تھی کہ جب جرمنی اور ترک فوجیں افغانستان کی سرحد تک پہنچ جائیں تب جہادکااعلان کیاجائے۔لیکن یہ منصوبہ روس،ایران اور انگریزوں کی سازش کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔امیرنے بھی اس سلسلے میں انگریزوں کوبہت کچھ درپردہ بتادیا تھا، اس لیے ان کے رشتے انگریزوں سے خراب نہیں ہوئے۔ایک طرف امیر مذکورہ معاہدے سے باہر آگئے، اوردوسری طرف انگریزوں کے ساتھ اپنے تعلقات بھی استواررکھے۔یہ ان کی بہت

بڑی ہوشیاری تھی۔ وہ بھی ایسے وقت میں جب ان کے بارے میں لوگوں کی یہ رائے تھی کہ وہ اپنے حرم میں ہی مصروف رہتے تھے۔انھوں نے ایسے حساس موقع پر اپنے آپ کو متحرک کیا اور افغانستان کو واضح طور پر ایک غیر جانب دار ملک کی حیثیت سے پیش کر کے بچالیا۔

راجا صاحب اپنی تیسری بات میں ان تمام بے حسی اور لاپرواہیوں کا جواب دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ افغانستان نے بلاشبہ'' آزاد ہند حکومت'' کے منصوبے میں دل سے حصہ لیا ہے۔اور بیسویں صدی کی ابتدا میں افغانوں کے تعاون کی وجہ سے ہی ہندوستان کی مختلف مشہور و معروف شخصیتوں مہاتما گاندھی، سبھاش چندر بوس، بادشاہ خان اوردوسرو ں کی کاوشیں اور سرگرمیاں ثمر آور ہوئیں ۔ راجا صاحب آزاد ہند حکومت کے سلسلے میں مذکورہ تاریخی تعاون پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

> ''۔۔۔ آزاد ہند کی عبوری حکومت کے قیام میں جن دولوگوں نے افغانستان میں بہت سرگرم کردار ادا کیا ان میں سے ایک سردار نصراللہ خاں اور دوسرے مولوی عبدالرزاق اندَ ڑ ہیں۔مولوی عبدالرزاق اندڑ نے ہندوستان میں مذہبی تعلیم حاصل کی تھی اور ہندوستانی حلقوں میں ایک معروف خطیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ان کے والد کا اپنے وقت کے معروف عالموں میں شمار ہوتا تھا، اور امیر عبدالرحمٰن خان کے زمانے میں دربار سے ان کا میل جول ہوگیا تھا، کیوں کہ عبدالرحمٰن خان ملا مشک عالم کے خلاف تھے۔بعد میں ان کے صاحبزادے نے امیر حبیب الرحمٰن کے عہد (عہدِ حبیبیہ) میں دربار سے قریبی رشتے قائم کر لیے تھے، اور جن کی باتو ں پر سردار نصراللہ خاں بہت توجہ دیتے تھے۔سردار نصراللہ خاں انگریز مخالف جذبہ رکھتے تھے۔ اس کے عوامل کچھ بھی ہوں، بہرحال اس سلسلے میں بہت سی باتیں ہیں۔ لندن سے ان پر تنقید اور ا ن کے معاشرے پر انگریزوں کا اثر ونفوذ، ایک وجہ ہوسکتی ہے ۔صرف یہی وجہ نہیں ہوسکتی ہے کہ وہ'' آزاد ہند حکومت'' کی مدد کا علم اعلانیہ طور پر اٹھالے۔ بلکہ ایسے افراد جو انگریزوں کے خلاف

تھے، مثلاً ڈاکٹر غنی اور دوسرے لوگوں کوتحریک بھی دی کہ وہ افغانستان آئیں اور بالواسطہ طور پر ایسی تحریک کوتقویت پہنچائیں جو انگریزوں کے خلاف تھی۔تا کہ یہ تحریک اپنے علاقے اور افغانستان میں مزید فعال ومتحرک ہو۔''

راجا صاحب سردارنصراللہ خاں کی براہ راست رہنمائی اور آزاد ہند عبوری حکومت کے لیے بھرپور تعاون کو قابل ذکر گردانتے ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سردارنصراللہ خاں نے افغانستان میں آزاد ہندتحریک کو نہ صرف اپنے دم پر سرحد اور آس پاس کے علاقے میں متحرک رکھا بلکہ ان کے اس جذبے کا اثر نہ صرف افغانستان کے اندرتھا بلکہ اس تحریک کے بہت سے نمائندے کوروس کی زارحکومت تک بھی بھیجا۔ ظفرحسن ایبک کی آپ بیتی میں جو باتیں راجا صاحب کے خلاف کہی گئیں ہیں ان سے ایسا لگتاہے کہ غالباً راجا صاحب کا مقصد برصغیرہند میں ایک ہندوحکومت کا قیام عمل میں لانا تھا،وہ پوری طرح بے بنیاد ہے۔ راجا صاحب کی کسی کتاب،دستاویز یاکسی تحریر سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔اس بات میں اگرکوئی صداقت ہوتی کہ وہ ایک ہندوحکومت کا قیام چاہتے تو پھر موجودہ دورمیں ہندواحیاپسند ان کے نام پرچراغ پانہ ہوتے اورنہ ان کے خلاف نعرے لگاتے، اور نہ ہی ان کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات پر بند کا اعلان کرتے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ راجا صاحب کا پیغام بہت وسیع اور انسان دوستی کا تھا۔اور ایک وسیع انسانی دائرے میں انھوں نے افغانستان کی مسلم حکومت اور بادشاہ کی مدد سے '' آزادہندحکومت'' کے پیغام کو بلند کیا۔ان نکات کو راجا صاحب نے اپنی تحریروں میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔اس مقالے کے خوشگواراختتام کے لیے میں یہاں راجا صاحب کی یادداشت سے ہی ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:

''میں چاہتا ہوں کہ ان امداد کے بارے میں کچھ کہوں جو خانہ آباد کے حاکم نے میرے ساتھ کیں۔سال ۱۹۱۷ء میں اس وقت جب میں خانہ آبادمیں تھا۔میں نے حاکم سے پوچھا کہ کیاکوئی صورت ہوسکتی ہے کہ میں اپنے خطوط ہندوستان کے شاہزادوں کو، اورساتھ ہی ایک اہم خط شاہِ نیپال کوجس پراس کے اور جرمنی کے وزیراعظم کے دستخط ہیں، ارسال کروں؟ اگر یہ خطوط ان لوگوں تک پہنچ جائیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔حاکم نے کچھ تامل کے بعد یہ تجویز

رکھی کہ وہ ایسے وسائل تلاش کرے گا جن کے ذریعے یہ خطوط افغانستان سے باہر بھیجے جا سکیں۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں وہ امیر کونہیں بتائیں گے لیکن ایک خفیہ خط وہ سردارنصراللہ خاں کو بھیجے گا۔میرے لیے سوال یہ تھا کہ آیا ان خطوط کے جواب کا میں انتظارکروں؟لیکن حاکم نے جواب دیا کہ نہیں، تاہم وہ جلد ازجلد کوشش کریں گے۔انھوں نے بہت مہربانی کرتے ہوئے دوگھوڑے،ایک پاسپورٹ اور ایک گائڈ فراہم کیے۔میرے دوستوں میں سے گوجرسنگھ ،جوبعد میں اودھم سنگھ کے نام سے مشہورہوئے ، اس خط کو لے کر خانہ آبا د میں اَسمار کے مقام پر مجاہدین تک پہنچے۔اس جگہ سے بہار کے ایک مسلم گائڈ کے ساتھ نیپال تک پہنچے۔اور باقی دوسرے خطوط ہندوستان کے مختلف شہروں تک ہندوستانی سرداروں کے پتے پر بھیجے گئے۔تین سال بعد میں نے سنا کہ مذکورہ شخص نے اپنی ذمہ داری اداکردی تھی۔لیکن بدقسمتی سے وہ شخص افغانستان واپسی کے دوران انگریزوں کے ذریعے گرفتارکرلیا گیا۔ہمارے ہندوستانی دوستوں کومعلوم ہوناچاہیے کہ افغانستان میں ہندوستان کی آزادی کے لیے بہت قوی جذبات تھے۔شاہ امان اللہ خاں دل کی گہرائیوں سے ایسا چاہتے تھے، اور ایک بارتوانھوں نے برملا اظہارکیا کہ جب تک ہندوستان آزادنہیں ہوگا اس وقت تک افغانستان بھی حقیقی طور پر آزادنہیں سمجھا جائے گا۔صرف مٹھی بھرایسے افغان ہیں جوانگریزوں کے فائدے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔لیکن میں بہت واضح طورپر کہوں گا کہ افغان بحیثیت قوم انگریزوں کے حمایتی نہیں ہیں۔“

(پشتو سے ترجمہ:ڈاکٹرمحمدحیات الدین)

☆☆☆

ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی

مولانا سید عبد الغنی استھانویؒ

مولانا سید عبد الغنی وارثی استھانوی بہار کے ممتاز اہل علم وفضل اور کثیر التصانیف بزرگوں میں ہیں ، بقول مولانا سید ریاست علی ندوی جن بزرگوں نے صوبہ بہار میں علم وادب کا چراغ روشن کیا ان میں ان کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے(۱)۔ اپنے دور میں ملک میں ان کی شخصیت معروف تھی، اور ممتاز اہل علم سے ان کے مراسم تھے۔لیکن اس کے بعد ان کی شخصیت پر گمنامی کی تہیں جم گئیں ، اس دوران خود ان کے صوبہ میں ان پر کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔۲۰۱۸ء میں ان کی وفات پر ایک صدی گذر گئی، یہ مضمون اسی مناسبت سے قارئین کے پیش خدمت ہے کہ شاید اس سے ان کی صدی تقریب کا کچھ حق ادا ہوسکے ،اور صوبہ کے اس عظیم سپوت کا تعارف ہوسکے۔

مولانا وارثی کے جد اعلیٰ بہار کے علاقہ بارہ گاواں کی ایک بستی اکساری کے باشندے تھے، جہاں سے وہ استھانواں (بہارشریف) منتقل ہوگئے تھے،مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا وارثی کے سلسلۂ نسب کی چندکڑیاں اس طرح ذکر کی ہیں: مولانا سید عبد الغنی بن سید واجد علی بن سید فرزند علی بن سید کرم علی(۲)۔

۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں اپنے وطن استھانواں میں مولانا کی پیدائش ہوئی، والدہ ماجدہ بہارشریف کے قریب ایک گاؤں ''سیدی'' کے میر رحیم بخش کی صاحبزادی تھیں۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہوئی ،اس کے بعد ان کے چچا مولوی مسیح اللہ صاحب وکیل ان کو اپنے ساتھ بہارشریف لے کر چلے گئے ،''وہ جملہ امور کے متکفل ہوگئے، ان کے ظل عاطفت اور پدرانہ ومادرانہ شفقت میں بہار دانش، سکندر نامہ تک فارسی، اور ہدایۃ النحو تک عربی بہارشریف ہی میں پڑھی''(۳)۔

اس کے بعد باقاعدہ عربی تعلیم کا مرحلہ شروع ہوا اور مولوی مسیح اللہ صاحب کے برادر نسبتی مولوی تفضّل حسین صاحب ، جو بہار شریف کے مشہور عالم وطبیب تھے، کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، مولوی صاحب نے نسبت وقرابت کی بنا پر ان پر خصوصی توجہ دی لیکن چند دنوں کے بعدانہیں گیا جانا پڑا،مولانا وارثی ان کے درس سے مانوس ہوچکے تھے اس لئے ان سے استفادہ کے لئے ان کی خدمت میں گیا حاضر ہوگئے، شراب علم کی لذت نے وسائل سفر کے فقدان اور مشقتوں کے باوجود انہیں پاپیادہ ہی چلنے پر مجبور کیا اور وہ سفر جو آج چند گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے دو دنوں میں مکمل ہوا، اس کے متعلق مولانا خود لکھتے ہیں: ''مولوی تفضّل حسین صاحب، صاحب گنج (گیا) تشریف لے گئے تو میں بھی بہ اجازت عم محترم وہاں پہنچا''(۴)۔

وہاں کچھ ہی دن گذرے تھے کہ مشفق وکریم چچا کے لئے جدائی ناقابل برداشت ہوگئی اور انہوں نے بہار شریف واپس بلالیا، بہار شریف میں اس وقت مولوی ناظر حسین صاحب کی مسند درس محلّہ میرداد میں آراستہ تھی، مولانا وارثی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ، لیکن اسباق ناغہ ہونے کی بنا پر یہاں بھی آپ کی طبیعت نہ لگی، بالآخر شوق علم نے پھر آپ کو راہ نوردی پر مجبور کیا، اور سابقہ درسگاہ سے خاموشی سے روانہ ہوکر پیادہ پا چار دن میں آرہ پہنچے، یہ وہ دور تھا جب شہر آرہ میں علم وفن کے مختلف چشمہائے فیض جاری تھے اور تشنگان علم آ آکر سیراب ہورہے تھے، اساتذۂ فن کی مجلسیں قائم تھیں اور ارباب علم کی محفلیں آسمان علم کی رونق کو دوبالا کررہی تھیں، یہاں انہوں نے جلیل القدر علماء سے فیض حاصل کیا، یہاں سے ان کی علمی زندگی کو ایک نئی غذا اور قوت فراہم ہوئی، سمند شوق کو تازیانہ لگا اور تشنگی علم میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا،علم ومطالعہ کا شوق پیدا ہوا،ایک جگہ لکھتے ہیں: ''اس وقت سے آئندہ بغیر مطالعہ اور پورے طور پر سمجھے بغیر نہ پڑھتا تھا''۔

حصول درس کے ساتھ قدیم طرز تعلیم کے مطابق تدریس کا مشغلہ بھی جاری رہا، ان کے الفاظ ہیں: ''پچھلی کتابوں کو بذریعہ مطالعہ اور تدریس صاف کرنے کا مصمم ارادہ ہوا اور اسی زمانہ میں نیچے کی کل کتابیں شرح جامی وشرح تہذیب تک کرات ومرات پڑھائیں'' (۵)۔

آرہ سے وہ اپنے ایک ہم وطن نامور عالم مولانا سید وحید الحق استھانویؒ کی خدمت

میں پٹنہ آ گئے، جہاں مولانا مرحوم ملازمت کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور ان سے دیگر علوم وفنون کے ساتھ عربی ادب کا خصوصی طور پر درس لیا، مولانا سید وحید الحق استھانوی اپنے شاگرد رشید کے بقول عربی ادب میں اچھی مہارت رکھتے تھے،مولانا عربی ادب کی تدریس میں ان کے منفرد طریقۂ تدریس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''مولوی وحید الحق صاحب مرحوم نے علاوہ معمولی درسی کتابوں کے عربی ادب کا مختلف طور پر سبق دینا آغاز کیا''(۶)۔ پھر جب مولانا وحید الحق صاحب نے پٹنہ چھوڑ کر مختلف مقامات کا سفر کیا تو شاگرد رشید اپنے استاذ کے رفیق سفر رہے، اور ان سے استفادہ کا کوئی موقعہ فروگذاشت نہ ہونے دیا، صاحب سوانح کے الفاظ میں: ''سالہاسال تک مختلف مقامات یعنی پٹنہ کے سوانگر نہسہ، آرہ وغیرہ میں برابر ان کے ساتھ رہا''۔(۷) اس کے بعد وہ پٹنہ چلے آئے(۸)۔ پٹنہ میں ان کی کیا مشغولیت رہی اس کا علم نہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انہیں آرہ کے مدرسہ کا فارغ التحصیل بتایا ہے(۹)، مولانا گیلانی کا مفصل مضمون جو خود صاحب سوانح کی ذاتی یادداشت کی روشنی میں لکھا گیا ہے، یہاں آ کر ختم ہوجاتا ہے،اس لئے کچھ کہنا مشکل ہے۔

عربی تعلیم کی تحصیل وتکمیل کے بعد انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا کر انگریزی کی تعلیم حاصل کی، علی گڑھ کی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے پٹنہ تشریف لا کر اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا، سید بدر الدین بدر اپنی کتاب ''حقیقت بھی کہانی بھی'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: '' اسکول (مدرسۃ العلوم علی گڈھ) کی تعلیم ختم کر کے یہ پٹنہ آئے اور صدر گلی میں مقیم ہوئے، صدر گلی میں ان کا قیام میرے والد مرحوم خان بہادر مرحوم سید ضمیر الدین احمد کی دوستی کے سبب تھا، اس حلقہ کی علمی وادبی صحبتیں اس وقت نصف النہار پر تھیں، بہت سے صاحبان کمال سمٹ کر اس حلقہ میں آ گئے تھے، سچ پوچھئے تو مولوی عبد الغنی وارثی کے جوہر ان ہی صحبتوں میں نمایاں ہونے لگے'' (۱۰)۔

مولانا عبد الغنی وارثی نے اپنی علمی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا، سب سے پہلے انہوں نے پٹنہ میں بابو بشیر سنگھ کے جاری کردہ اخبار ''اردو کرانیکل'' کی ادارت کے فرائض انجام دئے، اس دوران آپ کے مضامین آپ کے ہم وطن مولانا سید رحیم الدین کی ادارت میں نکلنے

والے ہفتہ وار اخبار ''الپنچ'' میں بھی نکلتے رہے بلکہ بعض حیثیتوں سے وہ اس کے بانیوں میں ہیں(۱۱)۔ سید بدر الدین ''حقیقت بھی کہانی بھی'' میں لکھتے ہیں: ''جو زمانہ انڈین کرانیکل کے شباب کا تھا ان ہی دنوں اس کے ایڈیٹر مولوی عبد الغنی وارثی تھے اور پھر مولوی سید رحیم الدین رہے، مولوی عبد الغنی وارثی استھانواں کے رہنے والے تھے'' (۱۲)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''کچھ دنوں کے بعد جب بابو بشیر سنگھ نے پٹنہ سے اخبار ''اردو کرانیکل'' نکالا تو مولوی عبد الغنی وارثی اس اخبار کی ادارت کا فرض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، ۱۸۵۵ء میں مولوی رحیم الدین مرحوم نے اخبار ''الپنچ'' نکالا تو یہ اس کے بھی ایک ممتاز قلمی معاون رہے، ان ہی دنوں اودھ پنچ اور اودھ اخبارات میں بھی مولوی عبد الغنی وارثی کے مضامین بڑے آب وتاب سے نکلتے تھے، حیدرآباد جو اس وقت اردو زبان میں مرکزیت کا درجہ حاصل کر چکا تھا، وہاں کے اخبارات، پرچوں اور رسائل میں بھی مولوی عبد الغنی وارثی کے مضامین کو اہمیت دی جانے لگی'' (۱۳)۔

جب مولانا نے اپنے مضامین کے ذریعہ جو ملک کے موقر اخبارات میں شائع ہو رہے تھے، شہرت حاصل کی، خصوصاً حیدرآباد جیسے مرکز علم وفن میں ان کی نگارشات مرکز توجہ بننے لگیں تو اس جوہر قابل کو اسی شہر نگاراں نے اپنی آغوش میں لے لیا، سید بدر الدین بدر لکھتے ہیں: ''کچھ ہی دنوں بعد اپنی صلاحیت کی بدولت مولوی عبد الغنی کو حکومت حیدرآباد سے جب مترجم کے عہدے کی پیشکش آئی تو اس کو قبول کر کے مستقلاً حیدرآباد چلے گئے، اور آخر رفتہ رفتہ اسسٹنٹ اکاؤنٹ جنرل حیدرآباد ہوئے''۔

حیدرآباد کی علمی وادبی فضا میں وہ جلد ہی اہل علم کے درمیان اپنی بلند پایہ علمی شخصیت کی بنا پر متعارف ہوئے اور ارباب ذوق کی بزم علمی کے رکن رکین بن گئے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی: ''وہ اس بزم کے ممبر تھے جس کے صدر نشین علامہ شبلی، مولوی عبد الحلیم شرر، اور مولوی عزیز مرزا مرحوم تھے''(۱۴)۔

مولانا عبد الغنی وارثی کی حیدرآباد کی مدت قیام تیس سال ہے، اس دوران ان کے قلم سے متعدد کتابوں کے تراجم نیز مستقل تصانیف منصۂ شہود پر آئیں۔اس طویل مدت

ملازمت کے بعد پنشن پا کر جب وہ خانہ نشین ہوئے تو اپنے مجوزہ علمی منصوبہ کی تکمیل میں پوری توجہ کے ساتھ منہمک ہوگئے، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور خانہ نشینی کے چند ہی مہینوں کے بعد وطن میں ۱۰/ جون ۱۹۱۸ء کو درد سینہ سے وفات پائی(۱۵)۔اور اپنے وطن ہی میں پیوند خاک ہوئے، وفات کے وقت ۶۲ سال عمر تھی(۱۶)۔

مولانا سید عبد الغنی وارثی کی تحریری کاوشوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: پہلا دور شہر عظیم آباد میں ان کی اخبار نویسی کا ہے، اس دوران ان کے مضامین شہر عظیم کے آباد کے جرائد ومجلّات میں خصوصاً اور پورے ملک کے مؤقر اخبارات ورسائل میں عام طور پر شائع ہوئے لیکن مولانا نے بعد میں ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی، اور اس طرح وہ فائلوں میں گم ہوکر ضائع ہوگئے۔

ان کی علمی خدمات کا دوسرا دور حیدرآباد کے قیام سے شروع ہوتا ہے، جب وہ وہاں بحیثیت مترجم تشریف لے گئے ،اسی لئے اس دور کی زیادہ تر کتابیں تراجم پر مشتمل ہیں، مقالات وتراجم کے علاوہ آپ کی اب تک راقم کو صرف ایک ہی باضابطہ تصنیف کا علم ہوسکا ہے۔

مولانا عبد الغنی وارثی کی یہ سب سے مشہور کتاب ''بوذاسف وبلوہر'' کا اردو ترجمہ ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں: ''(یہ کتاب) اصل میں ایک ہندی قصہ اور بدھ کی زندگی اور تعلیم کا خلاصہ ہے، مسلمانوں کے عہد عروج میں اس کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا، پھر کلیلہ دمنہ کی طرح وہ عربی سے دنیا کی اکثر زبانوں میں منتقل ہوا، مولوی صاحب مرحوم عربی سے اردو میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کر کے ہندوستان کی کھوئی ہوئی دولت کو پھر ہندوستان واپس لائے، یہ قصہ پراثر اور ہندی تمثیلات سے اس قدر مملو ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا موجودہ انجیل اسی سے ماخوذ ہے'' (۱۷)۔

ایک تبصرہ نگار کے بقول: ''اس کتاب کی تحریر بہت سادہ وصاف اور بامحاورہ ہے'' (۱۸)۔

اس کے علاوہ عربی میں اخلاق کی ایک اور چھوٹی سی کتاب ہندوشاہ (ابوالفرج ابن ہندوعہد عباسی کا مشہور مترجم) کی ''الکلم الروحانیہ فی الحکم الیونانیہ'' کو بھی اپنی زبان میں منتقل کیا، امام شعرانی کی ایک مستند ضخیم کتاب عربی میں ہے، اس کا بھی ''نعمت عظمیٰ'' کے نام سے

اردو میں ترجمہ کیا(۱۹)۔

عربی کی الف لیلہ اور ابن شداد کی سیرت صلاح الدین (النوادر السلطانیہ) کا ترجمہ بھی انہوں نے بعض امرائے دکن کی فرمائش پر کیا تھا، لیکن ان دونوں ترجموں کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ آیا وہ بعد میں شائع ہوئے یا نہیں (۲۰)۔

انگریزی سے اردو میں ''مسلمانان اندلس'' کے نام سے ''اسٹینلی لین پول'' کی کتاب (مورس ان اسپین) کا بھی ترجمہ کیا، ترجمہ کی تکمیل کے بعد مصنف نے اس کو ماہنامہ ''الناظر''، لکھنؤ میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا، اس کی قسط وار اشاعت کے دوران ہی مترجم نے اس دار فانی سے رحلت فرمائی جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے، اور یہ ترجمہ مستقل کتابی صورت میں مترجم کی نظر سے نہیں گذر سکا، بلکہ ان کی وفات کے بعد الناظر پریس لکھنؤ سے ۱۹۱۹ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا، اس ترجمہ کی خصوصیت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بقول یہ ہے کہ انگریزی سے ترجمہ کرنے کے باوجود عربی ناموں کی صحت کا مترجم نے پورا خیال رکھا ہے (۲۱)۔ انگریز مستشرقین کی کتابوں میں عربی اسماء کے غلط تلفظ کا عام رواج ہے، ان کتابوں کے اردو مترجمین مصنفین کی تقلید میں وہی غلط تلفظ نقل کر دیتے ہیں، جس کی بنیادی وجہ عربی زبان سے عدم واقفیت اور تاریخ سے لاعلمی ہوتی ہے، یہ مولانا وارثی کا امتیاز بھی ہے اور ان کے وسعت علم اور وفور مطالعہ کی دلیل بھی کہ ترجمہ کرتے وقت انہوں نے انگریزی مصنف کی تقلید کے بجائے عربی زبان میں معروف صحیح اسماء کا ذکر کئے ہیں۔ ترجمہ قانون لگان بھی ان کا بہت اہم کام ہے جس کا ذکر ڈاکٹر مظفر اقبال نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو نثر کا ارتقاء'' میں کیا ہے (۲۲)۔

تنقیح حقوق نسواں: یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو جناب سید ممتاز علی صاحب کی کتاب ''حقوق نسواں'' کا جواب ہے، مصنف کتاب نے قرآن وسنت کی غلط تشریح کرتے ہوئے اسلام میں خواتین کو آزادی نہ دئے جانے پر اعتراض کیا ہے، مولانا وارثی نے مصنف کے ہر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان کے غلط خیال کی تردید کی ہے، یہ کتاب مطبع اردو بازار امرتسر سے شائع ہوئی۔

حیات رضا کے نام سے سرسید کے ایک نامور اور روشن خیال رفیق رضا حسین عظیم آبادی کی سوانح حیات بھی مولانا کے قلم کی یادگار ہے، مصنف کتاب کے صاحب سوانح سے بزرگانہ مراسم اور صحبتیں تھیں، مصنف کی انگریزی تعلیم انہیں کی تحریک کا نتیجہ تھی، مصنف نے اس کتاب کا آغاز وظیفہ یاب ہوکر وطن میں خانہ نشیں ہونے کے بعد کیا تھا اور ابھی کچھ ہی حصہ لکھ پائے تھے کہ وفات پائی، ان کی وفات کے بعد مصنف کے فرزند جناب سید محی الدین استھانوی کی تحریک اور درخواست پر مصنف کے رفیق قدیم جناب محبّ الحق عظیم آبادی نے اس کی تکمیل کی اور سید محی الدین الدین فرزند مصنف کے مقدمہ سے آراستہ ہوکر جناب مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کی زیرنگرانی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔لیکن اس کتاب میں ایک کمی نظر آتی ہے کہ محبّ الحق عظیم آبادی کے اضافہ اور مصنف کی اصل تحریر میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کون سی تحریر اصل مصنف کی ہے اور کہاں سے اضافہ ہے۔ڈاکٹر عبدالواسع نے اس کتاب کے بارے میں درست لکھا ہے کہ:"اس کی تصنیف کی داد کسے دی جائے ،سید عبدالغنی کو یا سید محبّ الحق عظیم آبادی کو اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کیوں کہ اس کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ کتنا حصہ سید عبدالغنی صاحب نے تحریر کیا اور کتنا محبّ الحق عظیم آبادی نے"(۲۳)۔

مولانا عبدالغنی وارثی نے دیوہ (بارہ بنکی) کے مشہور بزرگ حضرت حاجی شاہ وارث علی دیوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جب وہ ان کے وطن کے قریب ایک گاؤں بیلچھی تشریف لائے تھے،حاجی صاحب کی سوانح مشکاۃ حقانیہ میں جا بجا ان کا ذکر موجود ہے،اور انہیں کی نسبت سے وہ اپنے نام کے ساتھ وارثی لکھتے تھے۔

حوالے:

(۱)مشاہیر بہار شائع کردہ خدابخش لائبریری پٹنہ۲۰۰۱ جلد دوم مضمون"اوراق پارینہ"
(۲)**مضامین گیلانی** مضمون مولانا عبدالغنی وارثی شائع کردہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ
(۳)حوالہ سابق
(۴)حوالہ سابق

(۵) حوالہ سابق

(۶) حوالہ سابق

(۷) حوالہ سابق

(۸) حوالہ سابق

(۹) یادرفتگاں ص ۳۸

(۱۰) حقیقت بھی کہانی بھی، ص: ۴۸۹ مطبوعہ بہار اردو اکیڈمی

(۱۱) مشاہیر بہار شائع کردہ خدابخش لائبریری پٹنہ ۲۰۰۱ جلد دوم مضمون ''اوراق پارینہ''

(۱۲) حوالۂ بالا ص: ۴۵۷ (۱۳) حقیقت بھی کہانی بھی ص: ۴۹۰

(۱۴) یادرفتگاں ص ۳۸ (۱۵) حقیقت بھی کہانی بھی ص: ۴۹۰

(۱۶) یاد رفتگاں ص: ۳۸

(۱۷) یاد رفتگاں، ص ۳۹

(۱۸) مجلّہ صدی تقریبات مدرسہ منیر الاسلام بہار شریف، مطبوعہ ۲۰۰۴ء مضمون '' بہار شریف کی چند علمی شخصیتیں'' از پروفیسر مطیع الرحمٰن گوہر، ص: ۳۵۴۔

(۱۹) یادرفتگاں، ص ۳۹

(۲۰) حوالہ سابق

(۲۱) حوالہ سابق

(۲۲) بہار میں اردو نثر کا ارتقا، از مظفر اقبال مطبوعہ پٹنہ،

(۲۳) بہار میں اردو سوانح نگاری کا آغاز وارتقاء، ص ۴۷۔

☆☆☆

سید حامد: ایک خودنوشت

سید حامد سے پروفیسر نجمہ محمود کے چند انٹرویوز پر مبنی

پیشکش: ش

پروفیسر نجمہ محمود

پیش گفتار

اقبالؔ کے نزدیک صحیح زندگی وہی ہے جس میں صدق وصفا ہو۔ ایک ایسی ہستی کی زندگی کی حکایت بیان کرنا جس میں ''آفاق گم ہوں'' آسان کام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میں نے اس ہستی سے درخواست کی کہ وہ ماضی کے نہاں خانوں میں جھانک کر یادوں کو گرفت میں لائیں کہ ہم خود اپنی ہی یاد ہیں تاکہ وہ انتہائی مشکل کام کچھ آسان ہو سکے جس کا بیڑا اس ناچیز نے اٹھالیا تھا۔ یعنی سید حامد کی زندگی کے سفر کو قلمبند کرنے کا۔ اتنا مشکل کام جب شروع ہو چکا تو اسے مکمل کرنا ایک فرض منصبی محسوس ہونے لگا۔ قدم قدم پر روڑے، چٹانیں، کھائیاں : اور میں دم سادھے، سانسیں روکے، پیشانی پسینہ میں تربتر! تخلیقی تحقیق میں یوں ہی ہوا کرتا ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ اپنی کم مائیگی بہر حال کام آئی، شے کی حقیقت کو سمجھنے کی جستجو! یہ جستجو بچپن سے ہی ساتھ رہی تھی : ''تلاش حق'' ۔ کام بے حد مشکل تھا۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے وقت میں اتنی فکر مند کبھی نہیں ہوئی۔ اتنی دقتوں کا سامنا مجھے کبھی نہیں کرنا پڑا۔ نہ ہی اپنی کم مائیگی کا اتنا شدید احساس کبھی ہوا۔ بہر حال ارادہ کیا، فیصلہ کیا، تہیہ کیا، کام شروع ہوا۔ راہ کی مشکلات جب بھی کچھ کم ہوتی نظر آئیں تو چند اور مشکلات در پیش ہو گئیں۔ اس سلسلہ میں میں سید حامد کی شکر گزار ہوں۔ سید حامد: **کہ گم اس میں ہیں آفاق**، ایک مختصر نام، جو ایک بھی ہے اور ہزار بھی: ایک شاعر، ایک ادیب، ایک قائد، ایک مدبر، ایک مصلح۔ آیئے ان کی حکایت ان کی ہی زبانی سنیں:

(نجمہ محمود)

O

بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے آباء و اجداد **عظیم آباد** سے مرادآباد آئے اور یہیں کے ہورہے۔ کہا جاتا ہے کہ عظیم آباد، پٹنہ کے قریب ایک قصبہ نیورہ ہے وہیں سے ہمارے پر دادا سید محبّ علی صاحب مرحوم انیسویں صدی کے وسط کے قریب *مرادآباد* منتقل ہوئے۔ راوی یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اپنے والد مرحوم (سید امیر علی صاحب) کی کسی بات سے خفا ہوکر چلے آئے۔ سرکشی کی تو نہیں لیکن بات یا اصول کی خاطر سب کچھ داؤں پر لگادینے کا یہ انداز وقفوں کے ساتھ ان کی اولاد کے پیچھے لگارہا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ جس وقت سید محبّ علی گھر چھوڑ رہے تھے ان کے دادا سید یار علی مرحوم بقید حیات تھے یا نہیں۔ قرائن یہی کہتے ہیں کہ اگر دادا زندہ ہوتے تو وہ پوتے کو ہرگز نہ جانے دیتے۔

یہ بات اس زمانہ میں عام تھی کہ ایک ہی خاندان میں شیعہ، سنی دونوں ہوتے تھے۔ مشہور امام بھائی (سرعلی امام وحسن امام مرحومین) اور ہمارے آباء و اجداد ایک ہی خاندان کے بطّور تھے۔ پر دادا مرحوم نے سرکاری ملازمت کی۔ ایک عرصہ تک صوبجات متحدہ بلکہ شمالی مغربی صوبہ میں ڈپٹی کلکٹر رہے ۔ ان سے حلم، تقویٰ اور راست کرداری منسوب کی جاتی تھی۔ ہمارے دادا سید محمد صدیق مرحوم بہ سلسلہ ملازمت جے پور چلے گئے اور وہاں فوج میں بہ حیثیت رسالدار خدمات انجام دیں۔ ان کی وجاہت اور کشیدہ قامتی خاندان کی روایتوں میں محفوظ ہے۔

ہمارے دادا سید محمد صدیق کے تین فرزند تھے۔ سید مہدی حسن، سید ہادی حسن، سید ہدایت حسین (مرحومین)۔ سید ہادی حسن جوانمرگ ہوئے۔ سید ہدایت حسین زمینداری دیکھتے تھے۔ سید مہدی حسن نے قرآن پاک حفظ کیا، انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ فارسی اردو اور تاریخ میں انہیں خاص دلچسپی تھی۔ ملازمت کا آغاز سب انسپکٹر پولس کی حیثیت سے کیا۔ ان کی پہلی شادی سید حسن مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی مولوی حمایت اللہ مرحوم کی صاحبزادی ستارہ شاہجہاں بیگم (مرحومہ) کے ساتھ کی۔ ان سے پانچ بچے

ہوئے۔ فاطمہ خاتون، سید محمد، سید مصطفیٰ، رقیہ خاتون، سید حامد۔ تینوں لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۲ء تک تینوں بھائیوں میں سے ایک نہ ایک یونیورسٹی میں تھا۔ ستارہ شاہ جہاں بیگم کے خالہ زاد اور ماموں زاد بھائی سر محمد یعقوب اور قاضی عبدالغفار تھے۔ ان کے ایک ماموں زاد بھائی ابوالحسن صاحب تھے جو ایک عرصہ تک یونیورسٹی میں اسٹیورڈ رہے۔

● وطن: مرادآباد ● مولد: فیض آباد (۷؍جنوری ۱۹۲۰ء) (داد دیجئے کہ یونیورسٹی اور اس کے اس فرزند کا سنہ ولادت ایک ہی ہے) ● تعلیم: گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ، اسٹیٹ ہائی اسکول، رامپور۔ ● کالج: گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد (۳۳-۳۷) ● اعلیٰ تعلیم: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۱۹۳۷ء- ۱۹۴۲ء) ● شوق: ہاکی ٹیم کا رُکن اور کلر بردار، ہاکی ٹیم کا کپتان، قافیہ پیمائی۔ ● ۱۹۴۳ء: پروونشل سول سروس میں داخلہ، بجنور، مرادآباد اور بلندشہر میں ماموری ● ۱۹۴۹ء: انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کے لئے انتخاب (دیوریا اور کسیا میں ڈی ایس او اور ایس ڈی او) ● ۱۹۴۹ء- ۱۹۵۵ء: گورکھپور بہ حیثیت ڈپٹی ریجنل اور ریجنل فوڈ کنٹرولر ● ۱۹۵۵ء- ۱۹۵۶ء: نینی تال بہ حیثیت ڈسٹرکٹ آفیسر ● ۱۹۵۶ء- ۱۹۵۷ء: بلندشہر بہ حیثیت ڈسٹرکٹ آفیسر (کلکٹر) ● ۱۹۵۷ء- ۱۹۶۰ء: جوائنٹ سکریٹری انڈسٹریز۔ یوپی (لکھنؤ) ● ۱۹۶۰ء- ۱۹۶۵ء: ڈپٹی سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری، انڈسٹریز وفارین ٹرید (حکومت ہند، (دہلی) ● ۱۹۶۶ء: ڈائریکٹر آف فشریز، یوپی (لکھنؤ) ● ۱۹۶۶ء- ۱۹۶۸ء: ایڈمنسٹریٹر، نگرمہاپالیکا، الہ آباد۔ ● ۱۹۶۸ء: ہاؤسنگ کمشنر اور ڈائرکٹر لوکل باڈیز، یوپی (لکھنؤ) ● ۱۹۶۸ء- ۱۹۷۱ء: جوائنٹ سکریٹری پلاننگ کمیشن نئی دہلی ● ۱۹۷۱ء-۱۹۷۵ء: جوائنٹ سکریٹری وزارت داخلہ نئی دہلی ● ۱۹۷۵ء- ۱۹۷۶ء: ایڈیشنل سکریٹری کمیونکیشن، نئی دہلی ● ۱۹۷۶ء- ۱۹۸۰ء: بانی و چیئرمین اسٹاف سلیکشن کمیشن نئی دہلی ● ۱۹۸۰ء- ۱۹۸۵ء: وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

مرکزی ملازمت نے سیاحت اور بین الاقوامی مذاکرات کے مواقع فراہم کئے۔ دہلی میں مسلمانوں کے لئے کریسنٹ پبلک اسکول قائم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دہلی میں رہ کر علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کی طرف سے علی گڑھ کے طالب علموں کو مقابلے کے امتحان کے لئے آمادہ وتیار کرانے کا اہتمام کیا جس کے نتائج خاطر خواہ نکلے۔ ۱۹۸۴ء میں تنقیدی سطور کا مجموعہ ''نگارخانۂ رقصاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ ایک عرصہ تک ہاکی اور ٹینس

کھیلتا رہا۔ٹینس سے تو ہنوز تائب نہیں ہوا ہوں۔۱۹۸۲ء میں ''تہذیب الاخلاق'' نئے سرے سے جاری کیا۔ لیجئے پھیلا دیا اپنی داستان حیات کو'' لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم''۔ اپنی کہانی کسے بری لگتی ہے!

والدین کے اسمائے گرامی (حافظ) سید مہدی حسن، ستارہ شاہجہاں بیگم صاحبہ (مرحومین)۔

تینوں لڑکوں نے علی الترتیب باپ، دادا، پردادا کے منصب کی بازیابی کی۔ بڑے لڑکے سید محمد پولس میں گئے اور اے آئی جی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نمائندگی ہاکی اور فٹ بال میں کی اور دونوں کھیلوں میں کلر حاصل کیا۔ منجھلے لڑکے سید مصطفیٰ، دادا مرحوم کی طرح فوج میں داخل ہوئے۔ وہ لفٹیننٹ کرنل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ چھوٹے لڑکے سید حامد نے پردادا کی روش پر چل کر سول ملازمت کی۔

حافظ سید مہدی حسن کی روش، رجحان اور اطوار و کردار اور مشاغل کو نظم وضبط اور نفاذ قانون سے زیادہ تحصیل علم، مشاہدے اور بیدار مغزی سے سروکار تھا۔ تاریخ، ادب اور اسلامیات سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ اور بچوں کا گرمیوں کی چھٹیوں میں جو انتظار ہوتا تھا اس میں ان کتابوں کی طلب ضرور شامل ہوتی تھی جو لٹن لائبریری سے ان کے لئے جاری کرائی جاتی تھیں۔ مرحوم اصولوں پر اٹل، کم آمیز، روشن خیال اور وجیہ اور با رعب انسان تھے۔ اولاد کو وہ دو چیزوں کی تاکید کیا کرتے تھے، نماز اور کھیل کی۔ انہوں نے اپنی اولاد کو راست بازی، دیانت داری اور غیرت کا سبق مثال بن کر سکھایا۔ سیّدوں کے ساتھ بعض وقت جلال منسوب کیا جاتا ہے حالانکہ ہونا نہ چاہئے۔ ان کی ہمراہی کے لئے حلم کافی ہے۔لیکن اس خاندان میں بھی جلال کی لکیر ملتی ہے جو پردادا کی اولاد میں نمایاں تھی، ان کی اولاد کی اولاد میں باقی رہی لیکن کم ہوکر۔

ہمارا گھرانہ عام متوسط مسلمان گھرانہ تھا۔ہم اسے مثالی گھرانہ نہیں کہہ سکتے۔ اختلافات بھی ہوئے اور شکر رنجی بھی، لیکن والدین کے احکام سے سرتابی کی مجال کبھی نہ ہوئی۔ اس گھر میں جھوٹ اور غیبت کا گزر نہ تھا۔ عرض مدعا یا حصول مقصد کے لئے کسی کے آگے جھکنا قدغن تھا۔ سر اونچا رکھنا، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینا شیوہ تھا۔ یہ خاندان مغرور نہ تھا، غیرت مند بے اندازہ تھا۔ نہ کسی کو تحقیر سے دیکھا، نہ کسی سے مرعوب ہوئے۔ ایک سادگی، ایک جفاکشی، ایک استغنا اور اللہ معاف کرے اپنی تنہا روی، ریاضت، سادگی اور فریب ناشناسی پر فخر سید مہدی

حسن کے سارے بچوں کو رہا ہے۔ تینوں بیٹوں مین سے کوئی بھی اپنے کیریئر میں وہاں تک نہیں پہنچا جہاں تک پہنچنا چاہئے تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایک گونہ استغنا، سرافرازی اور عزت نفس! ہماری اخلاقیات میں چالاکی سب سے بڑا گناہ سمجھی جاتی تھی۔ دل آزاری کے خلاف ہمیشہ ہدایت کی گئی۔ مرادآباد میں جو لوگ ہم سے واقف تھے، خصوصاً ہمارے وسیع خاندان کے افراد، ہمیں معتبر جانتے تھے۔ ذکر ہوتا تھا سید مہدی حسن اور ستارہ شاہ جہاں بیگم کے بچے کتنے اچھے اٹھ رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر انسان کی فطرت میں کجی نہ ہو تو اعتراف اور تعریف کردار سازی میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ انسان وہ ہونے کی لامحالہ کوشش کرتا ہے جو اسے سمجھا جارہا ہے۔ لیکن تعریف میں بے اعتدالی ہو تو بچے بگڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تعریف زبان سے ہو۔ ہم نے ماں باپ کی آنکھوں میں کبھی کبھی فخر کی چمک دیکھی ہے۔ دنیا کا کوئی انعام اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

اس میں تفاخر سے زیادہ تعارف کا پہلو ہے۔ جن لوگوں کو دنیا جانتی ہے ان کے ذریعہ ان کے غیر معروف عزیزوں کو بھی پہچان لیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرعلی امام و حسن امام کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ سر محمد یعقوب سے تعلقات رہے مگر زیادہ نہیں، قاضی عبدالغفار سے نسبتاً زیادہ۔ مرادآباد پہنچ کر ہمارا آنا جانا اپنے ماموؤں مولوی انوارالحق، اسرار الحق، فضل حق، ضیاء الحق اور چچا میر ہدایت حسین اور خالو قاضی ایوب علی کے یہاں زیادہ تھا، یہ سب زمیندار تھے۔ مولوی انوارالحق (ماموں جان) کے یہاں میں نے اشاعت علم کا وہ انمول دستور دیکھا جو اس وقت رائج تھا۔ محلے کے بچے اور بچیاں ان کے گھر آتیں۔ ہماری ممانی جان انہیں قرآن شریف اور اردو پڑھاتیں، بچیاں گھر کا کام بھی کردیتیں اس طرح بچیوں کی تربیت خانہ داری بھی ہوجاتی اور ان کا سر بھی نہ جھکتا۔ افسوس کہ زمانہ کی گردش نے اس طریقۂ تعلیم و تربیت کو ختم کردیا۔ میں بہت عرصے سے فریاد کررہا ہوں کہ یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے لیکن کون سنتا ہے۔ اس وسیع اور کارآمد نظام کا دراصل کوئی بدل نہیں ہے۔

والد مرحوم ادب، لحاظ، حفظ وضع کے ماننے اور خاندانی روایات کا احترام کرنے کے باوجود اپنے زمانے سے آگے تھے، ان کا ذہن نئی باتوں کے لئے وا تھا، وہ روشن خیال تھے، اپنے خاندان کے لئے انہوں نے پردے کی زنجیروں کو ڈھیلا کیا۔ پورا گھر اور خاندان کے دیگر

افراد مل کر کبھی کبھی نانہالی گاؤں شیریں کوٹی جایا کرتے۔ یہاں حاجی اسرار الحق مراعات، رفاہ اور رعب کے ساتھ زمینداری کرتے تھے۔ یہیں ہم لوگوں کے باغات تھے۔ اب صرف ہمارا آم کا ایک باغ رہ گیا ہے جو بزرگوں کی نشانی کی حیثیت سے محفوظ ہے......کبھی کبھی امروہہ کی سڑک پر شہر سے چار پانچ میل دور گانگن ندی کی ریتی پر خربوزے کھانے جاتے تھے اور گاہ گاہ برسات کے موسم میں بھی قاضی ایوب علی صاحب کے باغ میں جھولے ڈالے جاتے اور پکوان پکتے اور دال بھری روٹیاں (برہئی) کھائی جاتیں۔

اس نانہالی گاؤں میں والدہ محترمہ کا زیادہ حصہ تھا، دادھیال کے گاؤں تحصیل امروہہ میں تھے۔ ان میں والد صاحب اور چچا صاحب کا زیادہ حصہ تھا اس طرح ہم چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ گنگد اس پور میں زیادہ آبادی ان لوگوں کی تھی جو ترک کہلاتے تھے۔ ان میں سے بعض کے خدو خال ان کی اصل کی غمازی کرتے تھے۔ یہ سب لوگ کاشتکار اور اچھے مسلمان تھے۔

تینوں بھائی گاؤں پہنچ جاتے، والد صاحب کے ساتھ لیکن میں زیادہ ساتھ ہوتا۔ خالص گھی کے ساتھ دال اور موٹی گرم روٹی بہت اچھی لگتی۔ کبھی شکار کے گوشت کا اضافہ ہوتا۔ لیکن ہم ان دنوں کی راہ خاص طور پر دیکھا کرتے جن میں آس پاس کے بڑے گاؤں میں پینٹھ لگتی تھی۔ دوکاندار سامان زیادہ تر ٹٹوؤں اور بیل گاڑی پر لاتے۔ اس قدر شہرت اور صنعتیت کے باوجود آج بھی ہندوستان کی بیشتر آبادی کا گزارہ ان ہفتہ وار بے ہنگم لیکن بہت دلکش بکھرے ہوئے بازاروں سے ہوتا ہے۔ میرے جیسا دقیانوسی آدمی ان پینٹھوں کو جو انسان کی بنیادی ضروریات پوری کرتی ہیں، لندن کی ہائی اسٹیٹس اور نیویارک اور شکاگو کے ڈاؤن ٹاؤن سے زیادہ دلکش پاتا ہے۔ تہذیب اور مدنیت کے لئے انسان کو بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ پتہ نہیں یہ سودا ٹوٹے کا ہے یا لابھ کا! گرمیوں کی چھٹیوں میں ان پینٹھوں سے ہمارا ہر کارہ سبزیاں اور گوشت لے آیا کرتا اور دسترخوان پر دال کی یکتائی کا طلسم ٹوٹ جاتا۔

بیل تانگوں میں جانے کا موقع ملتا تو بہت لطف آتا تھا۔ ایک بار میں نے رات کو غلے کی گاڑی میں گاؤں سے گھر تک سفر کیا۔ راستے بھر سوتا آیا اور منہ اندھیرے گھر پہنچ گیا۔ ہمارا آبائی مکان تو مغلپورہ میں تھا لیکن بعد میں والد صاحب نے فیض گنج میں ایک مکان کرایہ پر لیا جسے بعد میں خرید لیا۔ لیکن جب خاندان کا شیرازہ بکھرا تو اسے بیچنا پڑا۔ اس میں اس وقت

ظروف کا کارخانہ ہے۔ اس مکان سے ہمارا کالج چند قدم پر تھا۔ قانون گویان ہوتا ہوا کالج جایا کرتا۔ یہ کالج اس جگہ بنا ہے جہاں پہلے روایت کے مطابق شاہجہاں کے گورنر رستم خاں کا قلعہ تھا۔ رستم خاں نے ہی وہ شہر بسایا جو مرادآباد کہلاتا ہے۔ پہلے اس کا نام رستم آباد رکھا۔ شاہجہاں کو خبر ہوئی اور سمجھایا گیا کہ یہ سرکشی کی شروعات ہے ۔رستم خاں نے فوراً اس بستی کا نام شہزادے کے نام پر مرادآباد رکھ دیا تب کہیں جان کی امان پائی۔قلعہ کے مغرب میں اسی زمانہ کی ایک بڑی مسجد ہے جس کی دیواروں کے آثار گلی کے برابر چوڑے ہیں۔مشہور ہے کہ قلعہ سے سرنگیں جاتی ہیں۔کالج کے پہلو میں شہر کی خوشنما اور وسیع جامع مسجد واقع ہے۔ نیچے رام گنگا بہتی ہے بلکہ بہتی تھی اب فاصلہ ہوگیا ہے۔ندیاں بھی رخ بدلتی رہتی ہیں۔الوداع کے دن باہر سے بھی نمازی آتے اور ناؤ کے پل کے دونوں طرف صفیں بچھائی جاتیں۔مولانا فاہم علی جن کا تعلق ایک دیندار خاندان سے تھا امام شہر تھے۔ لمبے چوڑے، خوش قرأت، خوش لباس بزرگ تھے۔ اہل مرادآباد کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ الازہر کے فارغ التحصیل تھے۔لیکن مجھے حاضری کا موقع ملا ایک اور بزرگ کی خدمت میں۔ ان کا نام تھا مولوی **غالب علی**۔عبادت گزاری، نفس کشی، خدمت خلق اور سادہ دلی کی یہ تصویر ابھی تک دھندلی نہیں ہوئی۔مرادآباد میں ایک عرصہ تک شمس الدین نامی ایک مجذوب کا طوطی بولتا رہا۔ جذب کے عالم میں بہت کچھ کہہ جاتے تھے، کچھ باتیں صحیح بھی ہوجاتی تھیں۔مولوی غالب علی کے سامنے وہ بڑ، جذب وجنوں، چیخ پکار سب بھول جاتے تھے، اور دو زانو ہوکر بیٹھتے۔ اسی زمانہ سے میں بزرگی منسوب کرنے لگا سادگی،فقر، انکسار، ایثار اور مخلوق کی خدمت کے ساتھ۔

پیری مریدی کا ہمارے یہاں کبھی چلن نہیں رہا۔ خاصان خدا کی عزت البتہ دل سے کرتے رہے بلکہ ان لوگوں کی بھی جو بحیثیت انسان کے سچے، کھرے اور سادہ ہوتے تھے اور اس میں مذہب وملت کی قید نہ تھی۔ والدین نے ہم پر گہری چھاپ چھوڑی اور ہمیں ایک طرف انجماد اور دوسری طرف فساد سے دور رکھا۔

کالج میں تین پرنسپل صاحبان کا زمانہ دیکھا۔مسٹر ہریش چندر مشرا، مسٹر مکھرجی، مسٹر بی این جھا۔ ہم ہاکی ٹیم چندوسی لے کر گئے۔ فائنل تک پہنچے۔ دوسرے روز پرنسپل صاحب دیکھنے آئے۔ ہمت بڑھاتے ہوئے کہا ’’آج کل میرا ستارہ گردش میں ہے۔تم بھی کہیں ہار نہ جانا۔

'' ان کا یہ جملہ نہیں بھولا۔ ہم نے ان کی تشریف آوری کی لاج رکھ لی اور ٹرافی اٹھالی اور گردش کا طلسم توڑ دیا۔ ہمارے گیمس سپرنٹنڈنٹ پیٹرک صاحب تھے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ بھی وہی تھے اسی لئے احاطے میں رہتے تھے۔ موثر اور جاندار، پھرتیلے، چھریرے، بدن اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ لیکن رنگ آبنوسی! ستم ہے کہ ہم کالے آدمی اپنوں میں سے ان لوگون پر انگشت نمائی کرتے ہیں جن کا رنگ ہم سے زیادہ پختہ ہو۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں ایک بہت بڑی ریاستی نمائش ہوئی، میں ہاکی کا کپتان تھا۔ مجھے پہلی بار باہر نکلنے کا موقع ملا۔ شاید کرسچن کالج میں ٹھہرے تھے۔ ایک روز جمعہ کی نماز سے واپسی میچ سے پہلے مگر اس وقت کے بعد ہوئی جب مسٹر پیٹرک ہماری توقع کررہے تھے۔ کچھ خفگی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے آپ کھیلنے آئے ہیں! میں نے اپنی عادت کے خلاف چھوٹتے ہی جواب دیا اگر معلوم ہوتا کہ نماز نہیں ملے گی تو میں سرے سے نہ آتا۔ خاموش ہوگئے ۔ مجھے یہ نہ کہنا چاہئے تھا۔ میں نے پوری زندگی یہ کوشش کی ہے کہ کام میں عبادت کی وجہ سے کسی عنوان کمی نہ آنے پائے۔ رمضان کے زمانہ میں ہمیشہ دوسرے مہینوں سے زیادہ کام کیا تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ عبادت فرض منصبی کی راہ میں حائل ہورہی ہے۔

جب ٹرافی لے کر واپس آئے تو سارا کالج مرادآباد اسٹیشن پر پذیرائی کے لئے موجود تھا۔ پرنسپل بی این جھا نے ایک بڑا جلوس نکلوایا جو شہر کی بڑی سڑکوں سے گذرتا ہوا کالج پہنچا۔ اس استقبال سے ہمارے دل بہت بڑھ گئے۔ ہمارے کھیلوں کے نگہدار بمل چند تھے۔ ہم لوگوں نے آسانی انہیں ہمنچل کہہ کر پکارنے میں دیکھی۔ وہ کہنے کو ''گیمس سرونٹ'' تھے لیکن لڑکوں میں اثر و رسوخ بہت رکھتے تھے۔

چھٹی جماعت میں آتما چرن کلاس ٹیچر تھا۔ نویں دسویں جماعت میں کول صاحب نے تاریخ پڑھائی، خوب پڑھائی۔ انٹر میں انگریزی چاند بہاری لال نے پڑھائی۔ بڑے اچھے استاد تھے۔ داڑھی سے ہونٹوں کی شریر مسکراہٹ جھانکتی تھی۔ اردو ابتدائی جماعتوں میں مولوی صاحب سے پڑھی۔ شومئی قسمت ان کا نام بھول گیا، لنگ کرتے تھے چلنے میں؛ سزا دینے میں نہیں۔ فارسی مشاق حسین وفدا حسین صاحب نے خوب پڑھائی۔ آخر الذکر کو شوخ چشموں نے وہی خطاب دیا جو علی گڑھ میں نفیس صاحب کو ملا۔ انٹر میں اردو فاروقی صاحب نے پڑھائی جن کا

وطن الہ آباد تھا۔ اور انگریزی میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ تقریر کرنے اور استدلال میں انہیں درک تھا۔ جو طالب علم یاد آتے رہے ان میں جلیل جو چھکے مارتے تھے، رفیق جو بوجھ اٹھا کر جسم بناتے تھے، توفیق جو کھیلوں سے زیادہ ان کی سیاست پر دھیان دیتے تھے۔ صفات، اظہر الزماں، سلطان شجاع اور زاہد جنہوں نے ہاکی میں کمالات دکھائے۔ سلیم اور وارث، رامیشور پرشاد، شجاعت، فراست، شفیع، اسحٰق، اعجاز بیگ اور شاکر خاں، عابد علی خاں اور نصرت، عشرت، رام کرشن، نکھل سانیال تھے۔ شاکر تقریر میں طاق تھے۔ آنند سروپ کا جو مجھ کو بہت عزیز تھا اب تک ذکر نہیں آیا۔ بیچارہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ مجھے طفلی کی یہ موت غم زدہ چھوڑ گئی۔ میں نے آنند کا نوحہ لکھا۔ سلیم اور وارث، اسحٰق اچھے طالب علم تھے۔ بعد میں سلیم اپنی ساری شوخیوں کو لے کر نقاب خاک میں چھپ گیا۔ چھٹی جماعت میں ڈرائنگ کے مضمون نے بہت ستایا۔ ڈرائنگ چھوٹی اور جغرافیہ چھوٹا تو سکون کا سانس لیا۔

مرادآباد کی تحصیلوں میں دو بڑی ہیں، سنبھل اور امروہہ۔ ایک بار اگست کے مہینے میں چار پانچ ساتھیوں نے سوچا کہ سنبھل کی سڑک پر آم کے باغات ہیں، وہاں آم کھانے چلیں۔ ماں سے میں نے اجازت لی۔ خیال تھا کہ ایک دو میل کے اندر آم کھانے کو مل جائیں گے۔ دیکھا تو پیڑ خالی امید نے لوٹنے نہ دیا آگے بڑھتے چلے گئے۔ ذوق نے شہہ دی سائیکلوں کے پیڈل اور پہیے تیزی کے ساتھ گھومنے لگے۔ راہ گیروں سے پوچھتے رہے کہ آموں کے باغ کہاں ہیں وہ آگے کی طرف اشارہ کردیتے۔ شوق نے سوچنے اور ٹھہرنے کی مہلت نہ دی۔ ایک دو میل کے ارادے سے چلے تھے۔ آموں کی لالچ میں بیس بائیس میل طے کر بیٹھے اور سنبھل پہنچ گئے۔ ستم یہ کہ باغ در کنار وہاں بازار میں بھی آم نظر نہ آئے۔ رات ہوچکی تھی بغیر آم چکھے واپسی کا ڈول ڈالا۔ سائیکلوں میں ایک ایک کر کے پنکچر ہوتے چلے گئے۔ حوصلہ کا بھی وہی حال تھا جو ٹائروں کا۔ سائیکلیں ٹھیلتے ہوئے بیس میل کی مسافت طے کی۔ رات کے ایک یا دو بجے گھر پہنچے۔ گھر والوں پر قیامت گزر چکی تھی۔ ہماری واپسی کی خوشی خفگی کے اظہار میں ڈوب گئی۔ مجھے اپنی اس نادانی کا آج تک افسوس ہے۔ والدہ مرحومہ کا غصہ سر آنکھوں پر لیکن اس کرب کی تلافی کون کرسکتا ہے جس سے اس رات وہ گزریں۔ یہاں لندن میں ایک رات راستہ بھول گیا۔ گھنٹوں گھومتا رہا۔ ثریا، ثمر اور ماہ رو کا پریشانی کے مارے برا حال تھا۔ خواہ

حماقت کے نتیجے میں ہوئی، تھی تو وہ بھی دل آزاری۔ مجھے سنبھل کی بے مصرف اور دل شکن سیاحت یاد آ گئی۔

سیاسی بحثیں اس زمانے میں عام تھیں۔ مراد آباد کے مسلمانوں کا جھکاؤ علماء کے اثر سے کانگریس کی طرف تھا۔ یہاں کی شاہی مسجد جمعیۃ العلماء کا قلعہ تھا۔ شروع شروع میں جب ہم مراد آباد آئے تو سڑکوں پر مولانا محمد علی جوہر پر دشنام طرازیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ ہم تینوں بھائیوں کے لئے حکم تھا کہ مغرب کے وقت گھر واپس آ جائیں۔ لہٰذا ہم وہ تقریریں نہ سن سکے جن کا اشتیاق تھا۔ مثلاً مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں سے محروم رہے۔ ان کا اس دور میں کوئی جواب نہ تھا۔ روایت ہے کہ ان سے زیادہ مؤثر کوئی مقرر اردو زبان میں گزرا ہی نہیں۔ مجمع ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح ہوتا۔ الہ آباد میں جب میں میونسپل کارپوریشن کے سربراہ کی حیثیت سے تعینات ہوا تھا تو وہاں کی ایک محفل میں جسٹس کاٹجو سے یوں ہی مشہور مقررین کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگے، عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر میں حرف آخر تھے۔ ایک بار وہ تقریر کر رہے تھے کہ بادل گھر کر آ گئے۔ منتظمین پریشان ہوئے کہ ہزاروں کا یہ مجمع کہاں سمائے گا؟ مسکرا کر کہنے لگے آپ فکر نہ کریں۔ کوئی شخص پہلو بھی نہ بدلے گا کہ اس کی ضمانت میں لیتا ہوں۔ بارش ہوئی تیز بارش، دیر تک۔ لیکن ایک آدمی بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھا۔ ظالم نے ایک طلسم باندھ دیا تھا۔ وہ جادوگر الفاظ اور جذبات سے ساحری کرتا تھا۔

ہمارے یہاں ایک عرصہ سے ''انقلاب'' آ رہا تھا۔ میں نے بچپن ہی میں اسے دیکھنا شروع کر دیا، غلام رسول مہر کے اداریئے اور عبدالمجید سالک کا ''افکار و حوادث''! انقلاب اور مدینہ میں چشمک تھی۔ مدینہ کا فکاہی کالم ''سر راہے'' انقلاب کے افکار و حوادث سے ٹکرایا کرتا تھا۔ اور چنگاریاں اڑتی رہتی تھیں۔ اسی طرح میری یاد اللہ اردو صحافت سے ہوئی۔ میں نے مارچ ۱۹۳۱ء میں مراد آباد انٹر کالج سے چھٹی جماعت کا امتحان پاس کیا۔ والد صاحب نے اخراجات کے دیکھتے ہوئے اس ملازمت کی تجدید کی جس سے ان کے مزاج اور ذوق کو مناسبت نہ تھی یعنی ریاست رامپور میں اسی عہدے پر مقرر ہوئے۔ ان کی خودداری کو ریاست کی فضا کہاں راس آتی۔ ایک سال ہی میں واپس چلے آئے۔ چنانچہ ساتویں جماعت میں نے اسٹیٹ ہائی اسکول رامپور سے پاس کی۔ ہم لوگ بزریا ہمت خان میں رہتے تھے۔ دلی کے ایک

لڑکے حبیب سے جو ہم جماعت تھا، دوستی ہوئی۔ وہ فٹ بال اچھی کھیلتا تھا، میں ہاکی۔

ایک اور بات جو ابھی تک یاد ہے وہ لکچر تھا جو بھائی جان نے علی گڑھ سے آکر اسکول میں دیا تھا۔ موضوع تھا'' زمین کی دو گونہ حرکت''۔ عبدالرحیم صاحب ہمیں جغرافیہ پڑھاتے تھے۔ آٹھویں جماعت سے بارہویں جماعت تک مرادآباد کالج سے بہرہ یاب ہوا۔ ابھی تک میرا شمار اوسط طالب علموں میں تھا۔ ساتویں جماعت کے بعد کچھ (میرے لئے) مشکل مضامین سے چھٹکارا ملا تو میں نے پروبال نکالے اور میری گنتی تیز طالب علموں میں ہونے لگی اور میں اڑان بھرنے لگا۔ قدم برابر زمین پر رہے تو ازن بگڑنے نہیں پایا۔ کام میں باقاعدگی بھی نہ تھی کہ خم ٹھونک کر میدان میں آجاؤں اور رجز پڑھنے لگوں۔ اپنی اوقات معلوم تھی اور خدا کا شکر ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ ہاتھوں میں سے ایک کا کام تھا ہاکی اسٹک پکڑنا اور دوسرے کا کتاب اور جبیں کا کام سجدہ کرنا۔ اس موحد کو یہ انوکھی تثلیث ایسی راس آئی کہ زندگی بھر اس سے لپٹا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک مدت کے بعد ہاکی کی جگہ ٹینس نے لے لی اور کتاب کی جگہ فائل نے۔

والد مرحوم کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ کچہری سے لوٹے، گاؤن اتارا اور قانون، تعزیر اور عدالت کو اس کے ساتھ اتار پھینکا اور مطالعہ کے لیے تیار ہوکر کتابوں کی دنیا میں کھو گئے۔ پڑھنے کا ایک خاص انداز تھا جسے افسوس ہے میں اختیار نہ کرپایا۔ چند صفحات پڑھنے کے بعد کتاب کو الٹ دیتے اور جو کچھ پڑھا تھا اس پر غور کرتے پھر آگے بڑھتے۔ مجھے یہ نعمت کبھی نصیب نہ ہوئی کہ لیٹ کر پڑھ سکوں۔ جہاں بستر پر دراز ہوا نیند نے اپنا حق مانگا اور اس سے کہیں زیادہ لے گئی۔ لیکن اس نے دیا بہت کچھ بے حساب، ناشکری نہیں کرنا چاہئے۔ ابا میاں کو اشعار بہت یاد تھے۔ انہیں پڑھا کرتے تھے اکثر ہم سے دہرواتے۔ مجھے شاعری سے مس اسی بنا پر ہوا۔ ایک مشاعرے میں میں بھی شریک ہوا۔ ابا میاں جو اشعار پڑھا کرتے تھے ان میں سے ایک دو نقل کرتا ہوں

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے
آمادہ جنگ کرنے پہ چھوٹے بڑے ہوئے
تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

ہمارے عزیزوں میں جو سب سے زیادہ ہم سے قریب تھے وہ ماموں میاں مولوی ضیاء الحق تھے۔ وہ محبت، صبر وشکر اور خندہ برلب، ضبط، برداشت اور غنا کے پیکر تھے۔ بڑی عسرت اور سختی میں زندگی گزاری لیکن کبھی نہ حرف شکایت زبان پر لائے نہ دل کے دامن پر ملال کی گرد بیٹھنے دی۔ تنگ دامانی میں فراخ دلی کی شان پھر کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔ ماموں میاں اور بی جان (والدہ) تلے اوپر کے بھائی بہن تھے۔ دونوں میں باہم جتنی محبت تھی اتنی ہی ان کے مزاجوں میں مماثلت۔ ہمارے گھر میں کہا جاتا ہے کہ مجھ میں صبرو برداشت کا مادہ ماں اور چھوٹے ماموں سے آیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی صرف پرچھائیں پڑی۔ ستارہ شاہجہاں بیگم نرمی، رحم، بردباری، تحمل کا پیکر تھیں۔ ان کی اولاد کو غصہ سے سروکار نہ تھا۔

سید حامد کو قرآن ماں نے پڑھایا اور فارسی اور اردو ادب کا ذوق والد نے دیا۔ وہی ذوق جو آج تک رفیق راہ ہے۔ تاریخ اور کہانیاں کسے ناپسند ہیں۔ چھپ چھپ کر تاریخ کی کتابیں اور **داستان امیر حمزہ** پڑھنے میں جو لطف آیا وہ ابھی تک یاد ہے۔ اندھیرے کی پڑھائی بینائی پر اثر انداز ہوئی اور آگے چل کر پڑھنے کے لئے عینک لگا کر پڑھنے کی ضرورت پڑی جس میں خاصی تاخیر ہوئی اس لئے کہ پڑھنے سے زیادہ جس شے سے دلچسپی تھی عینک لگائی تو کہیں وہ نہ ہاتھ سے چلی جائے۔ وہ چیز تھی ہاکی کا کھیل! حالانکہ یہ اندیشہ غلط تھا۔ ایم اے کے دوسرے سال میں ڈاکٹر موہن لال سے چشمہ لیا اور چشمہ لگا کر ہاکی کھیلی اور گیند بہتر نظر آنے لگی۔ سمجھتا تھا کہ سب لوگ کہیں گے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوگیا ہے۔ چشم الدین ہوگئے۔ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ انسان، خصوصا وہ انسان جو ذکاوت حس رکھتا ہو خود کو خلاصۂ کائنات سمجھنے لگتا ہے اور باہر نکلتے ہوئے گھبراتا ہے کہ سب کی نگاہیں ہم پر ہوں گی، لوگ کیا کہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پر ایک آدھ اچٹتی ہوئی نگاہ کے علاوہ کوئی نظر نہیں پڑتی، سب لوگ اپنے کام اور اپنی ذات میں محو رہتے ہیں۔ انہیں کہاں فرصت اور کیا پڑی کہ کسی دوسرے کو دیکھیں۔

جھجھک نے نہ صرف یہ کہ بینائی کو نقصان پہنچایا بلکہ بہت سے مواقع ہاتھ سے جانے دیئے۔ ایک بار تقریر کرنے کی ٹھان لی۔ گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کالج کی طرف سے پارکر ہائی اسکول کی ڈبیٹ میں حصہ لینے کی نیت سے گیا۔ وہاں پہنچا تو پاؤں ٹھنڈے تھے۔ اپنا نام پیش کرنے اور ڈائس پر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسروں کو سن کر چلا آیا۔ اس سے پہلے گورنمنٹ ہائی اسکول، اناؤ میں (جہاں تیسرے سے چھٹے درجہ تک پڑھا) چھتری کھودی۔ اعلان کے ساتھ اس کی بازیابی کا موقع آیا، جھجھک قفل ذہن بن گئی اور چھتری ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتی رہی۔ دروں طبعی، اعصابیت Nervousness اور خودنگری Self-Conciousness نے غنچہ کی طرح گرفتہ رکھا کِھلنے اور کُھلنے نہیں دیا۔ اس پر مستزاد روایتی ادب اور لحاظ جس کا سبق گھر میں ملا۔ بچپن میں وہ چیز جسے اقدامیت کہتے ہیں، یعنی Intiative چھو کر نہیں گئی تھی۔ خاندان کی روایات اور بزرگوں کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھالتا رہا۔ اسی روش پر بسر ہوتی تو چھوئی موئی ہوکر رہ جاتا۔ ہاکی نے حوصلہ دیا، مقابلہ کرنے کی خو عطا کی اور سلامت روی کی یک گونہ کاٹ جارحیت سے کی لیکن یہ جارحیت سات پردوں میں چھپی رہی، اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال ہمیشہ رہا کہ کسی کو جراحت نہ پہنچے، کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ دوسرے کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھنے کی عادت اتنی راسخ ہوگئی کہ پرآشوب دور میں اور خون کھولتے وقت بھی اس نے ساتھ نہ چھوڑا، نہ کسی بھڑکے ہوئے جذبے سے زیر ہوئی۔ اس کے لئے میں اپنے خالق کا شکرگذار ہوں۔ جھجھک نے اپنا جائز حق طلب کرنے سے ہمیشہ روکا۔ یعنی گھر پر بھی اس خیال سے تکلف کرتا رہا کہ بہن بھائی کو زیادہ حق ملے۔ بی جان (والدہ) مجھے چھوٹا اور تکلف خُو، سمجھ کر مجھ پر خصوصی توجہ کرتیں۔ ابا میاں (والد مرحوم) آڑے آتے کہ اسے اپنا حصہ بڑھ کر لینے کی عادت پڑنی چاہئے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اپنے ہم وطن (اگر کچھ عرصہ کو عظیم آباد کو وطن سمجھا جائے) شاعر کا پہلا مصرعہ میری کوتاہ دستی کی غمازی کرتا ہے۔ گھر پر اور خاندان میں اس کوتاہ دستی کا فائدہ بھی ہوا۔ تکلف کی شہرت نے مجھے خاطر و مدارات کا ہدف بنادیا لیکن جیسا کہ والد صاحب کو اندیشہ تھا، گھر سے باہر،

زندگی کی اس رزم گاہ میں اس کوتاہ دستی نے ہمیشہ ٹوٹے میں رکھا۔ البتہ لوگ عزت ضرور کرتے رہے کہ چوہوں کی اس دوڑ میں، جدید زندگی جس سے عبارت ہے، یہ شخص وقار اور بے نفسی اور کم طلبی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے اور دوسروں کا خیال خود سے زیادہ رکھتا ہے۔ اس عزت نے بھی جو اپنے اور بیگانے سب سے ملتی رہی نقصان پہنچایا۔ ہاکی اور ٹینس کے علاوہ ٹکرانے کے موقع کم ملے۔ ٹکرانے سے حرارت اور روشنی دونوں پیدا ہوتی ہیں۔ ٹکرانا اور رگڑ کھانا جلد کو موٹا اور دست و بازو کو مضبوط کرتا ہے۔ لڑائی کے میدان میں اترنا ہو تو موٹی جلد کی ڈھال بہت کام آتی ہے۔ خدا کا شکر ہے مجھے جو کچھ دنیا سے ملا، بنا مانگے ملا۔ کسی کے آگے سر جھکانا یا ہاتھ پھیلانا نہ پڑا لیکن خدا کے شکر کے ساتھ خود سے گلہ کرتا ہوں کہ اپنے حصہ اور حق کے لئے میں لڑا کیوں نہیں۔ جو دوسروں کے ساتھ نا انصافی کے تصور سے کانپتا ہو اس نے بارہا اپنے ساتھ ناانصافی کیوں روا رکھی۔ ناانصافی اگر اپنے ساتھ ہو تو کیا ناروا نہیں؟۔

اناؤ میں مشرف علی خان صاحب مرحوم (مؤسس امیر نشاں) کا لڑکا اشرف علی خاں میرا ہم جماعت تھا۔ باپ بیٹے کا ذکر اطہر پرویز نے اپنی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں کیا ہے اور حق یہ ہے کہ انصاف نہیں کیا۔ اشرف تزک و احتشام سے اسکول آتا تھا۔ میں قلندرانہ اور کھلنڈرانہ انداز کے ساتھ مگن۔ چلنے میں کبھی ایک کندھا اوپر جاتا تھا کبھی دوسرا، ایک عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ رفتار اس قدر بے ڈھنگی ہے، لیکن بھائی جان کی متواتر فہمائش سے چال کچھ سنبھل گئی۔ اب تقریباً ٹھیک ہے۔ اسکول سے واپسی پر عجب نقشہ ہوتا۔ انگلیاں روشنائی میں رنگی ہوتیں، کتابیں کاپیاں رستے میں ٹپکاتا جاتا۔ وہ چند روز جو امتحان ختم ہونے اور نتیجہ آنے کے درمیان گزرتے، بہت دلکش ہوتے۔ پیڑوں پر پتھروں سے قدر اندازی کی مشق کرنے اور لب و دنداں کے لئے امبیوں (کیریوں) کی ترشی حظ اندوزی کا سامان بہم پہنچاتی۔ صحرا نوردی کے دلفریب اور اولین تجربات وہ ہوتے جب پُڑیوں میں نمک مرچ لے کر جاتے اور چنے کی کونپلیں توڑ توڑ کر حریصانہ کھاتے۔ کیتھ اور کروندے کی لذت کو کام و دہن اب تک نہیں بھولے ہیں۔

گھر پر استاد پڑھانے آتے۔ افتخار حسین صاحب نے ہم تینوں بھائیوں اور باجی (رقیہ خاتون) پر اپنی تعلیم کے گہرے نقوش چھوڑے۔ حساب کے مضمون کو انہوں نے ہم سب کے

لئے بہت دلچسپ بنادیا۔ نیو مضبوط رکھ دی جائے تو حوصلہ کے بقدر جتنی اونچی عمارت چاہئے کھڑی کر دیجیے۔ ان کے اکائی کے قاعدے نے حساب کے پیچیدہ سے پیچیدہ سوال کو حل کرنے کی چابی ہمارے ہاتھوں میں دے دی۔ اب تو نئی ریاضی نے اکائی کے اس ہمہ گیر قاعدہ کو متروک کردیا ہے۔ میرے کام یہ قاعدہ اب بھی آجاتا ہے اور اسی کی بدولت میں نے ہائی اسکول میں ریاضی کے پرچوں میں امتیازی نمبر حاصل کئے۔ افتخار صاحب (خدا ان کی تربت کو عنبریں کرے) بے حد ذہین انسان تھے، شگفتہ مزاج اور شفیق استاد۔ وسائل نے ساتھ دیا ہوتا تو بہت آگے جاتے۔ اسی وقت سے استادوں کی ایک شناخت ہاتھ آگئی۔ استاد در اصل وہی ہے جو شاگرد کے اندر مضمون میں دلچسپی پیدا کرے۔ اس کے علاوہ بغیر دلچسپی پیدا کئے جو کچھ کیا جاتا وہ یادہ گوئی، نقالی، کتاب خوانی اور ذہنی تشدد اور ظالمانہ تسلط ہے اور بس۔ وہ شیریں کو تلخ بناتا ہے اور مضمون سے نفرت پیدا کردیتا ہے اور خود سے بھی۔ نہ معلوم کتنے ہونہار طالب علموں، کتنی خوابیدہ صلاحیتوں کا یہ ظالم اور جاہل استاد (خواہ اسکول اور کالج میں پڑھاتے ہوں یا یونیورسٹی میں) خون کرتے ہیں۔

اناؤ میں ہم تین مکانوں میں رہے۔ انسار، قلعہ اور شیخ واڑہ، انسار میں اس مکان میں جس میں پہلے سے پولیس کلب تھا، اس کے ساتھ ایک بڑا میدان تھا جس کے سرے پر فاصلے سے پیپل کے دو پیڑ تھے اور ان کے درمیان ایک کنواں۔ ان پیڑوں کو بھوتوں کی آماجگاہ بتایا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے اوہام شکن باپ نے بھوتوں کے خیال کو اسی وقت نکال باہر کیا۔ یہ میدان ہماری بازی گاہ تھا۔ میں نے ہاکی، جس پر مجھے اتنا ناز ہے بھائی جان کی سخت گیر تربیت میں یہیں سیکھی۔ چھٹیوں میں دن بھر کھیلا۔ ننگے پاؤں، کانٹوں اور کنکروں کو کچلتا ہوا۔ اس زمانہ میں نقاشی بہت کی یعنی dribbling ہاتھوں اور کلائیوں کو جو مہارت اس وقت مل گئی اسی نے کالج میں ہاکی کا کپتان بنایا، یونیورسٹی کا کلر دلایا۔ کھیل کا ذکر بار بار اس لئے کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر کی ترجیحات میں اس کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

قلعہ کے مکان میں نماز پڑھنا سیکھی اور باجماعت نماز کا سودا سر میں سما گیا۔ سات آٹھ سال کی عمر ہوگی منھ اندھیرے اٹھ کر قلعہ کی مسجد جاتا جو گھر سے خاصے فاصلے پر تھی اوبڑ کھابڑ راستہ طے کرتا ہوا۔ قلعہ زہریلے سانپوں کے لئے بدنام تھا۔ ڈر لگتا تو دم سادھ لیتا لیکن جاتا ضرور اور

موقع ملتا تو فجر سے پہلے مسجد میں جھاڑو بھی دیتا۔ روزے بھی سات سال کی عمر سے رکھنے شروع کئے۔ یہیں روزہ کشائی اس عمر میں ہوئی۔ بہت دنوں تک گنڈے دار روزے رکھے۔ پیاس بہت لگتی تھی۔ گھڑوں اور صراحیوں میں ٹھنڈا پانی اہتمام سے رکھا جاتا۔ برف بھی منگایا جاتا۔تخم بالنگہ کا شربت اور ٹھنڈا پانی پینے میں بہت لطف آتا۔ ماں باپ کے گھر زندگی قدرے تنگی سے گذاری اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد بھی روپے کی کبھی ریل پیل نہیں ہوئی۔ جائز ضرورتیں پوری ہوتی رہیں لیکن تمول، افراط اور آسائش کی سرحدوں میں کبھی قدم نہیں رکھا۔ وہ گھمنڈ، وہ بے حسی اور خلق خدا سے علیحدگی جو دولت کی افراط سے آتی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اس سے محفوظ رکھا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ تھوڑی سی بھوک رہ جائے اسی وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لو۔ یہ ارشاد صرف جسمانی صحت کی خاطر نہیں کیا گیا اس میں ضبط نفس اور خود نگہداری کا راز بھی پوشیدہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ اتنا ہو کہ بنیادی اور اہم ضرورتیں کھینچ تان کر پوری ہوجائیں اور کچھ ضرورتیں پوری نہ بھی ہوسکیں۔ اگر سب ضرورتیں آسانی سے پوری ہونے لگیں تو وہیں سے فساد سر اٹھاتا ہے۔

۱۹۴۱ء میں انگریزی ادب سے ایم اے کیا اور سرسید ویسٹ سے آفتاب ہال میں منتقل ہوگیا۔۱۹۴۲ء میں فارسی میں ایم اے پریویس کیا: فارسی میں ایم اے کی تکمیل ۱۹۴۷ء میں دوران ملازمت ہو پائی۔ ۱۹۲۸ء میں بھائی جان (سید محمد) نے علی گڑھ میں داخلہ لیا تھا۔ ہاکی اورفٹبال میں یونیورسٹی کلر اور جغرافیہ میں بی اے آنرز کی ڈگری لے کر انہوں نے یونیورسٹی چھوڑ دی۔ جانے سے پہلے مشعل، بھائی صاحب (سید مصطفٰے) کو دے گئے۔ میرا داخلہ ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ ہاکی اسٹک ساتھ، جلوت وخلوت کی رفیق ، بالآخر یونیورسٹی ٹیم میں آگیا۔ کیا ٹیم تھی ایسی فارورڈ لائن چشم فلک نے نہیں دیکھی۔ دائیں سے بائیں جانب عباسی، ناصر، شکور، یٰسین، دلبر۔ ربط باہم کا یہ عالم جیسے ایک گھڑی کے سب کل پرزے ہوں۔ بال لے کر آگے بڑھتے تو ایسا لگتا جیسے بحر اخضر میں تیرتے ہوئے جارہے ہوں۔ اللہ اللہ، تیز خرامی میں جسم، ذہن اور نظر کا وہ تعاون ، وہ اشتراکِ عمل، وہ حسنِ ارتباط، کلائی اور کمر کی جنبش میں نیم رقص کا انداز۔ ٹیم کے افراد کیا تھے، ایک حسین اور صحت مند جسم کے اعضاء تھے جنہیں نام ہی کے لئے الگ سمجھو! ساعد وبازو کا سحر، پیچ وخم کی دل آویزی، فریق مخالف کو پے درپے فریب، لاریب کہ ہاکی میں

حسن فریب اور اعجاز کمال شکور پر ختم ہوگیا۔ صاف ستھری، پاکیزہ وتوانا، تیز گام اور پرمغز ہاکی کا معیار بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے قائم کیا تھا۔ بڑے بڑے فل بیک اپنی اسٹکوں کی دھار تیز کرتے رہتے تھے، ہمارے چھریرے بدن کے شکور پر حملہ کرنے کے لئے۔ ان تیاریوں اور خونخواریوں کا جواب اس حسین چہرے پر ایک پرسکون اور پر اعتماد تبسم ہوتا تھا۔ چٹانوں کے درمیان سے وہ سمندر کی لہروں کی طرح نکل جاتا، رفتار میں شکور سے تیز اور 'ڈی' میں اس سے بھی زیادہ موثر رائٹ ان ناصر تھا جو جسم کی ایک لپیٹ میں پچیس تیس گز کا فاصلہ طے کرلیتا تھا۔ شکور کی طرح ناصر بھی حسن و جمال کا پیکر تھا۔ ممبئی کسٹمس میں پہنچا تو چہرہ کا حسن اسے لے ڈوبا۔ ڈیفنس کی یلغار کو جو خاطر میں نہ لاتا تھا، پریوں کی یورش سے خود کو بچا نہ سکا۔

صاف ستھرا، نفیس، لطیف اور پرمغز کھیل علی گڑھ کا شعار تھا، جسے نقطہ عروج تک شکور نے پہنچایا! یہ ٹیم جہاں بھی گئی سرخرو ہوکر لوٹی۔ ۱۹۴۱ء میں انٹرورسٹی ٹورنامنٹ ہوا علی گڑھ میں، سوئمنگ باتھ کے پاس سبزہ پوش میدان میں۔ چوتھے دن فیصلہ ہوا۔ میں رائٹ ہاف کھیل رہا تھا اور سابقہ صوبہ سرحد کے برق رفتار لیفٹ آؤٹ شہزادہ خرم سے تھا۔ میں کیا میرا کھیل کیا لیکن جمال ہمنشیں گل کھلا کر رہتا ہے چنانچہ خرم چاروں روز ناشاد نظر آیا۔ آخری روز ایک گول سے فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔ ٹور پر جاتا ایک ہاتھ میں اسٹک ہوتی ایک ہاتھ میں کتاب ''بات انمل بے جوڑ سی'' تھی، جب کبھی وقت مل جاتا پڑھ لیتا۔ آخری سال مجھے کلر عطا ہوا۔ کلر کا وہ گلوبند میں نے بھائی جان کی خدمت میں پیش کردیا جنھوں نے مجھے مار مار کر ہاکی سکھائی تھی اور مضبوط بنایا تھا۔ ان کا یہ احسان کہ ہاکی کی لگن میرے دل میں پیدا کردی کبھی نہ بھولوں گا۔ یہ کلر جناح صاحب کے ہاتھوں سے مجھے ملا تھا۔

عباسی کو موسیقی میں دخل تھا۔ ٹور پر ہاکی اسٹک کے ساتھ ہارمونیم بھی جاتا (قوت روح کا سامان، اساتذہ کی غزلیں اور عباسی کا لحن، سماں بندھ جاتا......) **مسعود زیدی** اور **فقیرے خان** نے علی گڑھ کے لئے ایک اساطیری حیثیت اختیار کرلی تھی۔ فقیرے خان نام کے گیمس سرونٹ تھے، ہاکی کے کرتا دھرتا وہی تھے، کھیل کی باریکیاں کوئی ان سے سیکھتا۔ انہیں یاد رہتا کہ پرانے میچوں میں کس کس نے کس کس انداز سے گول کیا۔ ہم جہاں بھی گئے اولڈ بوائز نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ایك تصویر: هم لوگ دلی میں اورنگ زیب روڈ پر غلام محمد صاحب كے یهاں ڈنرپر جارهے هیں۔

ایك اور تصویر: گومتی پار نئے حیدرآباد میں شمیم اور **انور كے مصنف فیاض علی** صاحب كے ساتھ محوِ طعام وكلام هیں۔

یونیورسٹی کے فرزندوں کی اِس سے وابستگی علی گڑھ کا نشانِ امتیاز رہی ہے۔فقیرے خان سناتے تھے کہ معرکے کے میچوں میں بارہا ایسا ہوا کہ ایک ایک رات پہلے سے نہ صرف بے شمار عام مسلمان بلکہ بہت سے متقی اور پرہیز گار لوگ جنھیں ہاکی سے کبھی کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور جو اِسے لہو ولعب سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے، ساری رات مصلّے پر گذار دیتے ۔ دعا یہ ہوتی کہ پروردگار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جِتا دے۔ رو رو کر دعا مانگتے ہوئے اُن بزرگوں کی داڑھیاں تر ہوجاتیں۔ اللہ اللہ، علی گڑھ سے مسلمانوں کو کیسی وابستگی تھی، ''تھی'' کیوں ہے اب بھی ہے۔ اُن لوگوں کا دل کتنا بڑا ہے۔ کتنے سادہ لوح ہیں یہ لوگ، محبت دینے میں پیش پیش! ہاکی کے علاوہ فقیرے خان کو جرّاحی اور طبّاخی میں بھی دسترس تھی۔ ہڈی بٹھانا، مرہم پٹی اور کڑا میچ جیتنے پر بطور انعام کام و دہن مرغ مسلم ایسا تیار کرنا ۔

ہاکی کی داستان بہت طول پکڑ گئی چونکہ میرے لیے لذیذ تھی لہذا اس نے اطناب کی دلنواز راہ اختیار کی ! کھیل کے میدان کو چھوڑیے خانۂ خدا کی طرف آیئے۔ کتنی حسین وجمیل ہے یونیورسٹی کی جامع مسجد۔ کتنی صاف ستھری ، کیسی پاکیزہ، جاڑوں میں فجر کی نماز میں عجب سماں ہوتا تھا جو کبھی کبھی مکدّر ہوجاتا تھا جب امامت کا قرعہ ایسے بزرگ کے نام نکلتا جن کی آواز پر نَعیبُ غراب البین کا گمان ہوتا تھا۔ موصوف کو گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں جس قدر ذوقِ عبادت اور شوقِ امامت عطا کیا ہے اُس حد تک اُنھیں صوتی حسن سے نہیں نوازا ستم یہ کہ مقتدیوں میں ذوقِ نغمہ کم پاکر امام صاحب نوا کو تلخ تر کردیتے تھے آواز بلندی کی تاب نہ لاتی اور گلا پھٹے بانس کا سا کام کرنے لگتا۔ شرمندہ ہوں کہ اُن کی قاریانہ کاوشیں مجھ پر رائیگاں گئیں۔ میرے سامعہ کو اُن کی آواز سے للّٰہی بغض ہوگیا تھا۔ دینیات کی بدولت مولانا **سلیمان اشرف** کی شاگردی میسر ہوئی **مولانا شیث** کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُن کا چہرہ شرافت اور پاکیزگی کے نور سے درخشاں تھا خیر کے اِس مقام پر شیث صاحب پہنچ گئے تھے جہاں نگاہ

اپنی خوبیوں اور دوسروں کی خامیوں سے بے نیاز ہوجاتی ہے۔ مولانا سلیمان اشرف اپنی عظمت سے ناواقف نہ تھے، نہ دوسروں کی خامیوں سے ۔ ہم ہیچ مدانوں کو دینیات کیا پڑھاتے تھے فصاحت و بلاغت کا دریا لہریں لیتا تھا۔

اب ذکر شاعری کا ہوجائے۔ ایک زمانہ میں یونیورسٹی کا مشاعرہ غالبًا ہندوستان کا بہترین مشاعرہ ہوتا تھا۔ جب مَیں پہنچا تو یہ روایت ختم ہوچکی تھی۔ میرس ہال کے مشاعرے میں جاں نثار اختؔر نے اپنی نظم ''گرلس، کالج کی لاری'' سنانا شروع کی۔ ایک خاتون نے سرِ محفل ٹوکا کہ بند کیجیے اور شاعر کو خاموش ہونا پڑا۔ اُن دنوں شکیؔل بدایونی اور رازؔ مرادآبادی کا طوطی بولتا تھا۔ ایسے کسی مشاعرے میں جس میں مجاؔز کلام سنارہے ہوں شریک نہ ہوسکا۔ سب سے بڑی محرومی یہ کہ اقباؔل اس زمانہ میں علی گڑھ نہیں آئے جگؔر آتے تو کچھ نشستیں ہوجاتیں۔ میں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ البتہ **کمال اتاترک** پر ایک نظم ضرور پڑھی جو جلسہ اسٹریچی ہال میں منعقد کیا گیا تھا!

اربابِ حل وعقد کی طرف آیئے۔ ہمارے وائس چانسلر ڈاکٹر **ضیاء الدین** نے علی گڑھ کی وہ خدمات انجام دیں جن کا اعتراف نکتہ چینی کی شکل میں کیا گیا۔ جن خدمات کی بدولت اُن کو علی گڑھ میں سرسیّد کے بعد جگہ ملے ۔ اُن کی پُرسکون گھبراہٹ علی گڑھ والوں کے لیے لطیفے فراہم کرتی رہی ۔''نسیان'' کا ماسک وہ حسبِ ضرورت پہن لیا کرتے تھے۔ وضع قطع میں قدرے اول جلول انداز تھا۔ اُن کے پاس جزئیات اور فضولیات کے لیے وقت کہاں تھا۔ پھر یہ وضع قطع معاون ہوتی تھی بدحواسی، دماغ کی غیر حاضری اور نسیان کے تاثر کی تعمیر میں، جس سے اُن کے بہت سے کام نکلتے تھے۔ بذلہ سنجان علی گڑھ نے اُن کی فیاضی معکوس کے متعلق روائتیں گھڑ لی تھیں۔

مجھے ایک بار اتفاق ہوا ٹرین کے اُس ڈبے میں سفر کرنے کا جس میں وائس چانسلر صاحب تشریف لے جارہے تھے۔ علی گڑھ سے دہلی۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ عین اُس وقت جب آفتاب نصف النہار پر تھا، ڈاکٹر صاحب نے رضائی تان لی اور خوابوں کے جزیرے میں پہنچ گئے۔ دس منٹ کے بعد اُٹھ گئے بالکل تازہ دم اور شگفتہ۔ مجھے ایک اور ثبوت مل گیا، اِس فردِ جرم کی تائید میں، جو اُن پر لگائی گئی تھی۔ یعنی اُن کی گھبراہٹ اور بدحواسی مصنوعی تھی۔ جو

شخص نیم روز میں ٹرین کے ہنگامے میں سکون کے ساتھ گہری نیند سوسکتا ہو اور حسبِ ارادہ اُٹھ سکتا ہو اُس کی یکسوئی اور خاطر جمعی پر کون شبہ کرسکتا ہے، کیا عجب کہ اُن کی دانستہ فراموشی اور غائب دماغی اہلِ غرض سے دفاع کے علاوہ نیند کی طرح دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کو اور تابناک کرنے کا وسیلہ رہتی ہو!

ڈاکٹر ضیاء الدین کا اوّل و آخر، ظاہر و باطن، دین و دُنیا سب علی گڑھ تھا۔ اُن کا ذہن ہر وقت اِسی اُدھیڑ بُن میں رہتا تھا کہ کس طرح آسمان سے تارے توڑ لائیں اور یونیورسٹی کے کُلّہ و دستار میں ٹانک دیں۔ یونیورسٹی کے لیے چندہ کی اپیل کرتے ہوئے وہ جہاں پہنچ جائیں ہُن اُن پر برسنے لگتا۔ انجینئر نگ کالج اُنھوں نے اسی طرح شروع کیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی شخصیت جتنی پیچیدہ اور گنگا جمنی تھی، اُتنی ہی سادہ اور کھلی کتاب سر شاہ سلیمان کی شخصیت تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کو ریاضی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، سر شاہ سلیمان کو طبعیات میں۔ غضب کے جامع حیثیات انسان تھے۔ قانون، طبعیات، زبان و ادب پر حاوی۔ الہ باد ہائی کورٹ میں اُن کی تجویزوں کی دھاک تھی۔ فیڈرل کورٹ کے لیے چنے گئے وہیں سے وائس چانسلر کے فرائض ادا کرنے علی گڑھ آتے، دفتر کے کمرے میں ٹھہرتے، ڈائننگ ہال سے کھانا خرید کر کھاتے رات گئے تک کام کرتے، ہم لوگ ''پکّی بارک'' سے اس روشنی کی طرف عقیدت اور محبت سے دیکھا کرتے جو اُن کے کمرے سے چھن چھن کر آتی۔ اُن کی پاکیزہ، متمول اور متحرک شخصیت کی تابانی نگاہوں کو خیرہ کرتی، مسجد میں نماز پڑھنے آتے۔ سر شاہ کی ہشت پہلو اور پاکیزہ شخصیت، روشن ذہن، صبیح چہرہ اور صائقہ پیکر جسم و دماغ، اُس دور کی دلکش یادوں میں شامل ہیں۔ جو امتیازات شاہ سلیمان نے حاصل کئے اور جو خدمت وہ کرسکے اُس سے کہیں زیادہ کے امکانات ناوقت موت کے ہاتھوں مسمار ہوگئے۔ داغ ہائے سینہ کو کرید کر دیکھیے تو سب سے گہرا زخم اُن کی موت کا لگا! حلیم صاحب ہمارے پرو وائس چانسلر تھے A-B-A-Haleem تسمیہ کا رازِ علی گڑھ اُنھیں ابّا حلیم کہتے تھے انھوں نے حق بھی ادا کردیا، ایک شفیق لیکن کڑی نگاہ رکھنے والے باپ کا۔ اُن کو میں نے کسی قدر قریب سے دیکھا کیونکہ وہ ایک عرصہ ہاکی کلب کے صدر رہے۔ کرکٹ کا کھیل میری فہم سے باہر تھا، سنتا تھا کہ ٹیم اچھی ہے، سرحد، پنجاب اور کشمیر کے لڑکے صحت و صباحت و شگفتگی اور جامہ زیبی کا مرقع تھے۔ سیاہ شیروانیوں میں سرخ و

سفید رنگ اور کھل جاتے تھے، سیاہ شیروانی اور علی گڑھ قطع کے سفید پاجامے اپنے مجموعی جمال کو بروئے کار خصوصاً جب لاتے جب '' ولنگڈن پویلیون'' میں کرکٹ کا میچ دیکھنے جمع ہوتے۔ یا جب یونین ہال میں کسی ہر دل عزیز مہمان کی پذیرائی یا مباحثے کے کسی مقابلے کا اہتمام ہوتا۔ گمان ہوتا تھا کہ خوش قامتوں، خوش جمالوں ، خوش پوشوں کا ایک لشکرِ جرّار ہے اور چہرے، نیزے اور وردیاں سورج کی کرنوں یا قمقموں کی روشنی میں چمک رہی ہیں۔ اس سے کم دلنواز نہ ہوتا تھا وہ منظر جب علی گڑھ کے سبز پوش شہ سواروں کا دستہ کسی مہمان عزیز کے جلو میں اسٹیشن سے یونیورسٹی تک آتا۔

طلبہ امن پسند تھے اور خود یونیورسٹی کے اندر کھیلوں مباحثوں، مشاعروں ، سیمیناروں اور گونا گوں تقاریر کا سلسلہ اُنھیں اربابِ اختیار سے ٹکر لینے سے روکتا تھا اور اساتذہ سے وابستگی اور اُن کا احترام ، طلبہ کی خوش اطواری اور نظم کا ضامن تھا۔ طالب علم بالعموم شگفتگی، شائستگی ، خوش اطواری، خود اعتمادی اور اقدامیت کے لیے معروف تھے،لطیف مزاح میں اُنھیں ہمیشہ دخل رہا ہے اور چسپاں ہوجانے والی حکایتیں اور پھبتیاں اُن کے نوکِ زبان رہتیں۔ رازؔ مرادآبادی سے اُنھیں ممتاز کرنے کے لیے ایک دوسرے ساجد علی خاں کا تخلص ہم نشینوں نے ''کوفتہ'' رکھ دیا، (جسم فربہی پر اُتارو تھا) جمیل کوا، جمیل بلبل انگریزی کے شعبہ میں ایک مشہور سینئر لیکچرر تھے محمود صاحب جو انگریزی الفاظ کے تلفظ میں قاریانہ حجم کے ساتھ معمول سے زیادہ کاوش کرتے تھے، اُن کو قاری کا خطاب عطا ہوا۔ یہ اسماء دلدل صفت تھے جتنا زور لگائیں آپ اِن سے نجات پانے کے لیے، اُتنی ہی اُن پر آپ کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی تھی۔ نام سے بھی زیادہ چسپاں ہونے والی وہ حکایات تھیں جو اختراع کی جاتی تھیں۔ اُس اختراع کے ہدف کی شخصیت، عادات و اطوار، افتادِ طبع کو پہلے ریسرچ کا موضوع بنایا جاتا اُس کے بعد انتہائی حقیقت مندانہ انداز سے اُن پر حکایت چست کی جاتی۔ اسے میرے حافظے کی کمزوری کہیے یا خشک مزاجی کہ اِن ذخائر سے اب تہی دامن ہوں۔

ڈاکٹر ہادی حسن کی شخصیت بہ ہمہ وجوہ جاذب تھی۔ کشیدہ قامت، چھریرا جسم، صبیح ، شریر، مسکراتا ہوا چہرہ، ایرانی خدو خال رگوں میں ایرانی خون دوڑ رہا تھا، انگریزی اور فارسی میں خطابت کا وہ انداز کہ انجمن مسحور! فصاحت و بلاغت کا بحرِ زخّار، حافظہ بے کراں، ذہن برّاق،

شگفتگی بے اماں، شوخی قاتل! مجھے اُن سے فارسی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اور مجھے اُن کی اس تحریک سے بھی فیض پہنچا جو اُنھوں نے مقابلے کے امتحانوں میں علی گڑھ کے طلباء کو تیار کرنے کے لیے شروع کی تھی۔ فارسی کے پرچوں کی اُن سے بہتر تیاری کون کرا سکتا تھا۔ لازمی مضامین کے لیے یہ طریقہ کار اختیار کیا تھا کہ لیلائے سِول سروس کے عاشقوں کے ہجوم کو ساتھ لیا اور پہنچ گئے پروفیسر فیلڈن کے پاس، جنرل انگلش اور Essay کے لیے تیاری کا کام اُن کو سونپ دیا ہندستان بھر میں، کوئی شخص ایسا نہ تھا جو یہ کام پروفیسر فیلڈن سے بہتر انجام دے سکتا۔ دوسرے روز ہم میں سے کسی کی کمر یا گردن میں بانہیں ڈالیں اور شعبۂ فارسی کے سامنے جو لان ہے اُس پر ٹہلاتے رہے، پھر اپنی ٹولی لے کر پروفیسر حبیب کے گھر پر جا کر دستک دی۔ کہا کہ معلوماتِ عامّہ کی تیاری آپ کو کرانی ہے، وہ بھی بغیر چوں و چرا کے تیار ہو گئے۔

اِسی طرح ایک روز پروفیسر محمد شریف کے یہاں ہمارے یوسفِ با کارواں نے یلغار کی۔ اُن کو یہ کام تفویض ہوا کہ انٹرویو کے لیے ہماری تربیت کریں ہماری رفتار، نشست و برخاست، بات کرنے کے انداز کو درست کریں۔ شریف صاحب فوراً تیار ہو گئے، کیا اہتمام تھا اُس ریہرسل کا اور کتنی قابلِ قدر تھی وہ رہبری، جن لوگوں نے اُردو لی تھی ہادی حسن صاحب کی بدولت، رشید صاحب نے اُنھیں اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ ڈاکٹر ہادی حسن کی کوشش بہت جلد بار آور ہوئی اور آئی۔ سی۔ ایس اور پراونشل سروس میں کئی سال علی گڑھ کے طلباء سرخرو ہوئے۔ جو دلچسپی اُن اساتذہ نے اُس مہم میں لی اِس کا دسواں حصہ بھی علی گڑھ کے موجودہ اساتذہ دکھائیں تو امتحانوں میں ہماری کامیابی کا نقشہ ہی بدل جائے۔

شعبۂ فارسی میں دوسرے دیوقامت استاد ضیاء احمد بدایونی تھے، اُن کا تقویٰ اُن کے تبحُرِ علمی کا حریف رہا۔ فارسی ادب پر اُنھیں حیرت انگیز عبور تھا، مزاج میں بے حد سادگی، انتہائی انکسار اور رفتار وگفتار میں غیر معمولی احتیاط۔ ڈاکٹر ہادی حسن ایرانی النسل تھے، فارسی ادب پر اُنھیں وہ قدرت نہ تھی جو ہمارے پیادہ رَو بدایونی عالم کو تھی۔ تلمیحات، اصطلاحات اور استعارات کی گتھیاں اُن کا ناخنِ علم چشمِ زدن میں سلجھا دیتا تھا، اُن کی سادگی ، استغنا، حفظ و وضع نے علم کے وقار کو برقرار رکھا اور اِسے دُنیاوی، کرّ وفر اور نام ونمود کے سامنے جھکنے نہ دیا۔ عزتِ نفس اور صحتِ اقدار کی نہ معلوم کتنی شمعیں اس شمع سے جلیں۔ اِس ذرّۂ ناچیز پر بھی اِس

آفتاب کی کرنیں پڑیں اِسے میں ہمیشہ سرمایۂ سعادت سمجھوں گا۔

پروفیسر فیلڈن کیمبرج میں پروفیسر رہ چکے تھے، یہ نیک نہاد اور فاضل پروفیسر قدیم انگریزی پر سند کا درجہ رکھتا تھا۔ نہ حکومت کی رعونت نہ علم کا غرور، غالبًا "Chase" میں رہتے تھے، شاگردوں کو چاء پر بلایا کرتے تھے، ہمارے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے، مشفقانہ برتاؤ سے بے تکلف ہونے پر مجبور کر دیتے، غریب طالب علموں کی مدد کرتے تھے، اُن کا ذکر کرتے ہوئے میری آنکھیں نم ہوگئیں، چاسر کو اُن سے بہتر پڑھانے والا شاید رُوئے زمین پر نہ تھا، اُنھوں نے Samuel Pepys کا روزنامچہ ایڈٹ کیا تھا اور تلخیص Precis پر ایک کتاب لکھی تھی۔ انگریز اور کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر ہونے کے باجود اُنھیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا ان مسائل پر خواجہ منظور حسین سے رجوع کرنے میں جو اُن ادوار سے جو خصوصاً Augustans and Romantics سے متعلق تھے۔ اس وابستگی کا اندازہ جو اُن کے شاگردوں کو پروفیسر فیلڈن سے تھا، اُس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انٹر ورسٹی میچ کے دوران میں میرا حوصلہ دوگنا ہوا جب مجھے تماشائیوں کی بھیڑ میں پروفیسر فیلڈن کی جھلک نظر آئی۔ آئی۔سی۔ایس کے لیے مضمون کے پرچے کی تیاری میں پروفیسر فیلڈن کی اصلاحی سرخی عنوان حیات بن گئی۔ وہ جو اصلاح دیتے تھے وہ بڑی خموشی سے مضمون کی سطح کو مرتفع کر دیتی تھی......!

اُن کے رفیقِ کار خواجہ منظور حسین میں ظاہر و باطن کے اَن گنت شمایل جمع ہو گئے تھے۔ خدو خال کے علاوہ حسنِ اطوار و گفتار سے بھی متصف تھے۔ بہ یک وقت اُردو، انگریزی اور فارسی ادب پر خواجہ صاحب جیسا عبور میں نے آج تک کسی فرد میں جمع نہیں پایا۔ اُن کی حسین، کوثر و تسنیم میں نکھری ہوئی شخصیت، جامہ زیبی، خوش لباسی، سنجیدگی، وقار، شائستگی اور حیا خواجہ صاحب کے شاگردوں کو کبھی نہ بھولے گی۔ گفتگو خواہ انگریزی میں کر رہے ہوں خواہ اُردو میں الفاظ ایسے استعمال کرتے جس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتے۔ طرزِ ادا کی لطافت، ندرت، معنویت اُن کی تحریر و تقریر دونوں کو امتیاز بخشتی تھی، انگریزی کی اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ میں پائی تھی، زبان اور لب و لہجہ پر وہاں کی گہری چھاپ تھی، اُن کے لیکچر خود ادب پارے ہوتے تھے جن سے اسلوب نگارش کے لیے نئی نئی راہیں نکلتی تھیں۔ اُن کا ذوق کیتھولک یا وسیع الظرف تھا جس میں ادب کے متنوع دبستانوں کی روح سمائی تھی۔ وہ اُردو ادب میں سماجی شعور پر ایک مہتم

بالشان کتاب کی تیاری کررہے تھے جو ہماری تنقید میں عہد آفریں ہوتی۔ افسوس کہ مسودہ غائب ہوگیا، تقسیم کے ہنگامے میں اُن کے دل پر کیا گذری ہوگی جب اُن کے شاگردوں کے دلوں میں بھی اُس نقصان کی ٹیس اب تک اُٹھتی ہے۔

خواجہ صاحب پروفیسر شریف کے داماد تھے ، دونوں اِس خوبصورت کوٹھی میں رہتے تھے جس کا نام''گلفشاں'' تھا۔ اُس گھر میں رہنے سہنے کا انداز'مغزل' تھا۔ یہ مکان حسن ونفاست کا گہوارہ تھا اور''شریف زادیاں'' خود جمال پیکر! اُس زمانے میں خواجہ صاحب کے معیار بودو باش کو کبھی اُن سے قرب میں حائل نہیں پایا، لیکن اب یہ خیال دل میں آتا ہے کہ ہمارے ملک میں کسی انسان کے گردو پیش حسن کی یہ فراوانی اور معیشت کے معیار کی یہ بلندی اور ذوق کی یہ لطافت و نفاست اُسے عوام سے الگ کردیتی ہے۔ اور خواجہ صاحب عوام میں سے تھے کب: خاص الخواص اور عین الاشرف تھے۔ اور یہی اُن کی کمزوری تھی۔ لیکن یہاں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ خواجہ منظور حسین کی بنیادی انسانیت، حفظ وضع اور شرافتِ نفس پر اِس رشتے سے آنچ آئی: نہ تمول اور نفاست سے، نہ اس حسین تصنع سے جسے وہ اپنے گرد و پیش پاتے تھے، نہ اِن بلند پایہ علمی اکتسابات سے جو اُن سے منسوب کئے جاتے تھے، اُنھوں نے افلاس کو کبھی تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا نہ کبھی سادگی پر چیں بہ چیں ہوئے، اُن کی جیسی شخصیت کو خلوص اور استقامت نے توانائی بخشی تھی! کردار کی صالحیت کا جہاں تک تعلق ہے خواجہ منظور حسین کسی درویش سے کم نہ تھے اور یہی اُن کی طاقت کا راز تھا۔ اُس وقت سے اب تک نہ معلوم کتنے ادیب اور نقاد''بالا خانوں'' پر مختلف عنوانوں اور سیڑھیوں سے پہنچ گئے ہیں۔ بکنے کے لیے یا بکنے کے بعد۔ خواجہ صاحب کے متعلق ایسا گمان بھی کیا جائے تو تخیل کے پر جل جائیں۔ اُن کے حسنِ صورت اور حسنِ فکر کو قوت اور ٹھہراؤ حسنِ سیرت سے ملا تھا۔ مخمل کے دستانے کے نیچے فولاد کا ہاتھ تھا جو ہر قسم کی ترغیبات سے پنجہ لے سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کے شاگرد اُن کے پرستار بھی تھے۔ اور اب بھی اُن کی یاد کی آگ کو سینے میں دبائے ہوئے ہیں۔ میری اُن سے ملاقات آخری بار کراچی کے ائر پورٹ پر ہوئی تھی محض اتفاقاً ، اُن سے یہ معلوم کرکے دھکا لگا کہ فیلڈن صاحب اِس دُنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔

مختار حامد علی، ہم لوگ اُن کی قابلیت کے معترف تھے، صحت کمزور تھی لیکن جب لیکچر

دیتے تھے تو نہ معلوم کہاں سے توانائی آجاتی تھی، لیکچر اتنا دل آویز کہ ہم سب مبہوت ہوکر سنتے۔ ہارڈی اُن کا محبوب ناول نگار تھا یہ بھی اپنی جگہ قطب تھے، کلبیت نے اُن کی طنز کی دھار کو تیز کردیا تھا، لیکن طنز میں نہ حقارت تھی نہ تلخی۔ لیفٹننٹ حمید الدین کی پابندیٔ وقت اُن افسروں کی سی تھی جن کی ساری زندگی فوج میں گذری ہو۔ فارسی عبارات کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے، حاذق صاحب وجیہ، خوش پوش اور خوش گفتار تھے بذلہ سنجی اُس پر مستزاد، شعر بھی کہتے تھے۔ عربی کے شعبے کے صدر عبدالعزیز میمن تھے ہمیں اُس وقت اندازہ نہ ہوا کہ ہندستان میں عربی دانی میں اُن کا کوئی حریف نہ تھا، عربی ادب کی جزئیات پہ گہری نظر تھی، شاید اِس لیے لوگ اُنھیں جُورس کہنے لگے تھے۔

ایک بزرگ ڈاکٹر منصور تھے جو کئی دوسرے اساتذہ کی طرح جرمنی کی یاد کو شریکِ حیات کی شکل میں پہلو سے لگائے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے عام طالب علموں کو عربی پڑھانا شروع کیا تھا، مجھے بھی کچھ دن کے لیے اُن کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا ہم لوگ فلسفے کے اُستاد ڈاکٹر ظفرالحسن کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ کیمسٹری کے اُستاد کیپٹن حیدر خان (جن کی بیگم صاحبہ نے گرلس کالج کو ایک عرصے قابلیت سے چلایا)۔ فرد نہیں ادارہ تھے!

اُردو کے شعبے سے میرا تعلق پارٹ ون کی حد تک تھا، اب محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ صدر رشید صاحب تھے اسٹاف کے اراکین میں احسن مارہروی، آل احمد سرور اور ظہیر الدین علوی تھے۔ علی گڑھ کا نام لیتے ہی رشید صاحب کی متمول شخصیت اپنے سارے فسوں کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ رشید صاحب بجائے خود ایک جہان ہیں، ایک ادارہ ہیں، ایک انجمن ہیں۔ وہ اس تمدن، اس شائستگی، اُن روایات، اس یگانگت کا مرقع ہیں علی گڑھ جس سے عبارت ہے۔ سر سیّد کے علاوہ اگر کسی فرد کی تصویر کو علی گڑھ کا عنوان دیا جاسکتا ہے تو وہ رشید صاحب ہیں۔ اس بحث میں نہ پڑیئے کہ فنکار بڑا ہوتا ہے یا اس کی تخلیقات، رشید صاحب کی فکر انگیز ظرافت اُردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہے لیکن خود ان کی شخصیت کا تمول پوری طرح اُن کی تصانیف میں منعکس نہ ہو پایا۔ شگفتگی کا یہ عالم کہ بات کرتے ہیں تو منھ سے پھول جھڑتے ہیں اور نظر اتنی ژرف بیں۔ کہ محاسن و مطالب تک ایک پل میں پہنچ جائے۔ اُن کی ظرافت ایک نقاب ہے سنجیدہ مطالب کے چہرے پر، اور اُن کی شگفتگی انسانیت کے اس درد کی غماز ہے

جو اُن کی متاعِ حیات ہے۔

اُن کے دھیمے لہجے میں بلا کا زور ہے اور اُن کے لطیف طنز کی ہلکی پھلکی سطح کے نیچے جذبات و مفاہیم کا ایک دریا موجزن ہے۔ رشید صاحب حسن کے پرستار ہیں، اُن کا گھر چمن زار ہے۔ جہاں کہیں سے گلاب کی کسی نئی قسم کی اطلاع آئی، اُنھوں نے اپنے چمن کی زینت بنانے کے جتن کیے۔ ان کی تقریر وتحریر میں نقطۂ نظر کی جو شگفتگی ہم دیکھتے ہیں، کیا عجب کہ وہ اُنھی گلابوں کی دین ہو۔ میں ۱۹۲۸ء سے اُن کا ذکر سنتا چلا آرہا تھا، بھائی جان چھٹیوں میں گھر آتے تو پروفیسر حبیب کا ذکر کرتے یا پروفیسر رشید احمد صدیقی کا۔ اُنھوں نے دیوانِ غالب رشید صاحب سے پڑھا تھا اور کہیں کہیں رشید صاحب کے بتائے ہوئے معنی بھی لکھ رکھّے تھے۔ اِس نسخے کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہوں۔ پارٹ ون میں دو ایک بار رشید صاحب پڑھانے آ گئے تو ہماری عید ہوگئی، مقابلے کی تیاری کی تو مضامین اُن کو دکھانا شروع کیے، یونیورسٹی سے نکل آیا تو خط وکتابت کا بہانہ ڈھونڈتا رہا۔ ہمارے زمانے میں یونیورسٹی، رشید صاحب سائیکل سے آتے تھے!

آل احمد سرور کی اُٹھان کا وہ زمانہ تھا اُن کے لیکچر کو ہم سب ہمہ تن گوش ہوکر سنا کرتے تھے، آگے چل کر دُنیا نے اُنھیں صاحبِ طرز نقاد کی حیثیت سے جانا۔ شیخ رشید ہمیں مغل دور پڑھاتے تھے (میرے وارڈن تھے)۔ اُن کے لیکچر میں تاریخ اور ادب کا حسین اختلاط ملتا تھا۔ مضمون پر اتنا عبور، اظہارِ مطلب پر اتنی قدرت، اُن کی انگریزی پر ہم سر دھنتے اور اُن کی تاریخ دانی کو ہم خاموش عقیدت کا خراج پیش کرتے۔ وہ کوشش کرتے تو مؤرخوں کی محفل میں ممتاز جگہ پاتے۔

علی گڑھ نے سراسیمگی کو چھوڑ کر ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے۔ ریاضت، جدو جہد، تعمیر اور رجائیت کے دور میں۔ ضرورت ہے کہ افق کو وسیع کرنے اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی، ذہن اور نظر کے دریچوں کو کھولنے، تازہ ہوا کو راہ دینے اور اعتماد پیدا کرنے کی۔ یہ کام صرف اساتذہ کرسکتے ہیں۔ وہ یہ کرسکتے ہیں، میں یہ نہیں کہہ سکتا، اُن میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہے، یہ میں جانتا ہوں۔ یہ سطور ضائع نہ ہوں گی اگر موجودہ اساتذہ ان بزرگوں سے جن کو میں نے قریب یا دور سے دیکھا ہے اور جن کا ذکر میں نے ان اوراق میں کیا ہے۔

ہمت، ریاضت، ایثار اور ہمدردی کا سبق حاصل کریں، علی گڑھ کے معیارِ تعلیم کو بلند کریں، اُس کی ملک گیر حیثیت کو بحال کریں اور اُس کے طلباء میں علم کی جستجو، حوصلہ، عزتِ نفس، نظم و ضبط، فخر اور خوش اطواری کو فروغ دیں کہ بقا کے لیے آخری اُمید اب یہی ہے!

اگست ۱۹۴۲ء میں جب کہ ''ہندستان چھوڑو'' تحریک اپنے شباب پر تھی، یوپی سول سروس کا امتحان دیا اور اُس کے نتیجے میں ۶ رجون ۱۹۴۳ء کو ایک سوٹ کیس لے کر الٰہ آباد سے بجنور چارج لینے گیا اور سوتا ہوا منزلِ مقصود سے آگے نکل گیا۔

کھیل سے چند فائدے ہوئے ایک تو مقابلے کے جذبہ کو شہ ملی دوسرے حس کی تقریباً مریضانہ ذکاوت میں کمی آئی، پڑھائی کا اسیر ہونے سے چھٹکارا ملا اور زندگی میں ایک حد تک توازن آیا، جسم کو نشو ونما ملی، دست و بازو میں طاقت آئی، بیرون در کی کشش نے زندگی کو گھر سے باہر نکل کر دیکھنے کا موقعہ دیا؛ مل کر کام کرنا سیکھا اور سب سے اہم بات یہ کہ ہار اور جیت دونوں کو برتنے کے ڈھب آگئے۔

علی گڑھ پہنچ کر ہاکی میں مہارت بہت کام آئی۔سینئر ٹی دو تین سال جیت کر آگئی۔ یونیورسٹی کی سطح کے کھلاڑی کی اُس زمانہ میں بہت عزت ہوتی تھی۔ ملازمت شروع کی تو ٹینس بھی کھیلی، پر ہاکی کہاں چھوٹتی، بجنور، بلند شہر، دیوریا، کسیا، گورکھپور، نینی تال لکھنؤ ہر جگہ ہاکی کھیلی۔ اپنے ساتھی کچہری کے بابوؤں کی ٹیم بنا کر بڑے بڑے سورماؤں کو ہار کا مزہ چکھایا۔ کئی جگہ پولس والوں کو ہرایا۔ پہلا گول یوپی پولس نے کیا دوسرا ہماری ٹیم نے اُتار دیا، تیسرا گول ہمارے فارورڈ نے تختہ در تختہ شاٹ کے ساتھ کیا۔ سینٹر فارورڈ میں کھیل رہا تھا، جیت ہماری رہی، یہ میرا آخری اچھا گول تھا۔

پہلا تقرر بجنور ہوا۔ کلکٹر ایک بزرگ اور تجربہ کار سِولین خان بہادر سیّد احمد علی تھے۔ اُن کے قہقہوں سے کلب گونجا کرتا تھا، شفقت سے پیش آئے اور بیٹوں جیسا برتاؤ کیا۔ مَیں تنہا تھا، کلب میں رہتا تھا دو سیڑھیاں اترا اور ٹینس لان پہنچ گیا۔ مدارا الہام (مارکر) کریم تھے۔ ٹینس اور بلیرڈ میں طاق، یہ طبقہ اب فنا ہو رہا ہے، یہ لوگ بڑے نستعلیق، منتظم، ہمہ گیر، ہمہ جہت ہوتے تھے۔ خان بہادر احمد علی کو معلوم ہوا کہ مجھے ادب اور قافیہ پیمائی سے یک گونہ دلچسپی ہے کہا کہ ایک بڑا مشاعرہ اور ادبی کانفرنس کر ڈالو۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ اور الٰہ آباد جانا ہوا۔ سرتیج

بہادر سپرو، فراقؔ اور سید آل رضا سے ملاقات ہوئی اس اثناء میں سیّد احمد علی بیمار ہوگئے اور شیخ اکرام اللہ نے اُن کی جگہ لے لی۔ مشاعرہ بہت بڑے پیمانے پر ہوا بیشتر مشاہیر شعراء سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ سیّد رضا علی نے مشاعرے کی اور ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے ادبی کانفرنس کی صدارت کی۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی نے بھی میری خاطر قدم رنجہ فرمایا!

مرادآباد اور دیوریا میں انگریز کلکٹروں ہیگ ، ہارڈی اور ریڈی جی کا ساتھ ہوا۔ بلند شہر میں رام بابو سکسینہ کی کلکٹری کے دور میں شعرو شاعری کا دور دورہ رہا۔ یہاں نوب مرزا جعفر علی خاں اثر، کنور مہندر سنگھ بیدی اور جمیل الدین عالی وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ بلند شہر میں ساڑھے تین سال بلند شہر کلب میں گذارے۔ ٹینس اور ہاکی دل بھر کر کھیلیں۔ آخری چھ ماہ میں حالات بگڑے ہوئے تھے۔ گڑھ مکتیشور کے کشت وخون کے علاوہ بسوں اور ٹرینوں میں خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، بہ حیثیت مجسٹریٹ کے میری حفاظتی ڈیوٹی رات کو لگا کرتی تھی۔ بے نیازانہ سائیکل پر کلب سے چوک چلا جاتا تھا۔ رائے بہادر جگت نرائن بیدی نے کہا کہ پستول رکھ لیا کیجئے۔ اسے فرط اعتماد کہیے یا سادہ لوحی یا خامکاری، جواب دیا کہ مجھ سے کسی کو کیا شکایت ہوسکتی ہے۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے مجھ پر کوئی کیوں حملہ کرنے لگا۔ جہاں دیدہ رائے بہادر نے کہا اس وقت جنون کا عالم ہے لوگ آج کل کام پر جاتے نہیں ہیں۔ اس کے بعد دیوریا تبادلہ ہوگیا جو مجھے پسند نہیں آیا۔ چیف سکریٹری بھگوان سہائے سے جاکر شکایت کی کہ کیا میرے کام میں کچھ خرابی ہے جو مجھے اتنی دور بھیجا گیا ہے، ایسے ضلع میں جہاں تقرر کی تعبیر عقوبت سے کی جاتی ہے؟ انہوں نے سمجھایا یہ بات نہیں ہے۔ آج کل مغربی اضلاع میں مسلم افسروں کی جان کو خطرہ ہے۔ اسی ضلع سے اختر محمود خان اور خواجہ سعیدالدین احمد کا تبادلہ بھی کیا گیا ہے۔ علی الترتیب غازی پور،اور بلیا گیا۔ رمضان کا مہینہ تھا شاید گونڈہ پر سحری کھائی۔ آزادی سے ایک روز پہلے دیوریا پہنچا۔ ایک نہایت شریف النفس انگریز ریڈی جی کلکٹر تھا۔ (غالباً آخری یوروپین کلکٹر) دیوریا میں ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر رہا۔ وہاں سے دس ماہ میں ایس ڈی او کی حیثیت سے گیا جس کے پہلو میں کشی نگر ہے۔ جہاں مہاتما گوتم بدھ کا مہاپری نروان ہوا یعنی انہوں نے آخری سانس لی۔ اس استوپ پر جو ان کے جسد خاکی کو سپرد آتش کیے جانے کی جگہ بنا تھا ایک پیڑ میں ایک چینی بھکشو نے نشیمن بنالیا تھا۔ جب وہ پیڑ سے اترتا

لوگ اس کے لہجے اور زبان سے حظ اٹھاتے تھے۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں گورکھ پور تبادلہ ہوگیا ڈپٹی ریجنل فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے۔ مشرقی اضلاع میں غلہ کی خرید، نقل وحرکت اور گودام واجراء کے سلسلہ میں دورہ کرنا پڑتا تھا۔

ایک سال دھان کے بیج کی بڑے پیمانے پر خرید ہمارے سپرد ہوئی بہرائچ میں کترنیاں گھاٹ سے خرید کی گئی۔ ریجنل مارکیٹنگ آفیسر نے خریداری کرتے وقت نمونوں کو ٹھیک سے جانچا نہیں۔ بیج کی خریداری اس دفتر نے پہلی بار کی تھی اور وہ بھی بہت جلدی میں اور ہنگامی طور پر۔ اس غفلت نے فضا کو کچھ عرصہ کے لئے مکدر کردیا۔ ناتجربہ کاری غفلت کا باعث بن سکتی ہے جواز نہیں۔ دیوریا میں بھی ایک دشواری پیش آئی تھی۔ ریڈی جی کے بعد ٹھاکر راج کشور کلکٹر ہوئے، جن کی خوشنودی حاصل کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا جو لوگوں کو ہاتھ آگیا تھا۔ ان سے جاکر یہ کہنا کہ بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف آپ نے جو مہم چلائی ہے اس کے اثر سے کپڑوں کی نہ معلوم کتنی گانٹھیں دریا برد ہوگئی ہیں، ندیوں میں بہادی گئیں۔ آدمی ایماندار تھے اور انہوں نے چور بازاری کے خلاف جہاد کیا تھا۔ لیکن انا، خودستائی، بے صبری اور شک نے انہیں وہ کامیابی نہ ملنے دی جس کی مستحق ان کی کوششیں تھیں۔ ان کے احکام نادر شاہانہ ہوتے تھے۔ مجھ سے کہا کہ فلاں تاجر چور بازاری کرتا ہے۔ اس کا مال ضبط کیجئے اور بکوادیجئے۔ گورکھپور سے انہوں نے ایک صاحب کو جو ''نشیمن'' کے نام سے ہینڈ لوم کا ایک مرکز چلارہے تھے بلایا اور ذخیرہ اندوز موصوف کی گانٹھیں ان کے سپرد کردیں۔ انہوں نے ان گانٹھوں کو اونے پونے بیچ دیا اور واجبی سا حساب دیا۔ ذخیرہ اندوز انتظار کرتا رہا۔ ٹھاکر صاحب ریٹائر ہوئے اور اس نے ان پر اور مجھ پر اور حکومت پر نالش دائر کردی۔ عدالت میں حاضر ہوکر بیان دینا پڑا۔ فیصلہ بالآخر ہمارے حق میں ہوا۔ بال بال بچے ورنہ فیصلہ برعکس بھی ہوسکتا تھا۔

۱۹۵۱ء میں اس انتخاب کی بنا پر جو ۱۹۴۹ء میں ہوا تھا۔ آئی اے ایس میں شمولیت کے احکام آئے۔ کہا گیا کہ یہ ترقی بیوی کی قسمت سے ہوئی۔ شادی ۱۹۵۰ء میں بڑے دن کو ہوئی تھی۔ گورکھپور کے تقرر کا بڑا فائدہ یہ رشتہ تھا جو ''شریک حیات کے سات سالہ انتظار'' (میری ایک نظم کا عنوان) کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ثریا احمد حسین صاحب آئی اے ایس کی صاحبزادی اور مہدی افادی کی پوتی ہیں۔

مئی ۱۹۵۵ء سے جون ۱۹۵۶ء تک نینی تال میں ڈسٹرکٹ آفیسر (اے۔ ایم۔ انچارج) اور جون ۱۹۵۶ء سے جولائی ۱۹۵۷ء تک بلند شہر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر رہا۔

ابھی تک کیریر نسبتاً سکون و عافیت کے ساتھ جارہا تھا۔ سمندر کی سطح ساکن تھی۔ بلند شہر میں دوبارہ جب آیا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ اہل سیاست سے میرا یہ پہلا ٹکراؤ تھا۔ وہاں ایک پارلیمنٹری سکریٹری تھے بابو بنارسی داس جو چندر بھان گپتا کے دست راست تھے۔ ان کا طوطی ضلع اور گردونواح میں بولتا تھا۔ میری بود و باش اصول و انصاف کے جس نقار خانے میں تھی وہاں ان کی آواز سنائی ہی نہ دی۔ چنانچہ سڑک کے بیچوں بیچ دھماکے کے ساتھ تصادم ہوا۔ میں نے سفارش سننے اور مراعات دینے سے چھوٹتے ہی انکار کردیا۔ انہوں نے شور مچادیا کہ یہ شخص تو کانگریس کی جڑیں کاٹنے پر تلا ہوا ہے۔ حالانکہ میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ انصاف پسند اور بے لاگ حاکم حکومت کی جڑوں کو براہ راست اور برسر اقتدار پارٹی کی جڑوں کو بالواسطہ مستحکم کرتا ہے۔ بہر حال اپنی اپنی رائے ہے۔ موصوف عیب نکالنا چاہتے تھے، نظر نہیں آیا۔ کیڑے ڈالنا چاہتے تھے، نہیں ملے۔ ایسے موقعوں پر اہل سیاست آفات ارضی وسماوی کا انتظار کرتے ہیں۔ ہنگامی حالات ہوں گے تو انتظام میں کہیں نہ کہیں تو کسر نظر آئے گی، کھوٹ نکلے گا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، ۱۹۵۶ء کے اکتوبر میں زبردست سیلاب آیا۔ ہم لوگ کالی ندی کی طغیانی سے لڑرہے تھے (جو بلند شہر خاص کے پہلو سے گذرتی ہے) کہ جمنا، باڑھ پر آگئی۔ اس پر مستزاد زلزلہ۔ دیواروں کو پہلے پانی نے نرم کردیا پھر بھونچال نے انہیں ہلا کر گرادیا۔

بہر حال مخالفین کو زریں موقع ہاتھ آگیا۔ کہرام مچادیا کہ ضلع کو ''دیوی پرکوپ'' کا سامنا کرنا پڑا، کلکٹر صاحب نے کوئی فکر نہیں کی، لوگ دانے دانے کو ترسے، ڈوب گئے۔ سچ کو نہ آواز کی ضرورت ہوتی ہے نہ تکرار (اعادہ) کی۔ جھوٹ چلانے اور دہرائے جانے سے فروغ پاتا ہے۔ چنانچہ وزیراعلیٰ کے کان بھرے گئے کہ سید حامد کو بلند شہر سے ہٹادو، اس کی ہم سے یوں بھی نہیں بنتی اور ضلع کی حالت اسی کی وجہ سے بگڑی ہے۔ ''باڑھ پیڑتوں'' کو ڈوبنے سے بچانے اور راحت پہنچانے کا کام اس شخص کے بس کا نہیں۔ ڈاکٹر سمپورنانند کے کان شکایتیں سنتے سنتے پک گئے تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ میرا تبادلہ کردیا جائے۔ چنانچہ ٹیڑھی

گڑھوال کے کلکٹر کی حیثیت سے تبادلے کے احکام آ گئے۔

ملک خدا تنگ نیست! ہم نے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ اس اثناء میں ایک اور نیتا نے جن کا تعلق پڑوس کے ضلع کمشنری کے صدر مقام میرٹھ سے تھا، ایک نظر بلند شہر پر ڈالی۔ وہاں ان کی برادری کی اکثریت تھی۔ یہ جاٹوں کے رہنما چودھری چرن سنگھ تھے۔ انہوں نے سمپورنانند سے کہا کہ آپ خود کیوں نہیں جا کر دیکھ لیتے۔ چنانچہ ایک روز خبر آئی کہ چیف منسٹر آ رہے ہیں۔ جہاں جہاں کی بابت شکایت کی گئی تھی وہاں وہاں خود گئے، لوگوں نے کہا کہ راحت کا کام جیسا اس بار ہوا ہے کبھی نہیں ہوا، کلکٹر صاحب نے جان جوکھوں میں ڈالا، نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، پتلون چڑھا کر پانی میں کود پڑے فوج بلالی اور لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ رسد پہنچانے کا کام خود ان کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ میں ایک ہفتہ سے گھر نہیں گیا، یا کوتوالی میں یا دورے پر۔ وزیراعلیٰ نے دیکھا بہت کچھ، سنا بہت کچھ، کہا کچھ نہیں۔

کہا تو واپس جا کر چیف سکریٹری آدتیہ ناتھ جھا سے کہا کہ بلند شہر کے کلکٹر کو بلائیے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کہنے لگے میں آپ کے کام سے واقف ہوں لیکن چونکہ آپ کی مقامی پارلیمنٹری سکریٹری سے بن نہیں رہی تھی اس لئے سوچا گیا کہ آپ کو دوسرے ضلع میں کام کا موقع دیا جائے۔ لیکن میں بلند شہر گیا تو میں نے صورت حالات کو برعکس پایا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت شکایت پر آپ کا تبادلہ کرنا آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ آپ کا تبادلہ منسوخ کر دیا گیا۔ انفعال کا اظہار وزیراعلیٰ کی طرف سے! رواج اور دستور کی سطح سے اوپر اٹھنا بڑائی کی نشانی ہے۔ میں نے ڈاکٹر سمپورنانند کو ہمیشہ منصف مزاج پایا، انفرادی امور میں ۔مسلمانوں اور اردو کے خلاف ان کے مزاج میں عصبیت تھی، لیکن کسی کی مجال نہیں تھی کہ کسی مسلمان آفیسر کو اس بنا پر کہ وہ مسلمان ہے، نقصان پہنچایا جا سکے۔

اس کے برخلاف رویہ شرما جی کا تھا، (بلند شہر کے واقعہ سے دس سال پہلے دیوریا میں) جو کپتان پولس تھے۔ شرما جی دن و رات اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مجھے نقصان پہنچا دیں۔ میں نے بالآخر انہیں موقع فراہم بھی کر دیا۔ مصلحت اندیشی سے ناتا میں نے کئی بار توڑا ہے۔ بعض امور میں بزدلی وخود آزاری وخودکشی بھیس بدل کر آتی ہے مصلحت پسندی کا۔ انسان بہت کچھ دیکھتا ہے اور منھ پر مہر سکوت لگا دیتا ہے۔

لیکن سعدی نے کہا ہے کہ خلاف عقل دو باتیں ہیں۔ بولنے کا موقع ہوتو خاموش ہوجانا اور چپ رہنے کا محل ہوتو بول اٹھنا۔ ادھر شرما صاحب اس کارِ خیر میں لگے ہوئے تھے کہ میری ملک سے وفاداری کو کلکٹر اور حکومت کی نگاہوں میں مشتبہ کردیں۔ ادھر گورکھپور میں ایک کلکٹر تھے جنہوں نے مسلمانوں کے حوصلے توڑنے کی یہ ترکیب نکالی تھی کہ ان میں جو لوگ مقتدر، خوش حال اور بااثر تھے، انہیں بلاتکلف زنداں میں ڈال دیں اور افسروں کے نامہ اعمال کو سیاہ کردیں۔ یہ زمانہ تقسیم کے فوراً بعد کا تھا اور دونوں طرف خوں ریزیاں ہورہی تھیں اور تعصب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

جس خلوص اور انسانی ہمدردی کے ساتھ باڑھ کے زمانے میں جس شخص نے جان جوکھم میں ڈالی: محنت، جفاکشی اور جرأت جس کا نشان امتیاز۔ اس کی ملک سے وفاداری مشتبہ سمجھی جائے تو اس شخص پر کیا بیتی ہوگی۔

☆

ایک بزرگ تھے 'خیر بہوروی'، انہوں نے اردو کی ایک بڑی کانفرنس گورکھپور میں منعقد کی۔ یہ ان کی جرأت مندی تھی کہ اس زمانے میں جب تقسیم اور خونریزی کے زخم بھرے نہیں تھے۔ اردو کا جائزہ لینے بیٹھ گئے۔ مجھے بھی یاد کیا۔ میں کانفرنس میں شامل ہوا اور اردو کے مستقبل کے متعلق ایک مقالہ پڑھ ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اردو کا مستقبل ہندوستان میں تاریک ہے، الا اس کے کہ مسلمان اس کو زندہ رکھنے کے لئے تعمیری جتن خود کریں۔ اس مقالہ میں کوئی بات حکومت یا ہندوؤں کے خلاف نہ تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ملک، حکومت یا اکثریت کا شکوہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، بڑی حد تک ہم خود اپنی تباہ حالی کے ذمہ دار ہیں، اور اپنے قوت بازو سے اس نکبت کو دور کرسکتے ہیں۔

کلکٹر صاحب کو میری یہ جسارت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اُن کے ضلع میں آکر ایک ڈپٹی کلکٹر اُردو زبان کی حمایت میں تقریر کر جائے۔ شیر ببر پر اُسی کی کچھار میں حملہ؟ جو کچھ میں نے کہا تھا وہی حکومت کو لکھ بھیجتے تو کچھ بات نہ بنتی۔ چنانچہ انھوں نے میری تقریر میں تحریف کی۔ جو شکایت مجھے مسلمانوں سے تھی اس کا رخ حکومت کی طرف موڑ دیا۔ کہا کہ سید حامد دیوریا سے آیا اور حکومت کے خلاف زہرافشانی کرکے چلا گیا۔ انھوں نے ریڈی جی کو بھی اس نوع کی اطلاع

سے نوازا۔ ریڈی جی نیک نفس انسان تھے انھوں نے کلکٹر گورکھ پور کو لکھ کر بھیجا کہ سید حامد نے اپنے مذہبی جلسے میں شرکت کی اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے کوئی نا مناسب بات نہیں کی۔ (انھیں خیال ہوا کہ یہ کوئی مذہبی جلسہ تھا) میرے فرشتوں کو بھی کلکٹر گورکھپور کی فتنہ پردازی اور ریڈی جی کی اعلی ظرفی کی خبر نہ ہوتی۔ کلکٹر دیوریا کا اسٹینوگرافر ایک نیک نہاد انسان تھا جو اس سے پہلے میرا اسٹینو رہ چکا تھا۔ میں ایک دن کلکٹر سے ملنے گیا تو اس نے مجھے الگ لے جا کر کہا کہ ڈی۔ پی سنگھ نے آپ کی شکایت کی تھی اور ریڈی جی صاحب نے یہ کہا ہے۔ شرما جی سے بچ کر رہیے گا کہ وہ آپ کے درپے آزار رہے اور برابر آپ کے خلاف کلکٹر کو لکھتا رہتا ہے۔ غور کیجیے اس زمانہ میں جب ہندو بالعموم مسلمانوں سے اس لیے بدظن تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں نے ان کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے ہیں اور وہ شرنارتھیوں سے سرحد پار کی خوں ریزیوں کی داستانیں بھی سن چکے تھے،اس زمانے میں ایک ہندو نے میری خاطر ایک خطرہ مول لیا تھا۔ دستور اخفا کو توڑا اور مجھے اس جال سے جو میرے لیے بچھایا جارہا تھا، آگاہ کردیا۔

یہ بھی دلچسپ ہے جب میں نے اِسی طرح کی کوئی بات ۳۶ سال کے بعد مدراس کے مسلمانوں سے اُردو کانفرنس میں کہی تو ایک مسلمان نے جو علی گڑھ کو چھوڑ چکا تھا اور اقتدار کو پکڑ چکا تھا، میری شکایتیں حکومت سے کیں کہ میں نے اپنی اس تقریر میں حکومت کو برا بھلا کہا۔ میرا یہ شعار رہا ہے کہ حکومت کو موضوع گفتگو بناتا ہی نہیں۔ مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ جہالت دور کرو ورنہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جاؤ گے۔ کاہلی اور نفاق سے بچو اپنی تقدیر خود تراشو۔ اس سے عبرت کا ایک پہلو تو یہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو وطن سے بے وفائی کا الزام دے کر خود سرخرو ہونا چاہتا ہے۔ یہ نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کے منھ پر کالک لگاؤ گے تو تمہارے چہرے پر سرخی کیونکر آئے گی۔ شاید یہ خود غرض ، ملت دشمن گروہ ''فواید'' کے اصول کو مشعلِ راہ بناتا ہے۔ دوسروں کے منھ پر کالک پوتو گے تو اُن کے درمیان تم آپ ہی چمکو گے ۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ فرد جماعت سے طاقت حاصل کرتا ہے جس ڈالی پر بیٹھے ہواُسے کاٹ کر خوش ہوتے رہو، جب وہ کٹ کر پاؤں تلے سے نکل جائے گی تو پاؤں تو پاؤں سر کی بھی خیر نہ رہے گی۔

قدرت کا سزا و جزا کا قانون اٹل ہے اس قانون کے چہرے پر نقاب دیکھ کر ناعاقبت

اندیش اس کے وجود سے ہی انکار کرنے لگتے ہیں۔ دوسری بات اور بھی زیادہ عبرت خیز ہے۔ گورکھپور اور مدراس کی تقریروں کے درمیان پینتیس، چھتیس سال کا فاصلہ ہے، اتنے دنوں بعد بھی ایک خیر اندیش کو وہی بات دہرانا پڑی۔ مسلمان ساکت و صامت رہے، قدم بڑھایا بھی تو پیچھے کی طرف۔ ردّے پر ردّا رکھ کر عمارت کھڑی کرنے کی ہامی کسی نے نہ بھری۔ رہنما یا اطمینان دلاتے رہے یا اشتعال ۔ روشنی، ریاضت ، سنجیدگی، سوجھ بوجھ اور حوصلہ کی راہ کسی نے نہ دکھائی کہ یہ راہ دشوار ہے، تن آسانوں کے بوتے کی نہیں۔

الغرض کھوٹے سکّے کی طرح میں لکھنؤ سے بلند شہر واپس آ گیا۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ کلکٹر صاحب کا تبادلہ کس نے کرایا تھا اور کیوں منسوخ ہوا۔ اسمبلی کے انتخاب سر پر آ گئے تھے پارلیمنٹری سیکریٹری موصوف کا قلعہ بلند شہر کا حلقہ تھا جو پوری طرح اُن کی گرفت میں تھا۔ اس بار اُن کے مخالفین کو ایک نعرہ ہاتھ آ گیا تھا۔ ایسے کلکٹر کا جس نے تبادلہ کرایا اُس امید وار کو ووٹ نہ دو۔ سابق ممبر کے پیر اُکھڑ گئے۔ اُن کی ہار کو ضلع نے جشن کی صورت منایا۔ پارلیمنٹری سیکریٹری موصوف نے اپنی ہار کا ذمہ دار سیّد حامد کو ٹھہرایا۔ بلند شہر کے پہلے قیام کے دوران نواب چھتاری اور نواب دھرم پور وغیرہ سے تعلقات قائم ہوئے جو دوسری بار اور مستحکم ہوئے۔

بلند شہر ایک خوشحال اور صحت مند شہر ہے۔ بلند شہر کے شعراء کا ایک ''تذکرہ شعرائے بلند شہر'' مرتب کیا اور ایک گلدستہ '' قوس وقزح'' کے عنوان سے ۔ بلند شہر کلب کے ''سردار'' چھوٹے خاں تھے جن کی شخصیت اور حسن انتظام سے لوگ بجا طور پر مرعوب تھے۔

لکھنؤ میں چار دلکش شخصیتوں سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ شیخ ظہور الحسن صاحب جن کی ذات میں غیر معمولی ذہانت، زہد، شوخی اور شگفتگی جمع تھیں، یو پی کے (اُس وقت کے) مردم خیز صوبہ نے کوئی مسلمان اس قابلیت کا پیدا نہیں کیا۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو داڑھی رکھتے تھے۔ شیروانی اور علی گڑھ قطع کا پاجامہ پہنتے تھے۔ زمین کے متعلق قانون پر (دراصل ہر اُس مضمون پر جو اُن سے ٹکرا جائے) حاوی تھے۔ برج کے رسیا تھے۔ آغاز ملازمت میں کام سیکھنے کے لیے ایک مسلمان افسر کے ساتھ لگائے گئے۔ اُن کا گوشۂ خاطر دخترِ رز کی طرف تھا۔ ظہور الحسن صاحب کو اُن کی یہ بات نہ بھائی۔ کچھ دنوں ضبط کیا ایک دن نہ رہا گیا۔ عرض کی حضرت شراب حرام ہے۔ آپ کیوں اس بد ذات کو منھ لگاتے ہیں؟ چھوٹتے ہی جواب دیا اپنے گریبان میں منھ

ڈالو میں شراب پیتا ہوں تو کیا، تم جو کلب میں روز جوا کھیلتے ہو؟ قران کریم کی ایک ہی آیت میں دونوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یہ بات دل کو لگ گئی۔ اُس دن کے بعد سے مرتے دم تک تاش کے پتوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔

دوسری ذاتِ گرامی سیّد صدیق حسن صاحب کی تھی جن کی سارا صوبہ عزت کرتا تھا۔ آئی۔سی۔ ایس میں مقابلے کے ذریعہ داخل ہوئے۔ خدمتِ خلق کو شعار بنالیا۔ راست کردار، خوش گفتار اور خوش صحبت انسان تھے۔ اُنھوں نے اپنے گھر پر ہر اتوار کی شام کو درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ لوگ مسائل و مباحث لے کر آتے اور قرآن کے تراجم اور تفاسیر کا درس لیتے تھے۔ صدیق حسن صاحب مدد کرتے۔ سنبھالتے اور مشکل کشائی کرتے۔ سائنس کی راہ سے شعر و شاعری کی طرف آئے۔

حبیب احمد صدیقی صاحب وجیہہ و صبیح، کشیدہ قامت تھے نفاست اور نغز گوئی کے لیے مشہور تھے۔ آئی۔اے۔ ایس کے سینئر اور لائق افسروں میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ اُنھوں نے لکھنؤ کے شعری حلقوں میں وہ مقبولیت حاصل کر لی کہ شعراء کے متصادم اور متعارض گروہوں کو ایک محفل میں لا بٹھایا۔ شعری نشستوں میں سیّد صدیق حسن، حبیب احمد صدیقی ، پنڈت آنند نرائن ملاؔ، نواب مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، ثاقب لکھنوی، سروش لکھنوی، سروش اُنّاوی، عمر انصاری، سالک، شارب وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ بہت اچھی غزلیں اُن صاف ستھری نشستوں میں سننے میں آئیں۔ طرح اور وقت کی پابندی پر اصرار تھا۔ ایک بار مجھ سے دونوں پابندیاں ٹوٹ گئیں۔ ٹھیک دو بجے نہ پہنچ پایا غزل بھی نہیں کہی اور ایک طویل نظم جس کا عنوان تھا ''تشنہ لبی'' لے کر پہنچ گیا۔ مَیں اُس محفل میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور مجھے اُن پابندیوں کا علم بھی کما حقّہٗ نہیں تھا۔ حبیب صدیقی صاحب نے شروع میں پڑھنے کی اجازت نہیں دی جب نشست ختم ہوگئی تو میری تاخیر کا ذکر کرتے ہوئے نظم پڑھنے کو کہا۔ مَیں نے نظم پڑھ تو دی جسے بہت پسند کیا گیا لیکن اُس کے خاتمے پر ناخوش گواری کا اظہار کیا۔ بعد میں منفعل ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اِن نشستوں کو کامیابی سے چلانے کا سہرا حبیب صدیقی صاحب کے سر ہے۔ وہ تغزل میں بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔ جس بزم میں بدمزگی ہوئی وہ حافظ ابراہیم صاحب کے گھر ہوئی تھی۔

اگلے مہینے ڈاکٹر سمپورنانند کی باری تھی۔ مصرع طرح یاد نہیں رہا۔ میں نے جو غزل کہی

اس کا مطلع یہ ہے۔

سر کشی کا بشر پر گماں ہے
سر اُٹھانے کی فرصت کہاں ہے

لیکن چونکہ پہلی نشست سے سلگتا ہوا اُٹھا تھا دوسری نشست میں باوجودیکہ ڈاکٹر سمپورنانند کے نام سے دعوت نامہ آیا تھا، نہیں گیا۔ یہ بھی ایک بے جا سی حرکت تھی۔ لیکن اس کا ارتکاب وہی شخص کرسکتا تھا جو دنیاوی مصالح کو اوپر نہ رکھنے پر قادر ہو۔ ایک بار فائل لے کر حاضر ہوا تو اُنھوں نے شکایت کی کہ آپ ہمارے یہاں مشاعرے میں نہیں آئے۔ کوئی عذر بھی تراش نہ سکا۔ اُن نشستوں کے بہانے میں نے چار چھ غزلیں کہہ لیں۔

چوتھی شخصیت جو مجھے سب سے زیادہ عزیز اور ہم سے بہت قریب تھی۔ محمد ذوالنورین کی تھی، یہ بلا کے ذہین تھے، دخترِ رز کو منھ لگایا پھر شاید دھتکار دیا۔ یہ آئی۔ اے۔ ایس تھے۔ ہائی اسکول میں سارے صوبے میں اوّل رہے تھے اور بی۔ اے میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں۔ اُن کے چہرے پر معصومیت بڑے بڑے حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ ذوالنورین اور شکیلہ گویا ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ فن کو زیادہ منھ نہیں لگایا۔ جذبہ اور فکر کے بل پر اچھے شعر کہے۔ بریلی کے ایک ذی علم اور تخیل پرداز گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ اُن سے بڑے بھائی محمد نورالعین سوِل جج تھے۔ جو بعد میں ڈسٹرکٹ جج ہوئے۔ اُن کی تینوں بہنیں رابعہ پنہاں، بلقیس جمال اور میمونہ غزال شاعرہ تھیں۔ اُن کی خوبصورت نظمیں بہت پہلے رسالوں میں نظر سے گذری تھیں۔ ذوالنورین کا یہ شعر اُن کی دوست مشربی اور فراخ دلی کا ترجمان ہے۔

حساب دوستاں دل میں بھی ہو تو ہے حساب آخر
غنی ہو جس کا دل وہ کیا حسابِ دوستاں سمجھے

۱۹۶۵ء میں جب میں دہلی میں تھا وہ تبادلہ پر دہلی آئے۔ ۱۹۶۶ء میں جب میں دہلی سے چلا آیا اُن پر دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ اُن کی رحلت ہم پر بجلی بن کر گری۔ ایک غیر معمولی قابلیت کے افسر، ایک انتہائی شریف النفس انسان، ایک خوش گو شاعر سے دنیا محروم ہوگئی۔ مَیں نے اپنے رفیق کے سوگ میں ایک طویل نظم لکھی۔ شکیلہ بھابی نے اُن کی رحلت کے بعد اُن کا منتخب دیوان ''جامِ جم'' کے نام سے شائع

کروایا۔ روزگار کی تلاش میں امریکہ چلی گئیں اور وہیں بس گئیں۔ نورالعین بھی اپنے چہیتے بھائی کی رحلت کے بعد زیادہ نہ جیئے۔ وہ شریف، منصف مزاج، نیک اور جلد گھبرا جانے والے انسان تھے۔ اُن کی گھبراہٹ کا اندازہ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب دور میں ہوا۔ میں بے اٹکل انسان، چہ غم کے انداز سے دیوریا میں زندگی گذار رہا تھا۔ نورالعین آئے دن پریشان رہتے تھے کہ الٰہی اب کیا ہوگا۔ اُن کا حساس ذہن اِن ساری بپتاؤں کی صورت گری کرتا تھا جو تقسیم کے خونریز ہاتھوں پڑ سکتی تھیں۔ گاندھی جی کے قتل کی خبر سن کر تو سورماؤں کے دل دہل گئے۔ دیوریا میں چھپے ہوئے اُن سرکاری ملازموں پر کیا گذری ہوگی جو جمع ہوکر عافیت اور گریز کی راہیں ڈھونڈا کرتے۔ شرما صاحب کو تین چار آدمیوں کے مل بیٹھنے میں منقسم ہندستان کی سالمیت کے لیے خطرہ نظر آتا۔

جن دنوں میں انڈسٹریز میں جوائنٹ سیکریٹری تھا ہمارے وزیر حافظ محمد ابراہیم تھے۔ شریف، بردبار، حکایت نواز، شعر پرور، جفاکش آدمی۔ وہ تخت اور تختہ دونوں پر یکساں طمانیت سے قدم رکھنے والے انسان تھے۔ ایک عرصہ ہوا ''نیا دور'' میں اُن پر ایک مضمون چھپوایا تھا۔ یہاں انڈیا آفس میں یہ جان کر تکلیف ہوئی کہ یوپی کا آخری انگریز گورنر وایلی، حافظ صاحب کو ذہن سے عاری اور ادراک سے معصوم سمجھتا تھا۔

(نقش ہیں سب ناتمام)

(ماخذ: آفتاب ہال میگزین، یادیں نمبر ۱۹۷۶ء)

☆☆☆

ڈاکٹرغلام شبیررانا

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس

ہنسو گے تو ساتھ ہنسے گی دنیا

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس(1898-1958) پشاور میں پیدا ہوئے اور نیو یارک میں آسودۂ خاک ہیں۔وہ ممتاز براڈ کاسٹر، ماہر تعلیم ،نقاد،محقق اورسفارت کار تھے ۔ وہ گورنمنٹ کالج ،لاہور میں (1922-1925,1927-1939) انگریزی کے پروفیسر رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں ۔ انھیں چار سال (1951-1954) اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع ملا ۔جس زمانے میں(1947-1950) پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے، اسی زمانے میں فیض احمد فیض اور ن۔م۔ راشد گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرتعلیم تھے۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے ترجمہ نگاری میں بھی اپنی فنی مہارت کا لوہا منوایا۔انھوں نے آسکر وائلڈ(Oscar Wilde,)، آر ایل سٹیون سن ، Robert Louis Stevenson) (ولیم شکسپیئر (William Shakespeare)، برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell)، آئر لینڈ سے تعلق رکھنے والے ڈرامہ نگار ،نقاد اور دانش ور جارج برنارڈ شا(George Bernard Shaw)، اناتولی فرانس (Anatole France) اور برگساں(Henri Bergson) کی نمائندہ تحریروں کے اردو تراجم کیے ۔ اپنے دیرینہ رفیق سیدامتیازعلی تاج کے ساتھ مِل کر انھوں نے ولیم شکسپیئر کے ڈرامے "A Mid summer Night's Dream" کا اردو ترجمہ کیا۔اس ڈرامے کو گورنمنٹ کالج لاہورکی ڈرامیٹک کلب نے سٹیج پر پیش کیا ۔ وہ چار سال(1954-1958) اقوام متحدہ کے انڈرسیکرٹری رہے ۔ 14۔اگست 2003 کوحکومت پاکستان کی طرف سے پروفیسر احمد شاہ

بخاری پطرس کو بعداز وفات ہلالِ امتیاز دیا گیا۔

مضامین پطرس کو قارئین کی طرف سے بہت پذیرائی ملی ۔روح اور قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی اثر آ فرینی اس ادب پارے کو معاصر ادب میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے، ان مضامین میں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی وسعتِ نظر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے ۔ معاشرتی زندگی میں ہوس نے نوع انسانی زندگی کو خودغرضی ،انتشار اور پر تشدد روّیوں سے آلودہ کر دیا ہے ۔سادیت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے پس پردہ بھی مفاد پرستی، انسان دشمنی اور بے حسی کارفرما ہے ۔مضامین کا حسن ،رعنائی اور مسرورکُن اسلوب انھیں عالمی ادب کی منتخب شگفتہ تحریروں کے برابر لاتا ہے ۔ بے لوث محبت ،خلوص اور دردمندی کی مظہر یہ پر لطف تحریریں قاری کو ایک ایسے جہانِ تازہ میں پہنچا دیتی ہیں جہاں اسے سمے کے سم کے ثمر کے مسموم اثرات سے نجات مِل جاتی ہے ۔آفاقیت کے مقبول ترین رجحان کی آ ئینہ دار یہ شگفتہ تحریریں جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے حوصلے ،اعتماد اور خندہ پیشانی سے مسائل سے عہدہ برآ ہونے پر مائل کرتی ہیں۔ ممتاز برطانوی ادیب سٹیفن لی کاک (Stephen Leacock) نے مزاح کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Humour may be defined as the kindly contemplation of the incongruities of life and the artistic expression there of."(1)

جرمن فلسفی کانٹ (Immanuel Kant) نے مضحکہ خیز کیفیات سے جنم لینے والے مزاح کے بارے میں لکھا ہے:

"Ludicrous is ,,an affection arising from the sudden transformation of a strained expectation into nothing."(2)

فرانسیسی فلسفی ہینری برگساں (Henri Bergson) نے مزاحیہ تحریروں کے بارے میں لکھا ہے:

"The comic is something mechanical encrusted upon the living."(3)

ارسطو نے اس جانب متوجہ کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو بے ہنگم اور بد وضع ہے اس سے حس مزاح کو تحریک ملتی ہے ۔معاشرتی زندگی کی ہر خامی اور خواری دیکھنے والوں کو متوجہ کرتی ہے ۔

تخلیقِ ادب میں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی انفرادیت در اصل خاندانی حالات، تعلیم و تربیت ،سماجی اور معاشرتی عوامل کے بارے میں مثبت شعور و آگہی اور اعلا علمی و ادبی ماحول کی مرہونِ منت ہے ۔ ان کی مستحکم اور باغ و بہار شخصیت کے نمو پانے کے مراحل کی جستجو سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ حصارِ ذات سے باہر نکل کر حالات کا جبر سہنے والے الم نصیب انسانوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کی سعی کی ۔انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر معاشرتی زندگی کے مسائل پر غور وخوض کو شعار بنایا اور اپنے آنسو ہنسی کے خوش رنگ دامنوں میں چُھپا کر اپنی تحریروں کو زعفران زار بنا نا اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا ۔ آلامِ روزگار کی تمازت سے بچنے کے لیے یاس و ہراس سے نڈھال دیوارِ گریہ کے سائے میں بیٹھے ستم رسیدہ انسانوں کو ان کی شگفتہ تحریریں بے عملی اور بے حسی کے سرابوں سے بچنے اور ستیز کے لیے کمر بستہ ہونے کی راہ دکھاتی ہیں ۔علمی وادبی نشستوں میں عام مشاہدہ ہے کہ طنز و مزاح کے بارے میں ایسے لوگ بھی جنھوں نے اس سے پہلے طنز ومزاح کی کوئی کتاب کبھی نہیں پڑھی دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں جو خود طنز و مزاح کی حس سے عاری ہیں ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنی تصنیف کے دیباچے میں اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے ۔ان کے مضامین کی کتاب '' مضامین پطرس'' کا دیباچہ خالص مزاح کی عمدہ مثال ہے:

'' اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مُجھ پر احسان کیا ہے۔اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے ۔اب بہتر یہی ہے کہ آ پ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں ۔ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے وہ بھی '' ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں ۔'' آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ان کی غلط فہمی اگر دُور ہو جائے تو کیا ہرج ہے ۔جو صاحب اِس کتاب کو کسی غیر مُلکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں وہ پہلے اُس مُلک کے لوگوں سے اِجازت حاصل کر لیں ۔''(4)

انسانی ہمدردی ،خلوص ،دردمندی اور ایثار پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی شخصیت کے امتیازی اوصاف تھے ۔سماجی اور معاشرتی حالات کے تناظر میں اُن کا کردار اقتضائے وقت کے مطابق رہا۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی شخصیت کی عظمت اُن کی شگفتہ تحریروں میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ہجومِ غم میں گھرے بے بس و لاچار انسانوں کی ڈھارس بندھانا زندگی بھر پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کا نصب العین رہا ۔کتاب ''مضامین پطرس'' میں درج ذیل گیارہ مضامین شامل ہیں۔

۱۔ ہاسٹل میں پڑھنا،۲۔سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی ،۳۔کُتے ،۴۔اُردو کی آخری کتاب ،۵۔میں اک میاں ہوں ،۶۔مرید پور کا پیر ،۷۔انجام بخیر ، ۸۔سینما کا عشق ، ۹۔میبل اور میں،۱۰۔مرحوم کی یاد میں، ۱۱۔لاہور کا جغرافیہ۔

تخلیقِ ادب میں حالات و واقعات کے نشیب و فراز کو کلیدی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے ۔ یہ گمان کہ تخلیقِ ادب کے لیے نا مساعد حالات ،کٹھن مسائل اور تکلیف دہ ماحول ناگزیر ہے ایک غیر حقیقی طرزِ فکر کی علامت ہے ۔عملی زندگی میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ابتدا میں انسان جن افعال کو سہل سمجھتا ہے بعد میں وہی اس کے لیے دشوار ثابت ہوتے ہیں۔ہنسنا اور ہنسانا بھی ایسا ہی فعل ہے ۔تخلیقِ ادب کے بارے میں حقیقی شعور سے عاری اور سطحی سوچ رکھنے والے بعض لوگ ہنسنے اور ہنسانے کو ایک عام سی سرگرمی پر محمول کرتے ہیں۔طنز و مزاح کا انسانی مزاج ،معاشرتی روّیوں اور عمرانی مسائل سے گہرا تعلق ہے ۔ اسے تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کے ارتقا کا مقیاس خیال کیا جاتا ہے ۔طنز و مزاح انسان کی فکری منہاج اور ذہنی بالیدگی کا آئینہ دار ہے ۔قدرتِ کاملہ کی طرف سے صرف اِنسان کو ہنسنے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے ۔اسی لیے انسان کو حیوان ظریف بھی کہا جاتا ہے ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنی شگفتہ مزاجی میں قارئینِ ادب کو بھی شامل کیا ہے ۔شاعر نے سچ کہا تھا:

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا
بیٹھ اکیلے رونا ہوگا

ایک فعال اور زیرک مزاح نگار کی حیثیت سے پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے اسلوب میں ندرت اور تنوع پیدا کرنے کی خاطر اپنی تخلیقات کو متعدد تجربات ،مشاہدات

اور بصیرتوں سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔'' پطرس کے مضامین'' میں شامل تحریریں معاشرے ،ماحول ،سماج ،تہذیب و ثقافت ،حتیٰ کہ بنی نوع انسان سے وابستہ مسائل پر محیط ہیں۔ایک حساس تخلیق کار کی حیثیت سے انھیں جہاں بھی کوئی بے اعتدالی اور نا ہمواری دکھائی دیتی ہے وہ اسے اپنی تحریروں کا موضوع بناتے چلے جاتے ہیں ۔ان تمام موضوعات کو اپنے ہمدردانہ شعور ،خلوص و دردمندی ،ایثار و وفا،حسِ مزاح اور شگفتہ مزاجی سے ایسی معنویت عطا کرتے ہیں کہ کہ قاری دنگ رہ جاتا ہے ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی حاضر دماغی ،تجسس وتخیل کی بالیدگی، منضبط پیرایۂ اظہار ،دل کش نثر ،دل نشیں اسلوب اور منفرد مرقع نگاری سے گلشنِ ادب میں سکوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور عنادل کے زمزمہ خواں ہونے سے ہر چہرے پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنی تحریروں میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے جو حربے استعمال کیے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

1۔ صنائع بدائع اور موازنہ:

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی شگفتہ تحریروں کو محض تفنن طبع تک محدود رکھنا درست نہیں۔ ان کے اسلوب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک طنز و مزاح مشغلہ نہیں بلکہ معاشرے کے مضحک پہلوؤں کو سامنے لانے والی ایک اہم ذمہ داری ہے۔تخلیق فن کے لمحوں میں انھوں نے فنی روایات ، ادبی اقدار اور تخلیق کار کی انا کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔اپنی شگفتہ مزاجی اور منفرد اسلوب کے تفاعل سے وہ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان فکری ہم آہنگی پروان چڑھتی ہے ۔اس فکر ہم آہنگی کے معجز نما اثر سے مزاح کے تشکیلی عوامل میں قارئین کی دلچسپی میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے ۔ انھوں نے معاشرتی مقاصد کے حصول کی خاطر اپنے مضامین میں صنائع بدائع اور موازنہ سے خالص مزاح کو تحریک دی ہے ۔اس طرح مزاح پیدا کرنے کی مثالیں درج ذیل ہیں:

''میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا معقولیت کم ہوتی گئی ۔جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سُنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا۔ ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل ۔ پاکیزگی اور طہارت کا کعبہ اور ہاسٹل گناہ ومعصیت کا ایک دوزخ ۔''(ہاسٹل میں پڑھنا) ۔'' ایک نیک اور

سچے مسلمان کی طرح کلمۂ شہادت بھی پڑھا، پھر یہ بھی یاد ہے کہ اُٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔"(سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی)

2۔ گل افشانیٔ گفتار

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی گل افشانیٔ گفتار جامدو ساکت پتھروں کو بھی موم کر دیتی ہے۔ ہجوم یاس و ہراس میں گھرے دل گرفتہ لوگوں کے لیے اُن کی شگفتہ تحریریں پیامِ نوبہار ثابت ہوتی ہیں۔وہ جس موضوع پر بھی لکھیں مزاح کی پھل جھڑیاں بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی شگفتہ تحریریں قارئینِ ادب کی انتہائی پسندیدہ ،لائق صد رشک و تحسین اورقابل فخر اقدار کو زندگی کی حقیقی تاب وتواں اور معنویت عطا کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتی ہیں۔مضامین پطرس میں شامل تحریریں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں اور یہ عصری آگہی پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں ۔یہ شگفتہ تحریریں نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کرتی رہیں بلکہ تخلیق اور اس کے پس پردہ کارفرما شعوری محرکات سے آگہی حاصل کرنے کا وسیلہ ثابت ہوئیں ۔ یہ شگفتہ تحریریں تخلیق کار کی شخصیت اورسماجی عوامل کے بارے میں تمام حقائق سامنے لاتی ہیں ۔نو آبادیاتی دور میں جس کا وہ ماحول جہاں ہنسنا تو بہت دُور کی بات ہے لوگوں کو گریہ وزاری کی بھی اجازت نہ ہو وہاں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی شگفتہ تحریریں ستارۂ سحر ثابت ہوئیں۔

"لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سر پرست بنا دیا گیا۔" (ہاسٹل میں پڑھنا) ۔"ارے کم بخت خدائی فوجدار،بدتمیز کہیں کے میں نے تجھے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا۔ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟تُو نے ہمیں ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟" (سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی) ۔"جب تک اس دُنیا میں کُتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں سمجھ لیجے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔" (کتے)

"آخر کار بائیسکل پر سوار ہوا ۔پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مُردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے ---۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔(مرحوم کی یاد میں)

''رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔اس کے مختلف پُرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے ۔لیکن مجمل ہئیت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور راہٹ اور چرخہ اور اسی طرح اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔''
(مرحوم کی یاد میں)

'' میرا دِل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغہ کے ساتھ کرتی تھی ۔یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔''
(میبل اور میں)

'' اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھا یا جا تا ہے۔تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔بناسپتی گھوڑا شکل وصورت میں دُم دار ستارے سے مِلتا ہے۔کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے ۔حرکت کرتے وقت اپنی دُم دبا لیتا ہے۔''(لاہور کا جغرافیہ)

3۔ مضحکہ خیز کیفیات

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی گل افشانیٔ گفتار کے دو آہنگ قاری کے فکر ونظر کو مہمیز کرتے ہیں ۔سب سے پہلے تو وہ مضحکہ خیز کیفیات کے بارے میں ایک واضح اور بے ساختہ انداز اپناتے ہیں ۔اسلوب کی یہی بے ساختگی قاری کے لیے مژدۂ جانفزا ثابت ہوتی ہے ۔جیسے ''میبل اور میں'' ذوق مطالعہ سے عاری ایک لڑکے اور لڑکی کے بارے میں ہے ۔کوئی بھی معاشرہ جب بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے تو وہاں تنقید اور احتسابِ ذات کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔ ایسی اعصاب شکن صورتِ حال میں خود ستائی ایک متعدی مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔قحط الرجال کے اس دور میں جس طرف نظر دوڑائیں اپنے منہ میاں مٹھو بننے والوں اور اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے والوں کا جمِ غفیر امڈ آیا ہے۔مضمون '' میبل اور میں'' خودستائی پر مبنی مضحکہ خیز کیفیات سے لبریز ہے۔ اسی طرح '' مرید پور کا پیر''میں ایک خود ساختہ اور جعلی سیاسی کارکن کا کچا چٹھا پیش کیا گیا ہے ۔ایک سیاسی جلسۂ عام میں اس جعل ساز

سیاسی کارکن کی بے ربط اور مہمل تقریر کے جملوں کا ایک ایک لفظ محفل کو کشت زعفران میں بدل دیتا ہے ۔دوسری صورت یہ ہے کہ بعض تلمیحات ،تاریخی واقعات اور بے ہنگم تضادات و ارتعاشات کو ان مضحکہ خیز کیفیات کا حصہ بنا دیا گیا ہے ۔اس کی دلچسپ مثالیں نظام سقہ اور دیو جانس کلبی ،بم کی تیاری کی سوچ، تپسیا اور سادھو وغیرہ ہیں۔ دیو جانس کلبی کی تلمیح مزاح کو تحریک دیتی ہے ۔ ارسطو اور سکندر اعظم (B: 356 BC,D:323 BC)کے دور سے تعلق رکھنے والا نا بینا قناعت پسند دانش ور دیو جانس کلبی بصارت سے محروم تھا مگر بصیرت رکھتا تھا۔ آخری عمر میں دیو جانس کلبی ویرانے میں مٹی کے اک ٹب میں پڑ ا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ انسان کا دشمن انسان ہے جانور نہیں۔آدمی سے بچو جس کی درندگی ہزاردرندوں پر بھاری ہے ۔جب مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم نے پوری دنیا فتح کر لی تو دیو جانس کلبی نے کہا:

''اگر انسان قناعت پسند ہوتو وہ مٹی کے اس ٹب میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کے لیے چھوٹی ہے ۔''

سکندر اعظم جب دنیا کو فتح کرنے کے بعد دیو جانس کلبی کے پاس پہنچا۔ شدید سردی کا موسم تھا، قناعت پسند فقیر دیو جانس کلبی سردی سے بچنے کے لیے دُھوپ میں بیٹھا تھا۔سکندر اس طرح کھڑا تھا کہ سورج کی شعائیں فقیر پر نہیں پڑ رہی تھیں ۔سکندر نے دیوجانس کلبی سے کہا کہ وہ اپنی کوئی خواہش بتائے مگر دیو جانس کلبی نے کوئی خواہش ظاہر نہ کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ خواہشوں کے اسیر حاکم کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ حریت ضمیر سے جینے والے اور حریت فکر و عمل کو زادِ راہ بنانے والے فقیروں کی خدمت کریں ۔جب سکندر کا اصرار حد سے بڑھنے لگا تو دیو جانس کلبی نے ایک شان استغنا سے اس فاتح جنگ جُو سے کہا:

'' فاتح اعظم !سورج کی شعاعوں اور میرے درمیان آپ حائل ہو گئے ہیں اور دُھوپ مجھ تک نہیں پہنچ رہی ۔یہاں سے ہٹ جائیں تا کہ دُھوپ مجھ تک پہنچے اور میں سردی سے بچ سکوں ۔''

اس مردِ فقیر کی یہ بات سن کر سکندر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور سر جھکائے واپس چلا گیا۔

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اپنے مضمون'' لاہور کا جغرافیہ'' میں نظام سقہ کا ذکر کیا ہے۔ نظام سقہ ایک بڈھا کھوسٹ ،مخبوط الحواس ، طالع آزما اور فاتر العقل ماشکی تھا۔

بکسر کے جنوب میں دس کلو میٹر کے فاصلے چوسہ (موجودہ بہار) کے مقام پر 26۔جون 1539 کو مغل بادشاہ ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں میں جنگ ہوئی ۔اس جنگ میں ہمایوں کو شکست ہوئی اور وہ جان بچا کر بھاگا اور دریائے گنگا میں چھلانگ لگادی ۔ دریائے گنگا کی موجوں کی طغیانی ہمایوں کے لیے آفت نا گہانی بن گئی اور وہ ڈوبنے لگا۔نظام سقہ نے اپنی مشک پر تیر کر ہمایوں کی جان بچائی ۔ شیر شاہ سوری کی کالنجر کی لڑائی میں موت کے بعد ہمایوں نے جب 1545 میں دوبارہ حکومت سنبھالی تو نظام سقہ بھی دربار میں جا پہنچا ۔ہمایوں نے اپنے محسن کی ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ہوش وخرد سے عاری اور ذہنی قلاش نظام سقہ نے ایک دن کے لیے بادشاہ بننے کی تمنا کی ۔اسے ایک دِن کے لیے بادشاہ بنا دیا گیا۔ نظام سقہ نے شاہی فرمان کے ذریعے اس دِن چام کے دام چلا دیئے ۔ سب ماشکیوں کے مشکیزے کٹ گئے مگر اگلے روز سب مہم جُو موقع پرست ٖکر چیوں میں بٹ گئے ۔

’’ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں ۔‘‘ ، ’’سگرٹ غسل خانے میں چُھپ کر پیتے تھے ۔‘‘ (ہاسٹل میں پڑھنا) ۔صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا ساڑھے پانچ سو جواب آیا لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے ۔‘‘(سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی) ۔’’ اب یہی ہمارا معمول ہو گیا ہے جا گنا نمبر ایک چھ بجے جا گنا نمبر دو دس بجے اِس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز ۔‘‘(سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی) ۔’’آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِگناہ کا احساس آنکھ نہیں اُٹھانے دیتا۔دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے ۔سڑک کے بیچوں بیچ غور وفکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کرلیتا ہے ۔شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے مِلتا ہے ۔۔۔۔۔۔ رات کے وقت یہی کُتا اپنی خشک پتلی سی دُم تا بحدِ اِمکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے ۔اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے ۔جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔انھوں نے غیظ وغضب کے لہجہ میں آپ سے پُرسش شروع کر دی’’ بچا فقیروں کو چھیڑتا ہے ۔نظر نہیں آتا ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔‘‘(کتے)

’’ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے ۔سُلا نا ہو تو افیم کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے ۔رات کو

اپنے ساتھ سُلاتی ہے (باپ کے ساتھ دُوسرا بچہ سوتا ہے)۔جاگ اُٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے ۔'' (اُردو کی آخری کتاب)

انجام بخیر میں عمدہ لباس پہنے ہوئے تین طالب علم پطرس نامی اپنے نادار اُستاد کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔معلم کے کمرے میں کتابوں کا انبار لگاہے۔کمرے میں صرف ایک کرسی ہے جس پر معلم بیٹھاہے معلم کے چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔ طالب علم ضخیم کتابوں کو جوڑ کر ان پر بیٹھ جاتے ہیں۔اس کے بعد ہر طالب علم اپنے مضمحل استادکی خدمات کے اعتراف اور اظہار تشکر اور احسان مندی کے جذبے سے ایک ایک اٹھنی پیش کرتا ہے ۔اس طرح وہ طالب علم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جاتے ہیں ۔ اپنے شاگردوں کی اس قدر افزائی کے بعد پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس اپنے خالق کے حضور سر بہ سجود ہو کر کہتا ہے :

'' باری تعالیٰ تیرالاکھ لاکھ شکر ہے کہ تُو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے ثمر کے لیے بہت دنوں انتظار میں نہ رکھا۔تیری رحمت کی کوئی انتہانہیں لیکن ہماری کم مائیگی اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے ۔'' (انجام بخیر)

مستری خدا بخش نے جب بائیسکل کی قیمت صرف تین روپے بتائی تو بائیسکل کے مالک کے دِل پر جو صدمہ گزرا اس کی لفظی مرقع نگاری اور مستری خدا بخش سے گفتگو بہت دلچسپ ہے :

''اوصنعت وحرفت سے پیٹ پالنے والے نچلے طبقے کے انسان مجھے اپنی توہین کی پروانہیں۔لیکن تو نے اپنی بے ہودہ گفتاری سے اِس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایاہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔'' (مرحوم کی یاد میں)

4۔ مزاحیہ کردار

مزاحیہ کردار اور مسخرے میں جو فرق ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ۔معاشرتی زندگی میں مسخرے عزت واحترام سے محروم ہوتے ہیں ۔ان کی ہیئتِ کذائی دیکھ کر ہنسی ضبط کرنا محال ہوتا ہے۔ جہاں تک مزاحیہ کردار کا تعلق ہے تو یہ اپنی خود ساختہ جعلی اور فرضی توقیر وتکریم کی بنا پر اپنے تئیں عصرِ حاضر کا نابغہ سمجھتا ہے ۔اس کی نظر میں کوئی اہل کمال جچتا ہی نہیں ۔ اس

سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مزاحیہ کردار جعلی وقار کا بھرم قائم رکھنے کے لیے بناوٹ ، دکھاوے اور منافقت کا سہارا لیتا ہے مگر مسخرے کے عیوب اس قدر واضح ہوتے ہیں کہ انھیں چھپانے کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی ۔

مضمون ''ہاسٹل میں پڑھنا'' میں ہاسٹل میں داخل ہونے کا خواہش مند طالب علم بھی ایک مزاحیہ کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے ۔ اس کی باتیں سن کر ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ جب ہاسٹل کی زندگی کی خوبیاں بیان کرتا ہے تو قاری پطرس کی حسِ مزاح کا قائل ہو جاتا ہے :

''ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے ۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے ۔'' (ہاسٹل میں پڑھنا)

صبح دیر سے جاگنے والا طالب علم عادی دروغ گو اور مزاحیہ کردار ہے ۔ اس طالب علم کی باتیں سن کر خندۂ زیرِ لب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ۔'' بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے یعنی اگر صبح کی بجائے صبح شام ہوا کرتی تو دِن کیا بُری طرح کٹا کرتا۔'' (سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی)

سنیما کے ایک شیدائی اور مزاحیہ کردار مرزا صاحب کی ہئیت کذائی دیکھ کر قاری مسکرانے لگتا ہے ۔ مرزا صاحب کے کپڑے زیبِ تن کرنے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو قانون کی رُو سے انھیں کبھی کپڑے اُتارنے ہی نہ دیتا۔ یہاں مرزا کے تاخیری ہتھکنڈوں پر طنز کی گئی ہے :

'' اگر قتلِ انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سر زد ہو جاتا۔ اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں بے بس ہوتا ہوں ۔'' (سنیما کا عشق)

'' میں ایک میاں ہوں، مطیع و فرماں بردار ۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں ۔ خدا میرا انجام بخیر کرے ۔ چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اُتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے

ہیں ۔'' (میں ایک میاں ہوں)

''مرید پور کا پیر'' بھی ایک مزاحیہ کردار ہے ۔جس کے بارے میں ایک مقامی اخبار ''مرید پور گزٹ'' نے خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے صرف دو ماہ تک چھپنے والے'' مرید پور گزٹ'' کی اس خصوصی اشاعت کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا مکمل فائل تاریخ کے طوماروں میں دب چکا ہے اور اب اس گزٹ اوراس کے مدیر کا کسی کو اس کا اتا پتا معلوم نہیں۔مرید پور گزٹ کے مدیر کا حلیہ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے اس طرح بیان کیا ہے :

'' رنگ گندمی ،گفتگو فلسفیانہ ،شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔۔اس اخبار نے مرید پور کے پیر کے خطوط کے بَل پر جو خصوصی نمبر شائع کیا وہ اِتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اُس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں ۔''(مرید پور کا پیر)

5۔ تحریف نگاری

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے تحریف نگاری کے ذریعے اپنی شگفتہ تحریروں کو نکھار عطا کیا ہے۔ان تحریروں سے فرحت اور شادمانی کے ایسے سوتے پُھوٹتے ہیں جو روح اور قلب کو سکون سے متمتع کرنے کا وسیلہ ثابت ہوتے ہیں ۔تحریف نگاری کے ذریعے پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے معاشرتی زندگی میں پائے جانے والی انصاف کُشی ، جبر و استبداد ،استحصال اور گھٹن کے خلاف شگفتہ انداز میں لکھا ہے ۔ معاشرتی زندگی میں پائی جانے والی شقاوت آمیز ناانصافیاں پیہم شکستِ دِل پر منتج ہوتی ہیں۔ظالم و سفاک اور مُوذی و مکار استبدادی قوتیں مظلوم انسانوں کو قلعۂ فراموشی میں محبوس کر دیتی ہیں۔ یہاں یہ قسمت سے محروم جگر سوختہ مظلوم حواس باختہ ،غرقابِ غم اور جاں بہ لب پڑے سسکتے رہتے ہیں ۔اس قسم کے لرزہ خیز ،اعصاب شکن اور جان لیوا صدمات میں گِھرے انسانوں کے لیے ظرافت طلوعِ صبحِ بہاراں کی نوید ثابت ہوتی ہے ۔پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی تحریف نگاری ید بیضا کا معجزہ دکھاتی ہے اور غموں کے ازدحام میں دِل کو سنبھالنے پر آمادہ کرتی ہے ۔

''اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑویوں کے گِر پڑنے ۔۔۔۔دیگچیوں کے اُلٹ جانے، دروازوں کے بند ہونے ،کتابوں کے جھاڑنے ،کرسیوں کے گھسیٹنے ،کلیاں اور غرغرے

کرنے، کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔اندازہ کر لیجے کہ ان میں سُر تال کی کِس قدر گنجائش ہے!

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں (سویرے جو کل آنکھ میری کُھلی)

''اُردو کی آخری کتاب'' میں محمد حسین آزاد کی کتاب'' اردو کی پہلی کتاب'' کی پیروڈی کی گئی ہے۔ماں کی مصیبت کے عنوان سے پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس نے لکھا ہے:

'' ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے ۔باپ انگوٹھاچُوس رہا ہے اور دیکھ کر خوش ہوتا ہے ۔ بچہ حسبِ معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے ۔'' (اُردو کی آخری کتاب)

''اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اورسب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ہررسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اورعام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویراورخاص نمبروں میں مس سلوچنا اورمس کجن کی تصاویربھی دی جاتی ہیں۔اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے اورفنِ تنقید ترقی کرتا ہے ۔لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔چونکہ انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کاافتتاح کرتا ہے،سہ پہرکوکسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کوکسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے ۔تقریر عام طور پرایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔''(لاہور کا جغرافیہ)

مکالمہ نگاری میں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی نکتہ آفرینی کا کرشمہ دامنِ دِل کھینچتا ہے۔ وہ افکارِ تازہ کی مشعل تھام کر پامال راہوں سے بچ کر جہانِ تازہ کی جانب رواں دواں رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔''مرحوم کی یاد'' میں ایک پر لطف مضمون ہے ۔اس مضمون کے دو مزاحیہ کردار ایک تو مرزا اور دوسرا بائیسکل کا خریدار ہے ۔یہ دونوں دوست بھی ہیں مگر مزاج کے اعتبار سے دونوں مختلف ہیں ۔ان کے روّیے میں لچک عنقا ہے ۔بائیسکل کا خریدار اپنے

معاشی مسائل کے باعث تشویش میں مبتلا ہے ۔اس کے باوجود وہ نمود و نمائش اور جعلی شان و شوکت کی تمنا رکھتا ہے ۔ یہ دونوں کردار اپنی اپنی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور ان کی گفتگو جہاں بے ضرر ہے وہاں بے مقصد بھی ہے ۔مصنف نے اپنے خالص مزاح کے لیے اسی گفتگو سے مزاح کے پھول چنے ہیں ۔زندگی کی بے اعتدالیوں اور تضادات کے ہمدردانہ شعور سے لبریز مصنف کے اسلوب کے مطالعہ سے قاری کے دِل کی کلی کِھل اُٹھتی ہے ۔ اپنی انا اور ذات کے حصار سے نکل کر سوچنا ہی شگفتہ مزاجی کی دلیل ہے ۔ ذیل میں پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی فنی مہارت کی مظہر شگفتہ مکالمہ نگاری کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

’’ میں کچھ دیر تک آ ہیں بھرتا رہا۔مرزاصاحب نے کچھ توجہ نہ کی آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرز اصاحب سے مخاطب ہو کر بولا :

مرزا! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے ؟

مرزا صاحب بولے ’’ بھئی کچھ ہوگا ہی نہ آخر ۔‘‘

میں نے کہا ’’میں بتاؤں تمھیں ؟‘‘

کہنے لگے ’’ بولو۔‘‘

میں نے کہا ’’ کوئی فرق نہیں ۔سنتے ہو مرزا ؟ کوئی فرق نہیں ۔ہم میں اور حیوانوں میں۔۔۔کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں ! ہاں ہاں میں جانتا ہوں ۔تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے حیوان جگالی کرتے ہیں تم نہیں کرتے ۔اُن کی دُم ہوتی ہے تمھاری دُم نہیں ۔لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے ؟ اِن سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں مَیں اور وہ بالکل برابر ہیں ۔وہ بھی پیدل چلتے ہیں ۔میں بھی پیدل چلتا ہوں ۔اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے ؟ جواب نہیں کچھ ہے تو کہو ۔بس چُپ ہو جاؤ ۔تم کچھ نہیں کہہ سکتے ۔جب سے میں پیدا ہوا ہوں اُس دِن سے پیدل چل رہا ہوں ۔ پیدل ! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے ۔پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے ۔یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں ۔دوسرا اُٹھاتا ہوں ۔دوسرا رکھتا ہوں ، پہلا اُٹھاتا ہوں ۔ ایک آگے ایک پیچھے ۔ایک پیچھے ایک آگے ۔خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے

کے قابل نہیں رہتا۔حواس بے کار ہو جاتے ہیں ۔تخیل مر جاتا ہے ۔آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے ۔''

مرزا صاحب میری اِس تقریر کے دوران میں کچھ اِس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے وفائی پر رونے کو دِل چاہتا تھا۔میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتو ں پر یقین ہی نہیں آتا۔گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں ۔یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابلِ توجہ ہی نہیں ۔یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں ۔میں نے دِل میں کہا'' اچھا مرزا یوں ہی سہی ۔دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں ۔''

میں نے اپنے دانت پچی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جُھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا ۔میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر مِلا ہوا تھا۔جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چبا چبا کر کہا :

'' مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں''

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا' 'سُنا نہیں تم نے۔میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں ،موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں ۔بعض لوگ کار کہتے ہیں۔لیکن چونکہ تم ذرا کُند ذہن ہو۔اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے ہیں ۔تا کہ تمھیں سمجھنے میں کوئی دِقت پیش نہ آئے۔''

مرزا بولے'' ہوں''

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا۔بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اِس انداز میں لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اِس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے'' ہوں''

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے ۔مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے ۔میں چاہتا تھا۔مرزا کچھ بولے ۔تا کہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے ۔لیکن مرزا نے پھر کہا '' ہوں''

میں نے کہا ''مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے سکول او رکالج اور گھر پر دو تین

زبانیں سیکھی ہیں۔اس کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول اور کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے ۔پھر بھی اِس وقت تمھارا کلام'' ہوں'' سے آگے نہیں بڑھتا۔تم جلتے ہو۔مرزا اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے ۔اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔

مرزا صاحب کہنے لگے ''نہیں یہ بات تو نہیں۔میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا ۔تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں ۔تو میاں صاحب زادے خریدنا ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپے کا بندو بست کیسے کرو گے؟''

یہ نکتہ مجھے نہ سُوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری ۔میں نے کہا ''میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں ۔''

مرزا بولے ''کون کون سی مثلاً ؟''

میں نے کہا'' ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔''

مرزا کہنے لگے ''چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا ۔یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں ۔بہت سوچا ۔آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں ۔اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

ہوسِ زر کے سرابوں میں خجل ہونے والے بدقسمت افراد یہ سمجھتے ہیں کہ مادی دور کی لعنتوں کے باعث معاشرتی زندگی سے راحت و شادمانی،عدل و انصاف اور خوش حالی کی تمنا خیال وخواب ہو گئی ہے ۔مراعات یافتہ عناصر نے اپنی مکر کی چالوں سے تمام وسائل پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے ۔ساری دنیا کے حالات بدل رہے ہیں مگر محنت کشوں کے حالات جوں کے توں ہیں ۔کوئی مسیحا فاقہ کش فقیروں کی قسمت کی لکیروں کو بدل نہیں سکا مگر بے ضمیروں کے سدا وارے نیارے رہتے ہیں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ عقابوں کے نشیمن اب زاغوں کے تصرف میں ہیں۔ ادب کا عام قاری بھی جب زندگی کے تضادات دیکھتا ہے تو وہ دل

گرفتہ ہو جاتا ہے۔آلامِ روزگار کے مہیب پاٹوں میں پسنے والا محروم طبقہ مراعات یافتہ استحصالی طبقے کی عیاشیوں کو دیکھ کر ہروقت حواس باختہ ،غرقابِ غم اور نڈھال رہتا ہے۔اقتصادی زبوں حالی کے شکار اور آلامِ روزگار کے پاٹوں میں پسنے والے محروم لوگ پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کی کتاب ''مضامین پطرس'' نکال کر پڑھنے لگتے ہیں کہ شاید انھیں معاشی عدم مساوات کو ختم کرنے اور اہلِ جور کو نیست و نابود کرنے کے لیے پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس جیسے درد آشنا کا تجویز کردہ درج ذیل نسخہ مِل جائے۔

''میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کسی کی موٹر کار کو دیکھوں ۔مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں ،میرے دماغ ،میرے معدے اور میری تلّی تک پہنچ جائے تو اُس دِن میں گھر آ کر علمِ کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔اے میں پڑھی تھی ۔اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔''

ماخذ:

1. Stephen Leacock:Humour And Humanity,Thronton Butterworth, Ltd, London, 1937, Page 11.
2. As above
3. As above

4۔ احمد شاہ بخاری پطرس: پطرس کے مضامین ،اُردو اکیڈیمی،لاہور ،بار چہارم ،جنوری 1944،صفحہ 5۔

☆☆☆

پروفیسر محمد انوار الحق تبسم٭

البیرونی:
ہندوستان کے متعلق ان کے مشاہدات

عہد عباسی میں ہندوستان اور عربوں کے بڑھتے ہوئے باہمی تعلقات نے دونوں ملکوں کے درمیان ذہنی، فکری، علمی اور ثقافتی ربط وضبط کیلئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے شام کی فتح نے عربوں میں یونانی علم و ثقافت کے مطالعے کو مقبول بنایا تھا۔ ہندوستان کے متعلق یونانی نگارشات دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اسلامی عہد وسطیٰ کے عظیم محقق اور دانشور البیرونی کا شمار بھی انہیں فضلاء اور محققوں میں ہوتا ہے جو یونانی اور عربی نگارشات سے پورے طور پر مطمئن نہیں تھے۔ وہ بذات خود اصلی مآخذ کھنگالنا، سنسکرت سیکھنا، ہندوستان کی سیر اور ہندوستانی روایات کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ خلیفہ مامون الرشید (813-833) کے عہد سے ہی مسلمان سنسکرت علوم سے آشنا ہو چکے تھے۔ بغداد میں ان کی قائم کردہ "بیتُ الحکمۃ" کیلئے طب، ریاضی اور دوسرے سائنسی علوم کی سنسکرت کتابیں عربی میں ترجمہ کی جا چکی تھیں لیکن عہد وسطیٰ کے مسلمانوں میں سنسکرت زبان اور علوم میں البیرونی نے زبردست مہارت حاصل کی جس کے باعث وہ شاید تمام عہدوں کا سب سے بڑا ماہر ہندوستانیات تسلیم کیا جاتا ہے[1]۔

البیرونی، محمود غزنوی (997-1030) کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اس کا شمار عہد وسطیٰ کے ابتدائی غیر ملکی ہندوستان آنے والے سیاحوں میں ہوتا ہے۔

البیرونی سے پہلے میگا ستھینیز، فاہیان، ہوین تسانگ مسعودی اور اس کے بعد مار کو پولو، ابن بطوطہ، عبدالرزاق، برنیر، ٹیورنیر، اور منوچی وغیرہ ہندوستان آئے اور اپنے مشاہدات کو قلمبند کیا۔ ان سبھوں میں البیرونی کو وہی درجہ حاصل ہے جو ستاروں میں چاند کو حاصل ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے مشاہدے میں ہندوستان سے سب سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ وہ ہر مسئلے کو

قوانین فطرت اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ وہ پہلا مسلمان مورخ ہے جس نے تاریخی اصولوں کو برتا۔

پورا نام،ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی ہے۔ وہ سرزمین خوارزم میں ، جو سوویت مرکزی ایشیا کے موجودہ خیوہ کے قریب ہے۔362 ہجری یا973ء میں پیدا ہوا[2]۔ بیرونی اُسے اس مناسبت کہتے ہیں کہ وہ خوارزم کا نہیں بلکہ نواح خوارزم کا باشندہ تھا۔ سمعانی کے مطابق یہ نسبت بیرون خوارزم کے باشندہ ہونے کے سبب ہے [3]۔ الف لام کا سابقہ لگا کر اور معرب بنا کر البیرونی کہا جانے لگا۔

خوارزم جو ابھی تہذیبی مرکزوں سے الگ تھلگ ہے، کبھی بین الاقوامی اسلامی ثقافت کا سرچشمہ رہ چکا ہے۔خوارزم ؔاموی خلافت کا ایک حصہ تھا۔ لیکن البیرونیؔ کی پیدائش سامانیوں کے عہد میں ہوئی۔ اسی عہد میں سمرقندؔ وبخاراؔ کی خوشحالی ، دولت و ثقافت، آرٹ اور شاعری اور حکمرانوں کے ذریعہ تمام قسم کے علوم وفنون کی سرپرستی کی شہرت سارے جہاں میں ہوئی۔علوم و فنون کے ان قدر دانوں میں خوارزمؔ کے مقامی حکمراں بھی شامل تھے جو بعد میں سامانیوں سے آزاد ہو گئے۔البیرونی نے ان کے دربار میں بڑااثر ورسوخ پیدا کر لیا تھا۔ محمودؔ غزنوی جب خوارزم کے حکمراں کو شکست دے کر 1017ء میں مال غنیمت اور جنگی قیدیوں کے ساتھ غزنہؔ لوٹا تو البیرونی بھی ان قیدیوں میں شامل تھا[4]۔

البیرونی کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات کم ہیں، لیکن ان کا تعلق ایسے سماجی طبقے سے تھا، جو اس عہد کے علوم وفنون میں بڑا کمال رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں لکھا ہے کہ ’’مجھے اپنی نوجوانی ہی سے علم حاصل کرنے کا حقیقی شوق تھا[5]‘‘۔

ان کی زندگی پر نظر دوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے علم کی جستجو میں دن رات ایک کر دیا تھا۔اور آخری سانس تک اس میں مشغول رہا۔ یاقوتؔ نے ’’معجم الادباء‘‘ میں علی بن عیسیٰ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں ابوریحان البیرونیؔ کے پاس گیا تو ان کو اس حال میں دیکھا کہ نزع کا عالم ہے، سانس بہت تکلیف کے ساتھ آرہی ہے،اس حال میں بھی انہوں نے مجھ سے نانی کی وراثت کا ایک مسئلہ دریافت کیا، میں نے ان کا حال دیکھ کر کہا کہ اس وقت بھی آپ ایسی بات کر

رہے ہیں، کہنے لگے، بھائی! دنیا سے میں اس حال میں رخصت ہوؤں کہ یہ مسئلہ مجھے معلوم ہو، یہ بہتر ہے یا جہالت کے ساتھ مروں! میں نے اس مسئلہ کا ان کے سامنے ذکر کیا، انہوں نے اس کو یاد کر لیا۔ میں ان سے رخصت ہو کر باہر آ گیا اور راستہ ہی میں مجھے ان کی وفات کی خبر ملی[6]۔

البیرونیؒ نے زندگی کے ابتدائی سالوں میں ہی سائنس و ادب اور دوسرے علوم و فنون میں بڑا کمال حاصل کر لیا تھا۔ ایک ''منجّم'' کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ''وہ'' ڈاکٹر زخاؤ (Sachau) کے مطابق، ''یونانی اور ہندو دونوں ہی طریقوں کے ایک ماہر علم نجوم تھا[7]''۔

شاید اسی وجہ سے اس کا تعلق سلطان اور ان کے دربار سے تھا۔ غزنہؒ کی زندگی کے متعلق بھی تاریخ میں بہت کم تفصیل ملتی ہے۔ خوارزمؒ کے بعد ان کا تعلق اس عہد کے عظیم ترین حکمراں سلطان محمودؒ غزنوی کے دربار سے رہا، جنہیں ہندوستانی گرچہ خونی، لٹیرا، جنگجو، متعصب اور بت شکن کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن اپنے حدودِ سلطنت میں وہ علوم و فنون کا زبردست سرپرست اور قدردان رہا ہے۔ اس نے اپنے دربار اور غزنہؒ میں اپنی بنوائی ہوئی یونیورسٹی میں اس عہد کے عظیم ترین علماء اور مصنفین کو یکجا کر دیا تھا[8]۔ ان کے دربار سے چار سو شعراء جن میں ''شاہنامہ'' کے عظیم شاعر فردوسیؒ بھی شامل ہیں، منسلک تھے۔ گرچہ درباری جوڑ توڑ کے باعث انہیں ان کی حیثیت کے مطابق سرپرستی نہیں مل سکی۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ عتبیؒ، بیہقیؒ، ابن ورـاق بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ سوائے عتبی کے کسی نے ان کی اس آخری حیثیت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البیرونی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے مختلف حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ محمود سے ان کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ ان کے متعلق البیرونی کے حوالے اکثر مبہم ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ ''یہ بادشاہ کا فرض ہے کہ علماء اور محققوں کے ذہن کو روزانہ ضروریات زندگی کے فکر و تردد سے آزاد رکھے۔ لیکن موجودہ دور میں حکمراں اس طرح پیش نہیں آتے[9]''۔ ظاہر ہے یہ باتیں محمودؒ کے متعلق ہی کہی گئی ہیں۔ حالانکہ انہیں کے عہد میں البیرونی نے ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ اپنے اوپر مبہم تنقیدوں کے باوجود محمود نے انہیں ان کی کتاب کی تکمیل میں غیر معمولی آزادی دے رکھی تھی[10]۔

لیکن سلطان کے جانشیں مسعود نے ان کی واقعی سرپرستی کی تھی۔ مورخین نے ان کے عہد کا بڑا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ انہوں نے جب اپنی کتاب ''القانون المسعودی'' مکمل کی تو اس کو دستور کے مطابق سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ سلطان نے تین اونٹ، چاندی کے سکے انہیں بطور انعام دینا چاہا۔ لیکن البیرونی نے یہ کہہ کر اس کو واپس کر دیا کہ وہ علم، علم کیلئے حاصل کر رہے ہیں، مال کیلئے نہیں[11]۔

البیرونی درحقیقت بڑا ہی ہمہ گیر عالم و فاضل شخص تھا۔ ان کا شمار یقیناً ان چند مشاہیر علماء وفضلاء میں سے ہے، جن پر اسلامی دنیا کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ انہیں زبانوں کے مطالعہ سے ساری زندگی دلچسپی رہی۔ گرچہ ان کی مادری زبان خوارزمی تھی، لیکن وہ اپنے عہد کے عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کا زبردست عالم تھا۔ اس نے یونانی زبان بھی سیکھی تھی۔ لیکن پوری مہارت نہ ہونے کے باعث یونانی علوم کا مطالعہ محتاط عربی ترجموں ہی سے کیا۔ کئی زبانوں کے ماہر ہونے کے باوجود، خاص طور سے فارسی جو اس زمانے میں بھی ایک ترقی یافتہ زبان تھی، اپنی اوریجنل تخلیقات اور ترجموں کیلئے اس نے عربی زبان کا انتخاب کیا، کیونکہ سائنس اور علمی مباحث کیلئے فارسی یا کسی دوسری زبان کے مقابلے میں عربی زیادہ موزوں و مناسب تھی اور صحیح معنوں میں بین الاقوامی زبان تھی۔ عربی کی قدر محض اس وجہ سے نہیں تھی کہ تمام مہذب دنیا کی علمی اور سائنسی تخلیقات کے ترجمے اس میں ہو چکے تھے بلکہ ''وہ ایک ایسی زبان تھی، جس نے بذات خود'' بقول حسین نصر، ''ایک ترقی یافتہ سائنسی فکر کو بڑھاوا دیا[12]''۔

ان زبانوں کی مہارت کے علاوہ، جو محض ان کے مطالعوں اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھیں، علم نجوم، فلکیات، ریاضی، طب، منطق و فلسفہ اور دینیات پر انہیں کامل عبور حاصل تھا۔ لیکن اپنی بے پناہ علمی وسعت اور غیر معمولی بصیرت کے باوجود اپنے مشہور ترین ہمعصر حکیم ابو علی ابن سینا کی طرح وہ مغرب میں زیادہ مقبول نہیں ہو سکا۔ البتہ موجودہ دور کے مغربی علماء اور محققین نے انہیں بے حد سراہا ہے۔ ایک مستشرق، جنہوں نے البیرونی کے کارناموں کی تحقیق اور نشر و اشاعت کا کام کیا ہے، لکھا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں ان سے زیادہ ذہن رسا کسی نے نہیں پایا ہے[13]۔

ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ محمود کے دربار میں ہندو فاضل وِدّوان بھی تھے، لیکن البیرونی نے ان سے جو معلومات فراہم کیں، وہ اس سے مطمئن نہیں تھا[14]۔ چنانچہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے مقامات میں سالوں رہ کر ہندوستانی سماج وعلوم کا ذاتی مشاہدہ و مطالعہ کیا۔ انہوں نے ہندو علم و فلسفہ سے بڑی دلچسپی لی۔ اور اس مقصد کیلئے انہیں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑا۔ ان سفروں میں انہیں بڑی مصیبتیں پیش آئیں اور بے انتہا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کے مختلف گوشوں میں انہوں نے برہمن علماء اور پنڈتوں سے مباحثے کئے۔ وہ جو کچھ جانتے تھے یہاں کے علماء کو بتاتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے یہاں کے علماء سے سیکھتے تھے۔ حالانکہ برہمن علماء دوسروں کو کچھ بتانے سے کتراتے تھے۔ وہ لوگ خود کو ساری دنیا کی مخلوقات سے افضل مانتے اور دوسرے لوگوں کو بات کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان خامیوں کے باوجود البیرونی ان برہمن علماء کی ذہنی تیز فہمی اور مابعد الطبیاتی نظریات سے بے حد متاثر ہوا تھا[15]۔

البیرونی نے اپنے مشاہدات کو "تحقیق ماللھند" یا "تاریخ الھند" جسے یورپی مصنفین نے "Indica" کا نام دیا ہے، کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ زبردست تخلیقی قوت کا مالک تھا۔ اس کی تالیفات میں غیر معمولی خصوصیات کی سو سے زیادہ کتابیں ہیں[16]۔ ایرانیوں، یونانیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی تقویم سنین اور حالات پر ان کی کتاب "آثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" ہے۔ ہیت، ہندسہ اور نجوم پر ان کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ ایک کا نام "التفہیم لاوائل صناعت التنجیم" ہے، اس کا ایک حصہ اسنے فارسی میں بھی لکھا ہے[17]۔ دوسری کتاب "القانون المسعودی" ہے جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن البیرونی کو جس کتاب نے شہرت دوام بخشی وہ "تاریخ الہند" ہی ہے۔ یہ ایک نادر اور اعلیٰ پایہ کی تاریخی تصنیف ہے۔ اس میں 1030ء تک "ہندوؤں" کی تہذیب ان کا تمدن، عادات وخصائل، طور طریقے، رسم ورواج، اعمال و ظائف، میلوں، تہواروں اور ہندوستانی ادب، فلسفہ، مذہب و سائنس، اور نجوم و فلکیات غرض ان کی مذہبی، سماجی، ثقافتی، علمی، فکری، سیاسی اور معاشی زندگی کے متعلق البیرونی کے چشم دید حالات، واقعات اور مشاہدات کی بڑی قابل قدر معلومات ہیں۔ "تاریخ الہند" بڑی شستہ اور سلیس عربی میں ہے۔ لیکن اس کی تشہیر کے ذمہ دار خاص طور سے انیسویں صدی کے ایک جرمن

مستشرق اور مایۂ ناز محقق ڈاکٹر ایڈورڈ سی زخاؤ(Edward C.Sachau) ہیں، جنہوں نے 1872ء میں اس کا ایک عربی متن تیار کر کے 1885ء میں جرمن زبان میں ترجمہ کیا[18]۔اس کے بعد 1887ء میں انگریزی ترجمہ کیا اور ایک پر مغز دیباچہ کے ساتھ 1888ء میں البیرونیز انڈیا"Alberuni's India"کے نام سے شائع کرایا۔

اس کے بعد مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔اردو میں اصغر علی نے اس کے دونوں حصوں کا ترجمہ کیا ہے اور انجمن ترقی اوردو نے مولوی عبدالحق کے دیباچہ کے ساتھ 1941ء میں اسے شائع کیا۔ فارسی میں اس کے مختلف ابواب کے الگ الگ ترجمے ہوئے ہیں۔ مذہب اور فلسفہ سے متعلق ابواب کا ترجمہ اکبر دانا سرشت نے کیا ہے۔اور انہیں کے دیباچہ کے ساتھ یہ ترجمہ تحقیق ماللھند کے نام سے شائع ہوا ہے۔

1971ء میں امریکہ کے اینسلی ٹی امبری نے اپنے دیباچہ کے ساتھ اس کتاب کی ایک تلخیص پیش کی ہے۔ حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے اصرار پر ڈاکٹر قیام الدین احمد، پروفیسر شعبہ تواریخ، پٹنہ یونیورسٹی نے طلبا اور عوام کے استفادہ کیلئے نہایت عرق ریزی سے اس کی بڑی دلکش تلخیص کی ہے۔کتاب کے شروع میں ان کا ایک طویل عالمانہ مقالہ بطور دیباچہ شامل ہے۔ متعدد مشکل اصطلاحات پر نوٹس دیئے گئے ہیں۔ ہندی، بنگلہ،اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی اس تلخیص کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

البیرونی نے "تاریخ الہند" میں حالات و واقعات کا تجزیہ بڑی صفائی اور سچائی سے کیا ہے۔ان کا مشاہدہ عالمانہ، مخلصانہ اور پیشکش ہمدردانہ ہے۔وہ غلطیوں کی نشاندہی بڑی بے باکی سے کرتا ہے۔اس نے محمودؔ کے ہندوستانی حملوں کے تباہ کن نتائج کا اظہار بڑی جرأت کے ساتھ کیا ہے[19]۔اسی طرح ہندوستانی علم و تہذیب کے سلسلے میں صحیح اور غلط دونوں ہی چیزوں کی نشاندہی کی ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے متعلق البیرونیؔ کے لکھنے کا مقصد کیا تھا۔ کیا وہ شہرت اور ہمدردی حاصل کرنا چاہتا تھا؟اس نے جیسی تخلیق پیش کی ہے،اس سے شہرت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔وہ ایک سنجیدہ محقق تھا جس نے دوسرے محققین کیلئے لکھا[20]۔اس نے

اپنی خواہش کا اظہار کتاب کے خاتمہ پر کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہندوؤں سے ان کے مذہب، سائنس اور ادب کے متعلق بحث و مباحثہ کرنا چاہے تو یہ کتاب ان کے لئے تشفی بخش ثابت ہو گی[21]۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ہندوؤں کو اپنی نمائندگی کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے۔ ان کی ساری کتاب میں ہندو خود ہی اپنے مذہب فلسفہ اور ادب کے متعلق بولتے ہیں۔

البیرونی کی نظر میں ہندو عمدہ فلسفی، اچھے ریاضی داں اور ستارہ شناس تھے۔ یہ محض ان کی انکساری ہے کہ وہ ان کا شاگرد بھی ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "ابتدا میں ان کے نجومیوں سے میں اسی طرح ملا جیسا کہ ایک طالبعلم اپنے استاد سے ملتا ہے۔ حالانکہ میں اجنبی تھا اور ان کے عجیب و غریب قومی اور روایتی سائنسی طریقوں سے نابلد تھا۔ لیکن کچھ واقفیت حاصل کرنے کے بعد، انہیں میں نے ایسے عناصر دیکھانا شروع کیا، جن پر ان کے سائنس کا دار و مدار تھا۔ اور جب میں نے انہیں کچھ منطقی نتیجہ کے اصول اور ریاضی کے سائنسی طریقے بتائے تو دور دراز علاقوں سے لوگ میرے ارد گرد جمع ہونے لگے اور مجھ سے وہ طریقے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور پوچھنے لگے کہ کس ہندو استاد سے میں نے یہ باتیں سیکھی ہیں[22]"۔

البیرونی کی یہ بڑی خوبی ہے کہ ہندوؤں میں جو خامیاں، غلط اور اوچھی باتیں دیکھتا ہے، انہیں بھی چھپاتا نہیں ہے تاہم بڑی ہمدردی اور نہایت موزوں الفاظ میں انہیں پیش کرتا ہے۔ اور حسب دستور انکے ذہنی کارناموں کی تحسین و تعریف کرتا ہے اور جب بھی ہندوؤں کے سائنس اور عملی زندگی کے کسی عمدہ اور شاندار چیز کے متعلق اسے خبر ملتی ہے تو اپنے قارئین کے سامنے بڑی گرمجوشی سے پیش کرتا ہے۔ مثلاً نہانے کے مقدس مقامات میں تالاب کی تعمیر کا تذکرہ بڑے ہی تحسین آمیز کلمات میں کیا ہے[23]۔

البیرونی کے نزدیک ہندوؤں کی بڑی کمزوریاں کرۂ ارض کی قوموں سے ان کی مکمل علیحدگی، باہری دنیا سے لاعلمی اور دوسرے لوگوں سے (جنہیں وہ ملیچھ کہتے ہیں) ہمدردی اور ربط و ضبط کی کمی ہیں۔

وہ لکھتا ہے کہ "اس کا کوئی علاج نہیں ہے کہ آج کے ہندو سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک کی طرح کوئی دوسرا ملک نہیں ہے، ان کی طرح کوئی دوسری قوم نہیں ہے، ان کے بادشاہ کے طرح

کوئی دوسرا بادشاہ نہیں، ان کے علوم کی طرح کوئی علم نہیں ہے۔ وہ لوگ خطرناک حد تک اپنے علم کو بتانے میں کنجوس ہیں اور اس بات کا ہر امکانی خیال رکھتے ہیں کہ ان کے علوم سے دوسرے مستفید نہ ہوں۔ یہاں تک کہ دوسری ذات کے ہم وطنوں کو بھی اپنا علم نہیں بتاتے ہیں اور اس معاملے میں وہ اتنے سخت ہیں کہ انہیں غیر ملکی منظور ہیں مگر دوسری ذات کے لوگ منظور نہیں"۔ ان کے عقیدے کے مطابق "زمین پر ہندوؤں کے سواد نیا کی ساری مخلوق سائنس اور علوم سے بے بہرہ ہے۔ اگر آپ ان کے سامنے خراسان یا فارس کے کسی سائنسداں یا دانشور کا تذکرہ کریں تو وہ اسے آپکی جہالت سے تعبیر کریں گے۔ اور جھوٹا سمجھیں گے۔ اگر ہندو لوگ دوسرے ممالک کا سفر کرتے اور دوسری قوموں سے ربط وضبط بڑھاتے تو جلد ہی اپنے خیالات کو بدل ڈالتے۔ اسلئے کہ ان کے آباؤ اجداد اتنے تنگ نظر نہیں تھے جتنی تنگ نظر موجودہ نسل ہے[24]"۔

اس کے ثبوت میں انہوں وراہ مہر کے ایک مبالغہ آمیز قول کو بھی پیش کیا ہے۔

البیرونیؒ کے خیال میں قدیم یونان اور ہندوستان کے فلاسفہ اس کے ہم خیال تھے۔ جیسے خالص وحدانیت کا تصور کہ درحقیقت مجرد اور قادر مطلق خدا کی عبادت کرنیوالے تمام انسان ایک ہی طرح شریف اور نیک ہیں[25]۔ اصل میں اس کے ہندوستانی تہذیب کے مطالعے کا طریقہ کار بڑا سائنٹفک ہے۔ وہ اپنی کتاب میں اکثر یونانی اور ہندوستانی خیالات کا مقابلہ کرتا جاتا ہے۔ تاکہ قارئین ان افکار سے بھی واقف ہو جائیں۔ یونانی یکسانیتوں کو جتانے کا خاص مقصد یہ ہے کہ "ہندو افکار" بادی النظر میں گرچہ اجنبی معلوم ہوتے ہیں لیکن "یونانی افکار" سے ملتے جلتے ہیں۔ اس طرح وہ بتاتا ہے کہ افلاطون کے "Phaedo" میں "آواگون" یا Transmigration کی جو تفصیل ملتی ہے، وہ ہندو عقیدے سے ملتی جلتی ہے۔ البیرونیؒ کے تقابلی طریقہ کار کی ایک دوسری اہمیت بھی ہے۔ یونانی اور ہندو سسٹم کا مشاہدہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ گرچہ ان میں بہت سی موافقتیں ہیں، مگر ہندوؤں کے برعکس یونانیوں میں ایسے فلسفی گذرے ہیں جو سائنٹفک سچائی کو "وہم" سے الگ کر سکتے تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گرچہ ہندوستانی اور یونانی افکار ہم پلہ ہیں اور

بعض حیثیت سے ہندو افکار کو فوقیت بھی حاصل ہے لیکن ہندوستانیوں میں بہر حال تمیز کرنے کی کمی ہے۔ یونانیوں میں سقراط جیسی شخصیت ہے جو سچائی کی خاطر مرنا چاہتے تھے[26]۔

البیرونی کے نزدیک یونانی ایسے دوسرے سبھوں پر فوقیت رکھتے ہیں، جنہوں نے تلاش و تحقیق کی سرگرمی میں اور سائنسی چیزوں کو نہایت بلند درجہ اور نقطہ عروج پر پہونچانے کیلئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا[27]۔

ایک مسلمان کے نزدیک ہندو اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب ''اوہام'' تھے، جن میں بت پرستی کو بہت دخل تھا۔ البیرونیؒ نے لکھا ہے کہ خواہ وہ ہندوستانی ہو یا یونانی، ہر قسم کا الحاد ''محض سچائی سے انحراف ہے[28]''۔ البیرونی نے تسلیم کیا ہے کہ اونچی روایت کے برہمنی ہندو مذہب اور عام مذاہب میں بڑا فرق ہے۔ اور یہ کہ یہ عوام کے ''اوہام'' نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کا عالمانہ اعتقاد ہے، جسے ہندوستانی مذہب کی سچی نمائندگی سمجھنی چاہئے۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں البیرونیؒ کی بصیرت و معرفت کے باعث عصر حاضر میں ایک سرکردہ مستشرق عالم، آرتھرؔ جیفری کا کہنا ہے کہ ''تقابلی مذہب کے مطالعہ میں انکا جو حصہ ہے، وہ اپنے عہد میں اور شاید اپنے مذہب کی تاریخ میں حیرت انگیز ہے[29]''۔ البیرونی کے نزدیک ہندو مذہب، دوسرے اکثر مسلمانوں کی سوچ کے برعکس مشرکانہ نہیں بلکہ خالص وحدانیت ہے، جن میں تمام چیزوں کے قطعی اتحاد پر زور دیا گیا ہے[30]۔ اس نے لکھا ہے کہ جس طرح ہم لوگ اپنی کتاب ''بسم اللہ'' سے شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو اپنی کتاب لفظ ''اوم'' سے۔ اس لفظ کی شبیہ 'ॐ' (Om) ہے۔ ہندو لوگ اسے باعث برکت سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ جن میں خدا کی ''وحدانیت'' کا اقرار بھی شامل ہے۔ یہ ٹھیک وہی طریقہ ہے جو یہودی تین عبرانی ''Yods'' سے خدا کا نام لکھتے ہیں۔ توریت میں یہ لفظ اس طرح ''YIIVH'' لکھا جاتا ہے اور اس کا تلفظ ''Adonai'' اور کبھی ''yah'' سے کرتے ہیں۔ ''Adonai'' کو وہ لوگ بھی جس طرح بولتے ہیں، لکھتے نہیں ہیں[31]۔

البیرونی کو ہندوستانی مذہب، فلسفہ اور سائنس سے بڑی رغبت تھی اور کسی دوسرے موضوع کی بہ نسبت ہندوستانی فلسفہ اور مذہب کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ وسیع اور وقیع

ہیں اور وہ اپنے قارئین کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرتا ہے۔ بھگوت گیتا کے پاکیزہ خیالات نے البیرونی کے ذہن ودماغ کو سب سے زیادہ مسحور کیا ہے۔ گیتا کا سندیش انہیں اسلام کے صوفیوں کی یاد دلاتا ہے[32]۔ گیتا کے خالص اصولوں سے انہیں اس قدر دلچسپی تھی کہ دوبارانہوں نے ویدویاس جی کے اقوال کو نقل کیا ہے۔ ایک جگہ تو وہ اتنی گہرائی میں چلا جاتا ہے کہ ہندو علماء کے متعلق لکھتا ہے کہ انہیں خدا کی مدد ملی ہوئی ہے، جسے ایک مسلمان الہام الہٰی سمجھتا ہے اور قدرت انہیں راستہ دکھاتی ہے[33]۔ ممکن ہے متاخرین مسلمان ان متاخر ملحدانہ اصولوں میں ان کی گہری دلچسپی کے باعث ان میں غلطیاں پائیں اور ہندو پرست کہیں۔ لیکن ان کی کتاب میں کہیں یہ ذکر نہیں ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے مذہبی عقیدے کے متعلق بہت کم لکھا ہے اور اگر کہیں تذکرہ ہے تو بس اشارے اور کنائے میں ۔ لیکن فلپ کے حتّی (Philip k. Hitti)نے ہندوؤں سے ہمدردانہ سلوک کے باعث انہیں عقیدے کے اعتبار سے ایسا ''شیعہ''لکھاہے، جن کا میلان لاادریت کی طرف (A shi'ite with agnostic leanings)تھا[34]۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ صرف حقیقت پسند تھا اور کسی چیز کو دنیا میں سچ پر ترجیح نہیں دیتا تھا۔ عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں وہ مسلمان تھا اور شیعیت کی طرف مائل تھا، لیکن متعصب، متشدد اور خشک مسلمان نہ تھا۔ اہل عرب سے جنہوں نے سامانیوں کے تسلط کا خاتمہ کیا سخت نفرت کرتا تھا اور ایرانی قوم سے جو چیزیں تعلق رکھتی تھیں ان کا بے اختیارانہ شیدائی تھا[35]۔

بہرحال گیتا کے جو حوالے اس نے پیش کئے ہیں، ان کے بعد آنے والے غیر ملکیوں کو ہندوستانی مذہب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی ہے ۔ وہ مہابھارت اور اس میں مذکور کوروا ور پانڈو کی عظیم لڑائی کی تفصیل سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے پاس ایک کتاب ہے جس کی عظمت ہندوؤں میں اس قدر ہے کہ انکا قطعی فیصلہ ہے جو کچھ دوسری کتابوں میں ہے وہ اس میں یقیناً موجود ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ دوسری کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اس کا نام مہابھارت ہے۔ اس کو پراشر کے بیٹے ویاس نے کوروا اور پانڈو کی اولاد کے درمیان عظیم جنگ

(مہابھارت) کے زمانہ میں لکھا تھا۔اس کتاب کے اٹھارہ حصے ہیں جس کے اندر ایک لاکھ اشلوک ہیں اور ہر حصہ کا نام پوران ہے[36]۔

لیکن مہابھارت کے برابر ہی دوسری عظیم رزمیہ نظم والمیکی کی رامائن کی کہانی سے گرچہ وہ واقف تھا، لیکن واضح طور پر نہیں جانتا تھا[37]۔ وہ ویدوں اور اپنشدوں سے البتہ خوب واقف تھا۔

ویدوں کے متعلق البیرونی نے لکھا ہے کہ برہمن بغیر مطلب سمجھے ہوئے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اسی طرح آپس میں سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔ان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان کی تفسیر جانتے ہوں اور ایسے لوگ اور بھی کم ہیں جو استدلال اور مناظرہ کے طریقے پر اس کے معانی اور مطالب میں غور و فکر کرتے ہوں۔ لفظ وید کا معنی ہے اس چیز کا علم جو معلوم نہ ہو۔ ہندو وید کو خدا کا کلام مانتے ہیں جو برہما کے منہ سے نکلا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق چھتری برہمنوں سے ویدوں کو سیکھ سکتے ہیں مگر خود کسی کو تعلیم نہیں دے سکتے۔ لیکن ویش اور شودر کیلئے اس کو زبان سے نکالنا اور پڑھنا تو الگ بات ہے، سننا تک جائز نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ابتدا میں خدا نے برہما سے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ جس وقت زمین غرق کردی جائے گی تو وید کو بھول جائیگا وہ زمین کے سب سے نچلے طبقے میں چلی جائے گی اور مچھلی کے سوا دوسرا کوئی اس کو نہیں نکال سکے گا۔ ہم مچھلی کو بھیجیں گے تا کہ وہ اس کو تیرے حوالے کردے اور ہم سور کو بھیجیں گے تا کہ وہ زمین کو اپنے دانتوں سے اٹھا کر پانی سے نکالے۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دواپر (دوسرے) یگ میں جب سب دینی اور دنیاوی رسوم مٹیں تو ان کے ساتھ وید بھی مٹ گئی۔ یہاں تک کہ ویاس جی نے اسے از سر نو زندہ کیا۔ ہندو روایات کے مطابق ویاس جی نے وید کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ان کے چار شیشیہ یا شاگرد تھے۔ ہر ایک کو ایک حصہ کی تعلیم دی اور اسی کو اس حصہ کو محفوظ کرنے کو کہا۔ یہ چاروں اس طرح ہیں: (۱) رگ وید، (۲) یجر وید، (۳) سام وید، (۴) اتھر وید۔ان چاروں کے پڑھنے کا ایک خاص طریقہ ہے[38]۔

اس کے علاوہ ایسا لگتا ہے کہ وہ منو کے دھرم شاستر سے بھی واقف تھا۔ایک بار اس نے اس سے بھی حوالہ پیش کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر زخاؤ کو اس میں شبہ ہے کہ انہوں نے بلا واسطہ اصل کتاب سے یہ حوالہ دیا ہے۔

شاید وہ پہلا مسلمان تھا، جس نے پرانوں کا مطالعہ کیا۔ پرانوں سے متعلق ان کی توضیحات قارئین کیلئے نئی چیز تھی۔البیرونی نے لکھا ہے کہ لفظ پوران کے معنی اگلے اور پرانے کے ہیں۔اور یہ تعداد میں اٹھارہ ہیں اور ان میں سے اکثر کا نام حیوانوں، انسانوں اور فرشتوں کے نام پر رکھا گیا ہے اس وجہ سے کہ ان میں یا تو اس کی کہانیاں ہیں یا کسی نہ کسی طرح ان چیزوں سے منسوب ہیں۔پران انسانی تخلیق ہے اور اس کے لکھنے والے رشی لوگ ہیں[39]۔اسمرتیوں کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ یہ وید سے ماخوذ ہے اور اس کو برہما کے بیس بیٹوں نے لکھا ہے۔انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کے پاس ان کے مذہبی قانون، تھیوسوفی، زہد، اور دنیا سے موکش پانے کی بہت سی کتابیں ہیں[40]۔اس کے علاوہ سمکھیا، کپیلا، پتانجلی کی کتاب، وشنو پران، وشنو دھرم، سیتا پران، ادیتہ پران وغیرہ سے بھی اس نے حوالے پیش کئے ہیں۔ایسٹرونومی، ایسٹرولوجی، کرونولوجی اور جغرافیہ کے ابواب میں یوسیلا سدھانت، برہم سدھانت، کھنڈ کھنڈ ایکا، اتر کھنڈ، کھنڈ ایکا جیسی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں۔

البیرونی نے موجود کے متعلق لکھا ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک موجود ایک ہی چیز ہے۔ گیتا میں واسدیو کہتا ہے کہ ساری چیزیں اُلوہی ہیں اس لئے کہ وشنو نے اپنی ہی ذات کو زمین بنایا ہے تا کہ حیوان اس پر ٹھہرے۔اپنی ہی ذات کو پانی بنایا تا کہ ان کی پرورش کرے۔اپنی ہی ذات کو آگ اور ہوا بنایا تا کہ ان کو بڑھاتا رہے۔اور اپنی ہی ذات کو ان کے ہر فرد کا دل بنایا اور ذکر اور علم دونوں کی ضد اور صلاحیتیں اس میں رکھیں[41]۔

البیرونی نے تناسخ کے متعلق لکھا ہے کہ تثلیث جس طرح مسیحیت کی علامت اور کلمہ طیبہ مسلمانوں کے ایمان کا شعار ہے، اسی طرح تناسخ کا عقیدہ ہندو مذہب کا امتیاز ہے۔ تناسخ کا منکر ہندو نہیں ہو سکتا[42]۔ایرانیوں میں تناسخ کے رواج کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ مانی ایران شہر سے جلا وطن کیا گیا تو ہندوستان آیا اور ہندوؤں سے تناسخ کے عقیدہ کو اپنے مذہب میں منتقل کر لیا[43]۔

البیرونی نے لکھا ہے کہ واسدیو کے مطابق سب سے بہتر انسان وہ ہے جو کامل اور عاقل ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اس سے محبت کرتا ہے موت اور پیدائش بارہا اس پر وارد ہو چکی ہے وہ زندگی بھر کمال کی تلاش میں رہتا ہے اور بالآخر اسے پالیتا ہے[44]۔

مقامات جزا و سزا کے متعلق البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندو دنیا کو لوک کہتے ہیں۔ عالم اعلیٰ کو سورگ لوک یعنی جنت، عالم اسفل کو ناگ لوک یعنی جہنم کہتے ہیں بعض لوگ اسے ترلوک اور پاتال بھی کہتے ہیں۔ درمیانی، جس میں ہم لوگ ہیں، مدھیہ لوک یا مانش لوک کہتے ہیں۔ یہ کمانے کے لئے ہے۔ عالم اعلیٰ ثواب کیلئے اور عالم اسفل عذاب کیلئے ہے۔ وہ لوگ جو جزا و سزا کے مستحق ہوتے ہیں اپنے عمل کا پورا بدلہ پاتے ہیں۔ البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندو ہر گناہ کیلئے جہنم کا ایک خاص مقام قرار دیتے ہیں اور وشنو پران میں اس کی تعداد 88 ہزار بتائی گئی ہے[45]۔

البیرونی نے وشنو پران کے حوالے سے لکھا ہے کہ میتری نے پراشر سے پوچھا کہ جہنم اور عذاب جہنم کی غرض کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ خیر کو شر سے اور علم کو جہل سے تمیز کرنا اور انصاف کو ظاہر کرنا ہے۔ ہر گنہگار جہنم میں داخل نہیں ہوتا۔ بعض توبہ کر کے اور کفارہ ادا کر کے نجات پاجاتے ہیں اور سب سے بڑا کفارہ یہ ہے کہ ہر کام میں وشنو کا نام لیتے ہیں[46]۔

البیرونی نے دنیا سے نجات پانے کی کیفیت کے متعلق لکھا ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک دنیا کی زندگی نفس کیلئے قید ہے۔ قید کا سبب جہالت اور اس سے نجات کا ذریعہ علم کامل ہے[47]۔ گیتا میں ہے کہ انسان علم حاصل کرنے کیلئے پیدا کیا گیا ہے[48]۔ ہندوؤں کے نزدیک مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے علم حاصل ہوتا ہے اول ایسے الہام سے جس کو زمانہ سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ بچہ ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے جیسے کپیلا سادھو جو عالم اور عاقل پیدا ہوا تھا، دوم ایسے الہام سے جو زمانہ گذرنے کے بعد ہوتا ہے جیسے برہما کی اولاد جنہیں اس وقت الہام ہوا جب وہ جوان ہو چکے تھے، تیسرا سیکھنے سے اور وقت گذرنے کے بعد جیسا کہ لوگ سن شعور کو پہونچ کر علم سیکھتے ہیں[49]۔ علم سے نجات تک پہونچنا برائی سے بچے بغیر نہیں ہوتا۔ برائی کی شاخیں گرچہ بہت ہیں لیکن سب کی انتہا لالچ، غصہ اور جہالت پر ہوتی ہے اور جڑ کو کاٹ دینے سے شاخیں خود بخود

سوکھ جاتی ہیں۔اور برائی سے بچنے کی بنیاد قوت غضب اور قوت شہوت کو زائل کرنا ہے۔دراصل یہی دونوں قوتیں انسان کی سب سے بڑی دشمن اور سرکچلنے والی ہیں[50]۔

البیرونی نے لکھاہے کہ ہندوؤں کے نزدیک فروع دین بہت زیادہ ہونے کے باوجود 9 اصولوں کے اندر جمع ہیں: قتل نہیں کرنا، جھوٹ نہیں بولنا، چوری نہیں کرنا، زنا نہیں کرنا، مال نہیں جمع کرنا، پاکی اور صفائی کا خیال رکھنا بہت زیادہ روزہ رکھنا اور سادہ و سخت زندگی بسر کرنا، تسبیح و تہلیل کے ساتھ اللہ کی عبادت پر قائم رہنا۔بغیر زبان سے بولے ہوئے دل میں ہمیشہ لفظ اوم کا خیال کرتے رہنا[51]۔

البیرونی نے گیتا کے حوالے سے لکھا ہے کہ جو شخص اپنی شہوت کو فنا کر دیتا ہے وہ ضروری حاجتوں سے آگے نہیں بڑھتا اور جو شخص قدر ضرورت پر قناعت کرتا ہے وہ رسوا اور ذلیل نہیں ہوتا ہے[52]۔

مخلوقات کے مختلف درجوں اور ان کے نامون کے متعلق سانکھیا کے حوالے سے البیرونی نے لکھاہے کہ زندہ بدنوں کی تین جنسیں ہیں۔ سب سے اوپر روحانی مخلوقات-درمیانی میں انسان اور سب سے نیچے حیوانات۔روحانی مخلوقات کی آٹھ قسمیں ہیں۔ برہما، اندر، پرجاپت، سوفیہ، گاندھرو، یکش، راکھشس۔حیوانات کی پانچ قسمیں ہیں چوپایہ، جنگلی جانور، پرندے، رینگنے والے، اگنے والے یعنی درخت اور آخری انسان کی صرف ایک ہی قسم ہے[53,54]۔اس نے لکھا ہے کہ برہما، اندر اور پرجاپت جنسوں کے نام نہیں بلکہ افراد کے نام ہیں برہما اور پرجاپت دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ کسی صفت کے اختلاف سے دونوں کے نام ایک ہو گئے ہیں اور اندر سارے جہانوں کا حکمراں ہے[55]۔انہوں نے لکھاہے کہ ہندوؤں کے نزدیک ایجاد کرنا، یہاں تک کہ دنیا کا پیدا کرنا بھی برہما کی طرف منسوب ہے[56]۔ ہندو برہما کے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں۔ جو یونانی زوس (Zeus) کے بیان کرتے ہیں[57]۔ رشیوں کے متعلق انہوں نے لکھاہے کہ رشی وہ سادھو ہیں جو انسان ہونے کے باوجود اپنے علم کے سبب فرشتوں سے بڑھے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے فرشتے ان سے علم حاصل کرتے ہیں۔ رشی کے اوپر برہما کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے[58]۔ دنیا میں برہما کی کیا مثال ہو سکتی ہے اس کے متعلق انہوں نے واسدیو کے حوالے سے لکھاہے کہ دنیا

رشوت کے درخت کے مثل ہے۔ برہمااس درخت کی اوپر والی جڑ ہے، وید اس کا تنا، مختلف قسم کی تفسیریں اس کے پتے ہیں [59]۔ ہندوؤں کے نزدیک، مذہبی قوانین اور ضابطے رشیوں کا بنایا ہوا ہے اور اسی پر ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ قوانین نرائن (رسول) کے بنائے ہوئے نہیں ہیں جو اپنے آنے کے وقت انسان کی صورتیں اختیار کرلیتا ہے، نرائن صرف برائیوں کو دور کرنے آتا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں مخلوق کے فائدوں کیلئے رسولوں کی ضرورت ہے۔ مذہبی قوانین اور عبادت کیلئے اس کی ضرورت نہیں ہے [60]۔ البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوٗں کے نزدیک مذہبی قوانین منسوخ ہو سکتے ہیں۔ جیسے واسدیو کے آنے سے قبل بہت سی چیزیں جائز تھیں، جو اس کے بعد حرام ہو گئیں۔ جیسے گائے کا گوشت کہ پہلے کھانا جائز تھا [61]۔ اس نے لکھا ہے کہ پانڈو کے چار اولادیں تھیں [62]۔

بت پرستی کے متعلق البیرونی نے لکھا ہے کہ چونکہ مثال سے عوام کی طبیعت کو ایک طرح کی تسکین ہوتی ہے اس لئے جن برگزیدہ لوگوں کی تعظیم کی جاتی ہے جیسے انبیاء، اولیا اور فرشتے، ان کے نام کا بت بنالیا جاتا ہے تاکہ موت اور نظر سے دور رہنے کے باوجود ان کے احکام کو یاد دلاتا رہے اور دلوں میں مرتے دم تک ان کی تعظیم باقی رہے [63]۔ طوفان سے قبل اور طوفان کے بعد جو قومیں تھیں سب کی تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ رسولوں کے ورود سے قبل تمام انسانوں کے ایک قوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی میں سب یکساں تھے [64]۔ اس نے لکھا ہے کہ یہودیوں کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کے پردادا سروغ (Serugh) کے زمانہ سے بت پرستی کی ابتدا ہوئی اور رومیوں کے نزدیک فرنک (Frank) کے بادشاہ رولس نے اپنے حریف بھائی، رومانس، جسے اس نے قتل کردیا تھا، کی مورت سب سے پہلے بنوائی۔ [65] ہندوؤں میں بھی بت پرستی کی ابتدا کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ ایک قصہ تو راجہ امبریش اور اندر کا ہے جسے سانک (Sanaka) نے راجہ پریکش سے بیان کیا تھا۔ ہندوؤں کے نزدیک بت اسی وقت سے بنائے جانے لگے تھے۔ بعض چار ہاتھ کے اور بعض دو ہاتھ کے۔ [66] دوسری کہانی یہ ہے کہ برہما کا بیٹا نارد جو خدا کو دیکھنے کا خواہشمند تھا ایک دفعہ وہ اس کے دھیان میں تھا کہ دور ایک روشنی دیکھی۔ جب اس کی طرف لپکا تو اس سے آواز آئی

تمہاری خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ نارد نے نظر اٹھائی تو انسانی شکل کا ایک نورانی شخص دیکھا۔ اسی وقت سے مختلف صورتوں کی مورتیاں بنائی جانے لگیں۔[67] اس نے لکھا ہے کہ مشہور بتوں میں ایک ملتان کا آدت (آفتاب) بت تھا جو ہندوؤں کے مطابق تقریباً 216432 سال پہلے بنایا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے جب ملتان فتح کیا تو وہاں کی آبادی اور خوشحالی کا سبب انہیں یہی بت نظر آیا[68]۔

البیرونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بت پرستی غیر تعلیم یافتہ ہندو عوام کا طریقہ ہے لیکن جو راہ نجات کا طالب ہے اور فلسفہ اور دینیات کا مطالعہ کیا ہے اور حقیقت کو جانا ہے وہ خدا کے سوا تمام چیزوں کی عبادت سے پاک دامن ہیں۔[69] بت سازی کی ابتدائی وجہ مردوں کی یادگار قائم کرنا اور دلی تسکین حاصل کرنا تھا، مگر اصل بھولے میں آتی گئی[70]۔ گیتا میں ہے کہ بہت سے لوگ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے میرے ماسوا کے ذریعہ مجھ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کیلئے میری طرفداری میں صدقے، تسبیح اور عبادت کرتے ہیں۔ میں یہ جان کر بھی ان کی مدد کرتا ہوں اور لوگوں کو ان کی مراد تک پہونچا دیتا ہوں کیونکہ ایسا کرنے میں کوئی جرم نہیں[71]۔

ہندوستان آنے سے پہلے البیرونی کو ہندوستانی علم الحساب، علم نجوم اور تاریخ کا اچھا علم تھا، جنہیں اس نے برہم گپتا اور ان کے عربی ترجموں اور تلخیصوں کے مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے اصل سنسکرت کتابیں پڑھیں اور تعلیم یافتہ پنڈتوں کی مدد سے ان کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ خاص طور سے علم نجوم، جس میں برہم گپتا کی تخلیق اب تک معیاری حیثیت رکھتی ہے[72]۔

اس کی کتاب میں علم نجوم کا باب زیادہ مستند اور معتبر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس حصے میں قدیم ہندو علماء اور ماہرین علم نجوم خاص طور سے وراہ مہر اور برہم گپتا کے اقوال بڑی آزادی سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح علم الحساب کی ترقی میں ہندوؤں کا جو حصہ ہے اور اس میدان میں ساری دنیا خصوصاً عربوں پر ان کے جو احسانات ہیں، اس کا اسنے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب میں جائزہ لیا ہے۔ ہسٹری آف سائنس کے مصنف جارج سارٹن (George Sarton) کے مطابق:

"ہندو علم الاعداد کے متعلق البیرونی کی تفصیل، جو عہد وسطیٰ سے ہمیں ملی ہے، سب سے بہتر ہے"[73]۔

البیرونی نے لکھاہے کہ ہندواعداد کی ترتیب کیلئے حروف تہجی کا استعمال نہیں کرتے ہیں، جس طرح ہم عبرانی حروف تہجی کے ضابطہ کے مطابق عربی حروف کا استعمال کرتے ہیں''۔ چونکہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں، انہوں نے لکھا ہے۔ ''حروف کی مختلف شکلیں ہیں، عددی نشانات بھی، جنہیں انک کہتے ہیں، مختلف ہوتے ہیں''[74]۔

اس کی کتاب سے پتہ چلتاہے کہ دوسرے ہندوستانی علوم خاص طور سے علم نجوم اور علم الحساب وغیرہ کے مقابلے میں البیرونی نے ہندوستانی طب کا زیادہ گہرا اور تفصیلی مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ علم طب کے باب میں وہ سیدھے سادے ترجمہ ہی پر اکتفا کرتا ہے، جسے طبرستان کے علی بن زین نے ترجمہ کیا تھا اور اصل ''چرک'' سے حوالے نہیں دیتا ہے۔ حالانکہ ناقص ترجمہ کا انہیں اعتراف بھی ہے۔ البیرونی کے خیال میں ہندو طب کا شمار، سائنسوں کی اسی صف میں ہوتا ہے جس میں علم نجوم کا ہوتا ہے۔ لیکن علم نجوم کا ہندو ''مذہب'' سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ کتاب ''چرک'' در اصل مصنف کے نام ہی سے مشہور ہے اور علم ''طب'' میں سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق چرک آخر ''دواپر یگ'' کا ایک ''رِشی'' تھا، اس وقت اس کا نام اگنی واسا تھا۔ لیکن بعد میں انہیں چرک یعنی ''ذہین'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا[75]۔

البیرونی بعض اوقات قارئین کی توجہ اسلام کے جمہوری اصول اور مساوات کا مقابلہ ہندو مذہب کے ذات پات کی تقسیم اور اسلامی قوانین نکاح کا ہندوستان میں انکی دوسری شکلوں سے کرتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ قدیم عربوں کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کے تذکرہ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ہے[76]۔ اپنوں اور دوسروں کی خوبیوں اور خامیوں پر اس کی گہری نظر تھی۔ وہ ہمیشہ ایک سچے واقف کار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے اور دوسروں سے بھی اسے یہی توقع رہتی ہے۔ اپنے حدود و نقائص کو وہ بڑی بے تکلفی سے تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں میں ہر گز نہیں ہے جو اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ ایسے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے جس کا اسے علم نہیں ہوتا یا اچھی طرح نہیں جانتا ہے اور جب بھی ایسا موقع آیا، وہ قارئین کو آگاہ کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔

اسے ایسے ہندوستانی مصنفوں اور شاعروں سے سخت نفرت ہے جو ہمیشہ لفاظی اور قافیہ پیمائی کرتے ہیں تھوڑے الفاظ کی بجائے مترادف اور متضاد الفاظ کا ڈھیر لگادیتے ہیں۔اس طرح قارئین اصل موضوع کو سمجھنے کی بجائے تاریکی میں رہ جاتے ہیں۔ایسے ہندوستانی مصنفوں کیلئے انہوں نے نہایت طنزیہ الفاظ استعمال کیا ہے[77]۔

البیرونی ہندوؤں کے تبدیل مذہب کے حق میں نہیں تھا۔اس کا کام خود کو ظاہر کئے بغیر ہندو مذہب کو نہایت سادگی سے بیان کردینا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب میں ہندوستانی تہذیب کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس میں خود ہندوؤں ہی نے رنگ آمیزی کی ہے۔

ہندوستانیات کے مسلم فاضل کی حیثیت سے پورے قرونِ وسطیٰ ہند کی تاریخ میں البیرونی کا کوئی حریف نہیں ہے۔ہندوستانی علوم کے مطالعے اور اعلیٰ سنسکرت ادبیات کے ترجمہ کرنے میں ابو لفضلؔ اور عہد اکبری کے چند دوسرے علماء کے علاوہ کسی کو ان کی جانشینی نصیب نہ ہو سکی۔اینسلی ٹی امبریؔ (Ainslie T. Embree) نے لکھا ہے۔البیرونی پہلے مسلم معلوم ہوتے ہیں، جنہوں نے سنسکرت سیکھنے کی سنجیدہ کوشش کی ہو۔پانچ سو سال بعد اکبر کے عہد تک انکا کوئی جانشیں نہیں ہو سکا[78]۔البتہ چند مصنفین نے ان کے نقل کی کوشش ضرور کی، لیکن ان میں یقیناًہندستان کو سمجھنے کے لیے وہ جوش و خروش نہیں ہے جو درحقیقت البیرونی کا حصہ ہے۔

البیرونی جب ہندوستان پہونچا تو بنارس اور کشمیر ہندوستانی علوم کے خاص مراکز تھے، لیکن یہ دونوں جگہیں انکی رسائی سے باہر تھیں۔البتہ مسلم مقبوضہ علاقوں میں اس نے کچھ ایسے پنڈتوں کو پایا، جن سے وہ ملنا چاہتا تھا۔البیرونی کے مطابق ہندوستان میں برہمنی مذہب کا زور تھا، بودھوں کا نہیں۔ایسا لگتا ہے کہ گیارہویں صدی کے نصف اول ہی میں بودھوں کی تمام نشانیاں مرکزی ایشیا، خراسان، افغانستان اور شمالی مغربی ہندوستان سے غائب ہو چکی تھیں۔بودھ مذہب کے متعلق ان کی تحریریں کم ہیں۔اس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ انہیں بدھ مت کے متعلق کتابیں پڑھنے، بودھ علماء سے گفتگو کرنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع نہ ملا ہو۔وہ صاف لکھتا ہے کہ ''نہ تو میں نے بدھ مت پر کوئی کتاب دیکھی، اور نہ ہی کسی بودھ سے تعارف ہوا، جن سے ان کے مذہبی اصولوں کو جان سکتا''[79]۔ہندو مذہب کے بارے میں، جن برہمن پنڈتوں سے اس نے

معلومات حاصل کیں، قیاس ہے کہ بودھ دھرم کے متعلق بھی وہ کافی معلومات رکھتے تھے۔ لیکن ان لوگوں نے اس کا ذکر پسند نہیں کیا۔ ان کی کتاب سے ایک اہم اور قابل ذکر بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں وشنومت، جن کے ساتھ انکا زیادہ تر تعلق رہا ہے، کے ماننے والے تھے اور شیو کا تذکرہ محض ضمناً آگیا ہے[80]۔

البیرونی کی کتاب میں ہندوؤں کے معاشرتی حالات کا بھی نہایت ہی خوشگوار تجزیہ ہے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے رسم و رواج، طور طریقے، مذہبی تقریبات، میلوں اور تہواروں کی تفصیل نہ صرف یہ کہ دلچسپ انداز میں کر دی ہے بلکہ اس میں مہر و محبت اور افہام و تفہیم کی بڑی اچھی فضا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندو اپنے جسم کے بال نہیں کٹواتے، گرمی میں ننگے بدن رہتے ہیں اور دھوپ سے بچاؤ کیلئے سر کے بال بڑھاتے ہیں۔ مونچھوں کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ زیادہ لمبی مونچھیں رکھنا عام پسند عادت نہیں ہے لیکن جو لوگ مونچھیں رکھتے ہیں وہ لمبی اور نوکیلی ہوتی ہیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ پگڑی کو پاجامے کی جگہ استعمال کرتے ہیں جس سے مراد ''دھوتی'' ہے۔ وہ لوگ سردی کے زمانے میں روئی بھرا پاجامہ پہنتے ہیں، جس کا ''ازار بند'' آگے کی بجائے پیچھے کی طرف باندھا جاتا ہے۔ منہ ہاتھ دھوتے وقت وہ پہلے پیر دھوتے تھے اس کے بعد منہ دھوتے تھے[81]۔

ہندو مہادیو کے لنگ کی پوجا کرتے ہیں۔ پان کھانا ان کی قومی عادت میں شامل تھا۔ وہ لوگ ایک ساتھ نہیں کھاتے ہیں اور نہ دوبارہ کھانا لیتے ہیں۔ وہ لوگ کتاب کا نام شروع میں نہیں بلکہ آخر میں لکھتے تھے۔ کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت وہ لوگ اجازت نہیں لیتے تھے، لیکن رخصت ہوتے وقت ایسا کرتے تھے[82]۔

اہل ہند کی بہت سی باتیں انہیں عجیب معلوم ہوئیں مثلاً وہ لوگ آج کل کی فیشن زدہ عورتوں کی طرح اپنے ناخن بڑھاتے تھے۔ آج یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ یہ کونسا گروہ تھا۔ کھانا اکیلے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ یہ رواج قدیم خیالات کے ہندوؤں میں اب تک جاری ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ گائے کے پیشاب پینے کا عام رواج غالباً نہیں تھا لیکن یہ بعض مریضوں کیلئے استعمال کیا جاتا تھا، جو اب بھی ہے۔

وہ لوگ عام طور پر باسی کھانا پھینک دیتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد شراب پیتے تھے۔ اور گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ عورتوں کے پہننے کے زیورات مرد بھی استعمال کرتے تھے یعنی کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں، پاؤں میں کڑے اور چھڑے پہنتے تھے۔اس کے علاوہ غازہ اور ابٹن بھی استعمال کرتے تھے۔انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی عام جلسوں اور محفلوں میں پالتھی مار کر بیٹھتے تھے۔الٹے ہاتھ پر مصافحہ کرتے تھے۔ ''حدث'' کو نیک فال اور چھینکنے کو بدشگونی سے تعبیر کرتے تھے[83]۔

عورتوں کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ مرد خاص خاص موقعوں کے علاوہ اور سبھی ضروری باتوں میں عورتوں سے مشورہ کرتے تھے۔ چھوٹی اولاد کو ترجیح دیتے تھے اور لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے[84]۔

البیرونی نے قدیم شطرنج کے کھیل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ شطرنج چار آدمی ملکر کھیلتے تھے۔اور چالیں گرچہ پانسے کی مدد سے کھیلی جاتی تھیں، لیکن پانسے کے ہوتے ہوئے بھی اس میں عقل کو کافی دخل تھا[85]۔

ذات پات کی تقسیم کے متعلق البیرونیؔ نے لکھا ہے کہ ہندو چار طبقوں میں منقسم تھے۔ برہمن، چھتری، ویش، اور شودر۔ برہمن خود کو مطالعہ، پڑھانے، عبادت کرنے اور مذہبی رسم و رواج کے ادا کرنے میں مصروف رکھتے تھے۔ چھتری، راج پاٹ سنبھالتے تھے۔اور میدان جنگ میں اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ویش تجارت اور زراعت کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔اور شودر، مندرجہ بالا تینوں ذاتوں کی خدمت بجالاتے تھے۔ہندو لوگ برہمن کو تمام دوسرے طبقوں کے انسانوں سے اعلیٰ و افضل سمجھتے تھے۔ البیرونی نے ان چار خاص خاص ذاتوں کے علاوہ کچھ دوسرے نچلے طبقے کے ہندوؤں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جیسے ڈوم، چنڈال وغیرہ یہ لوگ گاؤں کی صفائی اور جوتا وغیرہ بنانے کا کام کرتے تھے[86]۔اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ گناہ اور جرم ہے، اگر کوئی اپنی ذات کے باہر کا پیشہ اختیار کرے۔ جیسے ایک برہمن تجارت کرنا شروع کردے اور ایک شودر زراعت کو اپنالے[87]۔

البیرونیؔ نے ان زیارت گاہوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، جہاں ہندو زیارت کرنے جاتے ہیں جن میں خاص طور سے مقدس شہر بنارس ملتان، کشمیر اور تھانیسر قابل ذکر ہیں[88]۔

البیرونی نے ماہ بماہ ہندوؤں کے مختلف تقریبات اور تہواروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے اکثر تہوار صرف عورتیں اور بچے ہی مناتے تھے۔ اس نے ہندوؤں کے چند مشہور اور اہم تہواروں کی فہرست بھی پیش کی ہے، جن میں مہانومی، دیوالی، ہولی اور شیوراتری قابل ذکر ہیں[89]۔

شادی بیاہ کے متعلق اس نے لکھا ہے کہ ہندوئوں میں بڑی کم عمری میں شادیاں ہو جاتی ہیں اور اس کا انتظام عام طور سے دولہا اور دلہن کے والدین کرتے ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوئوں میں طلاق کا رواج نہیں ہے۔ میاں بیوی کو صرف موت ہی جدا کر سکتی ہے۔ کثرت ازدواج کا رواج تھا۔ اور ایک آدمی بیک وقت ایک سے چار تک شادیاں کر سکتا تھا۔ بیوائوں کی شادیاں ممنوع تھیں۔ ان کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو زندگی بھر بیوگی کی زندگی گذاریں، جو انتہائی تکلیف دہ ہوتی تھی، یا شوہر کی چتا کے ساتھ جل جائیں۔ اس عمل کو ستی کہا جاتا ہے۔ اور عام طور سے عورتیں اسی کو اختیار کرتی تھیں[90]۔

البیرونی کے مطابق ہندو شادی کافی دور کے رشتوں میں کرتے ہیں۔ رشتہ دار عورتوں سے شادی کرنا سختی سے ممنوع تھا۔ جیسے ماں، دادی، پردادی، بیٹی، پوتی، پرپوتی اور بہن، بھتیجی، خالہ، پھوپھی اور ان کی لڑکیاں۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض ہندو کہتے تھے کہ بیویوں کی تعداد ذات پات سے خاص ہے۔ جیسے برہمن چار، چھتری تین، ویش دو، اور شودر ایک۔ اسی طرح اگر کوئی شخص چاہے تو اپنی ذات کی عورتوں میں شادی کرے یا اپنی ذات کے نیچے۔ لیکن اوپر کی ذات کی عورتوں سے شادی نہیں کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بچہ ماں کی ذات میں شمار کیا جائیگا، باپ کی ذات میں نہیں [91]۔

قانون وراثت کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ بیٹی کے سوا اور سب عورتیں وراثت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ منو کی کتاب میں ہے کہ بیٹی کا حصہ بیٹے کے حصے کا ایک ربع ہے[92]۔ میت کے وارث صرف مرد ہو سکتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ میت کے نیچے والوں کا حق زیادہ قوی ہے۔ اور

وہ نسبتاً اوپر والوں کے ترکہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی بیٹی اور بیٹے کی اولاد کو باپ دادا پر ترجیح ہے۔ پھر جو اشخاص اوپر یا نیچے ایک ہی حالت میں ہیں، ان میں سے جو لوگ میت سے زیادہ قریب ہیں، ان کی نسبت زیادہ مستحق ہیں، جو اس سے دور ہیں یعنی بیٹا بہ نسبت پوتے کے اور باپ بہ نسبت دادا کے زیادہ مستحق ہیں۔ جو لوگ نسبت کے بندھے سلسلے سے ادھر ادھر ہٹ گئے ہوں، جیسے بھائی اس صورت میں وارث ہو سکتے ہیں، جب کوئی وارث نہیں ہو۔ اس طرح بیٹی کا بیٹا، بہن کے بیٹے سے اور بھائی کا بیٹا ان دونوں کے بیٹے سے زیادہ مستحق ہے۔ اور اگر متعدد وارث ہوں تو سب کے درمیان برابر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اور اگر میت کا وارث نہ ہو تو اس کا ترکہ حکومت کے پاس چلا جاتا ہے۔ مگر لاوارث برہمن کے مال پر حکومت قبضہ نہیں کر سکتی ہے۔ وہ صدقہ کر دیا جاتا ہے[93]۔

البیرونی نے نہ صرف یہ کہ ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کی نہایت حقیقت پسندانہ تصویر کھینچی ہے بلکہ اس نے ہندو اور مسلمانوں کی بیگانگی دور کرنے کی کوشش میں عربی جاننے والوں کیلئے سنسکرت اور سنسکرت جاننے والوں کیلئے عربی سے کتابیں ترجمے کئے۔ ان ترجموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ ان ترجموں میں پا تنجلی اور وراہ مہر کی کتاب لکھو جاتکم قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت میں اسٹرونومی کی ایک بڑی عالمانہ اور قابل قدر کتاب وجئے نندا کی کرنا تلیکا ہے۔ اصل کتاب ضائع ہو چکی ہے۔ لیکن حال ہی میں اس کتاب کا عربی ترجمہ جسے البیرونی نے کیا ہے، دریافت کی گئی ہے۔ اس ترجمے کا نام غرۃ الزجاج ہے۔ جسکا ایک نسخہ احمد آباد کی ایک لائبریری میں بڑی خستہ حالت میں پایا گیا ہے۔[94] اس کی کتاب القانون المسعودی میں ہندوستان کے قیمتی پتھروں اور س کے شہروں کے طول البلد اور عرض البلد کا بڑا فاضلانہ مطالعہ ہے۔ اس سے ان کی اس ملک سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

البیرونی ایک غیر جانبدار، سچا، مخلص اور بے لوث ماہر ہندوستان کی حیثیت سے سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔ اس کی کتاب تاریخ الہند میں ہندوستان، ہندوستانی زندگی، سماج، علم و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے متعلق ان کے تبصرے نہایت قیمتی و قیع اور بڑی اہمیتوں کے حامل ہیں۔ البیرونی کی ان ہی باتوں سے متاثر ہو کر پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے: ''وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی وجہ سے ایسے لوگوں کو نظر انداز کرنا پسند نہیں کرتا تھا، جو

دوسرے ماحول اور فضا میں پھلے پھولے ہیں۔اس کی یہ رواداری اور بے تعصبی بلکہ بے لاگ پن ایسا وصف ہے جس کے لئے ہندوؤں کو انکا ممنون احسان ہونا چاہئے۔اور علمی دنیا بھی اس کا ممنون ہے۔اس کی یہ خوبی، اس کی لیاقت اور صلاحیت سے زیادہ قیمتی ہے[95]"۔

ہندوستانی تہذیب و تمدن اور علم و سائنس کے متعلق البیرونیؔ نے جتنی تفصیل سے لکھاہے آج تک کسی عہد کے دوسرے مصنف نے نہیں لکھا۔اور نہ ان تمام موضوعات پر یکساں قدرت رکھنا ایک آدمی کے بس کی بات ہے۔حالانکہ اسے، چینی سیاح ہوین سانگ کی طرح پورا ہندوستان گھومنے کا موقع ملا اور نہ کسی راجہ کی سرپرستی۔اس کے باوجود وہ ایک مورخ، ماہر دینیات، فلسفی، ماہر نجوم اور ایک عظیم سائنسداں کی حیثیت سے پوری انسانی تاریخ میں نہایت اہم مقام رکھتاہے۔ہسٹری آف سائنس کے فاضل مصنف، جارج سارٹن نے لکھاہے کہ وہ اسلام کے عظیم ترین سائنسدانوں میں سے ایک تھااور سب لوگ اسے تمام عہد کے عظیم ترین سائنسدانوں میں سے ایک تسلیم کرتے ہیں[96]۔

ماٰخذاور حوالے

1۔ استاد محترم پروفیسر سید حسن عسکری مرحوم کی اجازت سے ان کے لکچر سے ماخوذ

2. (a) Dr.Edward C. Sachau, Alberuni's India in Two Volumes , S Chand & Company,New Delhi,1964, Preface P-9, hearafter as Sachau.
(b) Ainslie T Embree, Introduction of an Abridgement of Alberuni's India, w.w.Norton & Company (Inc), 1971, P-6 afterwards as Embree.
(c) H.K Sherwani, Cultural Trends in Medieval India (Hears Memorial Lecture, 1965, P-77 hearafter as Sherwani.

3۔ سمعانی، کتاب الانساب بحوالہ عبدالسلام ندوی، البیرونی کمیموریشن والیوم ایران سوسائٹی کلکتہ 1951 صفحہ 252-اس کے بعد کمیموریشن والیوم

4۔ یاقوت، معجم الادبا جلد 6 صفحہ 208

5۔ سمعانی، کتاب الانساب بحوالہ عبدالسلام ندوی دیکھئے البیرونی کمیموریشن والیوم 255

6۔ یاقوت، معجم الادبا جلد دوئم صفحہ 252- کمیموریشن والیوم

7۔ الف: کمیموریشن والیوم، عبدالسلام ندوی، صفحہ 255
ب: ڈاکٹر عبدالحق، دیباچہ کتاب الہند، مترجمہ سید اصغر علی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1941، دیباچہ ج
د: زخاؤ صفحہ 9

8۔ زخاؤ پیش لفظ صفحہ 9 عبدالسلام ندوی، صفحہ 255

9. F.Krenkow, "Beruni & the M.S.Sultan Fatih No-3386 دیکھئے کمیوریشن والیوم صفحہ 195

10۔ زخاؤ صفحہ 9

11. Abdullah Yusuf Ali, Islamic Culture, Haydrabad-1927, P-427 (Note)

12. Syed Hossein Nasr, An Introduction to Islamic Cosmological Doctrines, Combridge, 1964, p.110, hearafter as Nasr; Embree Preface, p.8

13۔ زخاؤ، ٹکسٹ 1 صفحہ 152، ایمبری، صفحہ 9

14۔ ایمبری، صفحہ 11

15۔ زخاؤ پیش لفظ صفحہ 16

16۔ الدکتور شیخ عبدالحلیم، خطبہ صدارت عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ، نومبر 1975

17۔ نصر، صفحہ 110

18۔ عبدالحلیم محمود خطبہ صدارت

19۔ شیروانی، صفحہ 77

20۔ زخاؤ پیش لفظ

21۔ شیروانی، صفحہ 78

22۔ رضازادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، تہران، 1321 ہجری صفحہ 201

23۔ عبدالسلام ندوی، کمیوریشن والیوم، صفحہ 253

24۔ زخاؤ، ٹکسٹ 1، صفحہ 22

25۔ ایمبری، پیش لفظ صفحہ 11

26۔ زخاؤ، 1، صفحہ 17

27۔ زخاؤ، جلد دوم، صفحہ 246

28۔ زخاؤ، پیش لفظ، صفحہ 7-5

29. Arthur Jeffery, Albruni's, Contribution to comparative Religion, in Com Vol-P-125; Sachau, 1, 23-24

30۔ وہی، صفحہ 22

31۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 144

32۔ وہی، جلد اول، صفحہ 23-22

33۔ وہی، پیش لفظ، صفحہ 18

34. Philip K Hitti,History of Arab's Macmillan,1970 P-377,hearafter Hitti, Sachau, P-24,25,54: Embree Preface-15

35۔ کمیوریشن والیوم، عبدالسلام ندوی، صفحہ 254۔

36۔ زخاؤ، 1، 132

37. C.Bulke S.J, Alberuni and the Ram Katha in Com.Vol, P-78

38۔ زخاؤ، 1، 27-125

39۔ وہی، صفحہ 130

40۔ وہی، صفحہ 131

41۔ وہی، صفحہ 40

42۔ وہی، صفحہ 50

43۔ وہی، صفحہ 54

44۔ وہی، صفحہ 55

45۔ وہی، صفحہ 61-60

46۔ وہی، صفحہ 64-63

47۔ وہی، صفحہ 68

48۔ وہی، صفحہ 70

49۔ وہی، صفحہ 72

50۔ وہی، صفحہ 75-74

51۔ وہی، صفحہ 78

52۔ وہی، صفحہ 78

53۔ وہی، صفحہ 89

54۔ وہی، صفحہ 90

55۔ وہی، صفحہ 92

56۔ وہی، صفحہ 94
57۔ وہی، صفحہ 95
58۔ وہی، صفحہ 93
59۔ وہی، صفحہ 87
60۔ وہی، صفحہ 107-106
61۔ وہی، صفحہ 108-107
62۔ وہی، صفحہ 108
63۔ وہی، صفحہ 112-111
64۔ وہی، صفحہ 112
65۔ وہی، صفحہ 115
66۔ وہی، صفحہ 116
67۔ وہی، صفحہ 116
68۔ وہی، صفحہ 116
69۔ وہی، صفحہ 113
70۔ وہی، صفحہ 124
71۔ وہی، صفحہ 122
72۔ وہی، پیش لفظ، صفحہ 36

73. George Sarton, History of Scince, 1, p.107

74۔ زخاؤ، 174، 1
75۔ وہی، صفحہ 159-162-382
76۔ وہی، صفحہ 185
77۔ وہی، صفحہ 19-137-223-299
78۔ ایمبری، صفحہ 41
79۔ زخاؤ، صفحہ 249: ایمبری، پیش لفظ 18

80. P.N.Ojha, History & Culture of Medieval India, p.122;

81۔ زخاؤ، 179، 181-1
82۔ وہی، صفحہ 182-181
83۔ وہی، صفحہ 182-180
84۔ وہی، صفحہ 181
85۔ وہی، صفحہ 184-183
86۔ وہی، صفحہ 104-100
87۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 137
88۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 148-142
89۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 184-178
90۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 155-154
91۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 156-155
92۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 164
93۔ وہی، جلد دوم، صفحہ 165-164

94. S.H.H.Razavi, A Unique unKnown Book of Alberuni, Islamic Culture, Hydrabad, Vols-37, 38, 1963P-61; Sherwani, P-78

95. S.K.Chatterji, Alberuni & Sanskrit in Alberuni Com Volume, PP-99-100.

96. George Sarton, Introduction to History of Scince, 1, P-407, : Embree Introduction, 5.

ختم شد

اکیسویں صدی کے آغاز کے

بڑے تبصرہ نگار

خلیق انجم—اور—اسلم پرویز کے تماہی اردو ادب (انجمن ترقی اردو ہند، دہلی) میں
شائع شدہ تبصروں کا اشاریہ

2001-2014

(ش)

پیش گفتار:

پڑھنے والوں، ریسرچ کرنے والوں، اپنے مواد کو تلاش کرنے والوں، کے لئے آسانیاں پیدا ہوتی چلی جائیں، یہ ہدف سامنے رکھ کے ہم نے ایک ریفرنس سروس شروع کر دی ہے۔ وقت کو دوسروں کی نذر کرنے کا صلہ کہاں ملتا ہے، اور ممکن بھی کیسے ہے۔ اصل صلہ تو مالک الملک کے ہاتھوں میں ہے۔ و باللہ التوفیق!

مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں قاضی عبدالغفار نے انجمن ترقی اردو ہند کی تشکیل نو کی۔ صدر مقام علی گڑھ قرار پایا۔ یہ بھی طے پایا کہ رسالہ اردو کی جگہ سہ ماہی اردو ادب نکالا جائے؛ انجمن کا ہفت روزہ ''ہماری زبان'' اسی قدیم نام سے نکلے۔ اردو ادب کے ایڈیٹر آل احمد سرور قرار پائے اور ہماری زبان ہیڈ کوارٹر علی گڑھ سے قاضی عبدالغفار کی ادارت میں نکلنا شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد جب قاضی عبدالغفار نے وفات پائی تو، اور آل احمد سرور لکھنؤ یونیورسٹی سے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں غالب پروفیسر ہو کر آ گئے تو، انجمن کا نیا انصرام شروع ہوا، اردو ادب بھی یہیں سے نکلنے لگا اور ہماری زبان بھی سرور صاحب کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔

سرور صاحب اپریل ۱۹۷۴ کے پہلے ہفتے میں، ''انجمن'' کے دہلی چلے جانے کے سبب اور مالک رام صاحب کے Initiative کے باعث سرور صاحب کی جگہ خلیق انجم کو انجمن کا سکریٹری جنرل بنانے کے بعد، انجمن ہماری زبان اور اردو ادب سب کے سب مالک رام صاحب / خلیق انجم صاحب کی تحویل میں آ گئے۔ نئی تحویل ۲۰۰۰ تک جس طور پر چلی اس کا ذکر پھر کبھی۔ فی الحال ۲۰۰۱ سے ۲۰۱۴ تک جو تبصروں کا شاندار دور چلا اسے پہلے پیش کر دینا مناسب سمجھا گیا۔ یہ تبصرے اہم لکھنے والوں کے قلم سے نکلے اور تبصرہ نگاری کی ایک بڑی تاریخ بنا گئے۔

ایک دو انگریزی کتابوں پر بھی تبصرے ہوئے، انھیں ابجدی ترتیب میں نہ لے کر شروع ہی میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے ابجدی ترتیب ہے۔

(ش)

عنوان وار ابجدی ترتیب

[اندراجات کی ترتیب میں پہلے عنوان ہے، پھر مصنف/مرتب کا نام ہے،
پھر تبصرہ نگار کا نام آتا ہے۔ان کے بعد اردو ادب کا مہینہ ہے پھر سال]۔

-1 Muslims and the Media Images: News Versus Views، مرتب: اطہر فاروقی، ترجمہ: اسلم پرویز، مبصر: سلمان خورشید، اپریل تا جون ۲۰۰۹

-2 Redefining Urdu Politics in India مرتبہ: اطہر فاروقی، مبصر: فضیل جعفری، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶

-3 آبشار اور آتش فشاں، مصنفہ فضیل جعفری، مبصر: عتیق اللہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

-4 آخری دعوت [افسانے]، مصنفہ خالد جاوید، مبصر: فرحت احساس، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸

-5 اردو کا ابتدائی زمانہ، ادبی تہذیب اور تاریخ کے پہلو، از شمس الرحمن فاروقی، مبصر: خلیق انجم، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱

-6 ارسطو جاہ، مؤلفہ: تمکین کاظمی، مرتبہ: لئیق صلاح، مبصر: سرور الہدیٰ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳

-7 آزاد ہندوستان میں اردو زبان، تعلیم اور صحافت، مصنفہ اطہر فاروقی، مبصر: علی رفاد فتیحی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

-8 آزادی کے بعد ہندوستان کا اردو ادب، مصنفہ محمد ذاکر، مبصر: ابو بکر عباد، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸

-9 آفاق کی طرف کے اطراف، مصنفہ خلیل مامون، مبصر: عتیق اللہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

10- انبوہ زوال پرستاں، مصنفہ محمود ہاشمی، مبصر: دیویندر اسر، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸

11- انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی، از شمیم حنفی، مبصر: سرور الہدیٰ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷

12- انیس (سوانح)، مصنفہ نیر مسعود، مبصر: شارب ردولوی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵

13- باد صبا کا انتظار، مصنفہ سید محمد اشرف، مبصر: شمس الحق عثمانی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲

14- باقیات بیدی، مصنفہ شمس الحق عثمانی، مبصر: شمیم حنفی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳

15- بت خانہ چین مصنفہ وارث علوی، انگریزی سے ترجمہ: اسلم پرویز، مبصر: انتظار حسین، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

16- بغاوت کی پہلی چنگاری، از میری وال اسٹون کرافٹ، مبصر: بونی۔ جی۔ اسمتھ ترجمہ: خیر النسا مہدی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱

17- پس پردہ عالمی سیاست کے مخفی حقائق، مصنف: ڈاکٹر مجاہد کامران، مبصر محمد ہارون عثمانی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰

18- تاریخ ادبیات عالم، مصنفہ وہاب اشرفی، مبصر: شمیم حنفی، اپریل تا جون ۲۰۰۱

19- تحریر اساس تنقید، مصنفہ قاضی افضال حسین، مبصر: سکندر احمد، اپریل تا جون ۲۰۱۰

20- تحسین شعر، مولفہ: مغنی تبسم، مرتبہ: شاہدہ نسیم، مبصر: عامر عبداللہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳

21- تحقیق و تدوین: مسائل اور مباحث، مصنفہ حنیف نقوی، مبصر: خلیق انجم، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

22- تنقید مدیر، از قاضی افضال حسین، مبصر: فضیل جعفری، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷

23- تھیٹر، پارسی تھیٹر اور آغا حشر کاشمیری، مصنفہ انیس اعظمی، مبصر: شمیم حنفی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

24- جانکی بائی کی عرضی (کہانیاں)، مصنف: مرزا حامد بیگ، مبصر: فضیل جعفری، اپریل تا جون ۲۰۱۲

25- جدیدیت کل اور آج اور دوسرے مضامین، از شمس الرحمن فاروقی، مبصر: عتیق اللہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

26- جہاز پر کیا ہوا (افسانے)، مصنف: انور قمر، مبصر: نذیر فتح پوری اپریل تا جون ۲۰۰۹

27- جہانِ دگر، مصنف: فیاض رفعت، مبصر: شمیم حنفی جنوری تا مارچ ۲۰۱۰

28- جہانِ رومی، مصنف: مرزا عبدالباقی بیگ، مبصر: ثوبان سعید، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

29- چراغوں کا دھواں، مصنفہ انتظار حسین، مبصر: شمیم حنفی، اپریل تا جون ۲۰۰۱

30- حبیب تنویر کا رنگ منچ، مرتب: مسعود الحق، مبصر: صفدر امام قادری، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳

31- حکیم اجمل خاں، مصنفہ سید ظل الرحمن، حکیم، مبصّر: اولاد احمد صدیقی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶

32- دراصل، مصنفہ شمس الحق عثمانی، مبصر: اسلم پرویز، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱

33- درد کے خیمے کے آس پاس (شاعر)، مصنف: مغنی تبسم، مبصر: صدیق الرحمن قدوائی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴

34- دلّی جو ایک شہر تھا، مصنفہ فیاض رفعت: ، مبصر: فیروز دہلوی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱

35- دھنمڑی[حیدرآباد اردو میں](شاعری)، مصنف: حمایت اللہ، مبصر: بیگ احساس، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴

36- دور کنارا، مصنفہ مصحف اقبال توصیفی، مبصر: شمیم حنفی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶

37- دیواروں کے بیچ، مصنفہ ندا فاضلی، مبصر: شمیم حنفی اپریل تا جون ۲۰۰۲

38- رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے، مصنفہ عبید صدیقی، مبصر: احمد محفوظ، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

39- روح کے نغمے، مصنفہ: کملاداس (ثریا) مترجم: اصغر علی، مبصر: انیس الرحمن، اپریل تا جون ۲۰۰۴

40- سبزۂ ساحل، مصنف: زبیر رضوی، مبصر: سیّد خالد قادری، اپریل تا جون ۲۰۰۹

41- سحر البیان، مرتبہ رشید حسن خاں، مبصر: اسلم پرویز جنوری تا مارچ ۲۰۰۱

42- سخن در سخن اور سخن ہائے ناگفتنی (خامہ بگوش تحریروں کا انتخاب) مبصر: شمیم حنفی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴

43- سررشتۂ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، از مصطفی علی خاں فاطمی، مبصر: فیروز دہلوی، اپریل تا جون، ۲۰۱۰

44- سفر نامہ بنگلہ دیش، از سید ظل الرحمن، حکیم، مبصّر: اولاد احمد صدیقی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶

45- سونی پر چھائیاں (شاعری)، مصنف: شائستہ یوسف، مبصر: فضیل جعفری، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰

46- سیرت فریدیہ، مصنفہ خلیق انجم، مبصر: فیروز دہلوی، اپریل تا جون ۲۰۱۰

47- شافع قدوائی (مبصر)، گم شدہ دیر کی گونجتی گھنٹیاں، مصنفہ شین کاف نظام، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

48- شب کے سمندر میں۔ زندگی کا سفر، مصنفہ بشیر شاہ، مبصر: فیاض رفعت، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱

49- شعری آگہی، مصنف: باقر مہدی، مبصر: صدیق الرحمن قدوائی، جولائی تا ستمبر، ۲۰۰۱

50- شکستہ بتوں کے درمیان، مصنفہ سلام بن رازق، مبصر: شمس الحق عثمانی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۲

51- شمیم حنفی (مبصر): حاصل سیر جہاں، مصنفہ شہریار، اپریل تا جون ۲۰۰۲

52- شمیم حنفی (مبصر): دیواروں کے باہر، مصنفہ ندا فاضلی، اپریل تا جون ۲۰۰۲

53- شمیم حنفی (مبصر): مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں، اپریل تا جون ۲۰۰۳

54- شمیم حنفی (مبصر): اقبال: چند زاویے، مصنفہ سید سراج الدین، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳

55- شمیم حنفی (مبصر): دشت قیس لیلیٰ، اپریل تا جون ۲۰۰۳

56- شمیم حنفی (مبصر): مجتبیٰ حسین کے سفر نامے، اپریل تا جون ۲۰۰۳

57- شہر خاموش ہے، مصنفہ شاہد ماہلی، مبصر: سرور الہدی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

58- شہر شہر آوارگی (دیوند ر ستیار تھی کی کہانیاں)، مرتب: عبد السمیع، مبصر: مشرف علی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲

59- عالمی اردو ادب کا محمد حسن نمبر، مدیر: نند کشور وکرم، مبصر: فاروق ارگلی، اپریل تا جون ۲۰۱۱

60- عروض آہنگ اور بیان، مصنفہ شمس الرحمن فاروقی، مبصر: شمیم حنفی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۵

61- علی گڑھ میں راشد، مرتب: قاضی افضال حسین، مبصر: مامون رشید، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۲

62- عمر گزشتہ کا حسا (جلد اول و دوم)، از مخمور سعیدی، مبصر: کمال احمد صدیقی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳

63- غالب اور فنون لطیفہ، مصنفہ زبیر رضوی، مبصر: فضیل جعفری، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴

64- غالب کی چند فارسی تصانیف، از حنیف نقوی، مبصّر: رشید حسن خاں، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶

65- غالب کی فکری وابستگیاں، مصنفہ انور معظم، مبصر: شمیم حنفی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱

66- غالب (اردو ترجمہ)، از عبداللطیف، مبصر: صدیق الرحمن قدوائی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲

67- غالب۔ احوال و آثار، مصنفہ حنیف نقوی، مبصر: محمد فیروز دہلوی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸

68- فرہنگ ادبیات اردو، مصنفہ جمال عبدالواجد، مبصر: خلیق انجم، اپریل تا جون ۲۰۱۱

69- فرہنگ کلام میر (چراغ ہدایت کی روشنی میں)، مولف: عبدالرشید، مبصر: منصور عالم، اپریل تا جون ۲۰۰۹

70- فہرست کتب مطبع نول کشور، مرتبین: چندر شیکھر، عبدالرشید، مبصر: محمد فیروز دہلوی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲

71- قائم چاند پوری: حیات و خدماتم، مصنفہ شاہد ماہلی، مبصر: فیروز دہلوی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

72- کارنامۂ شوق (کلام ذوق کی شرح)، مصنف: محمد سعید، تحقیق و ترتیب: شہپر رسول، مبصر: محمد ذاکر، اپریل تا جون ۲۰۰۹

73- کتنے پاکستان (ہندی)، مصنفہ کملیشور، مبصر: شمیم حنفی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۲

74- کٹہرے میں مقید وحشیوں کی ایک شام (ترجمہ اور ترتیب: فرانس ٹر یچیٹ)، آصف فرخی، مبصر: شمیم حنفی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴

75- کشف الالفاظ دیوان غالب، مصنفہ جمال عبدالواحد، مبصر: خلیق انجم، اپریل تا جون ۲۰۰۳

76- کلاسکی ادب کی فرہنگ، مرتبہ: رشید حسن خاں، مبصر: فضیل جعفری، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۴

77- کلیات سعادت حسن منٹو (دوسری جلد)، از شمس الحق عثمانی، مبصر: عبدالرشید، اپریل تا جون ۲۰۰۸

78- گردش پا، مصنفہ زبیر رضوی، مبصر: اسلم پرویز، جنوری تا مارچ، ۲۰۰۱

79- گمان اور یقین کے درمیان، از صدیق الرحمن قدوائی، مبصر: فضیل جعفری، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

80- گنجہ باز خیال، مصنفہ وارث علوی، مبصر: سرورالہدیٰ، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸

81- لغات روز مرہ، مؤلفہ: شمس الرحمن فاروقی، مبصرہ: احمد محفوظ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳

82- لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، مصنفہ: مشرف عالم ذوقی، مبصر: فضل امام ملک، اپریل تا جون ۲۰۰۴

83- متاع سخن، از زبیر رضوی اسلم پرویز، مبصر: احمد محفوظ، اپریل تا جون ۲۰۱۰

84- مجلہ 'تنقید' (بیانات پر خصوصی شمارہ)، مبصر: فضیل جعفری، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

85- مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، مصنفہ خلیق انجم، مبصر: اسلم پرویز، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸

86- مسافر نواز بہتیرے (سفر نامۂ پاکستان)، مصنفہ عظیم اختر، مبصر: خلیق انجم، اپریل تا جون ۲۰۱۱

87- مصطلحات ٹھگی، مصنفہ رشید حسن خاں، مبصر: نیر مسعود، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳

88- معنی کا گمان، مصنفہ خالد سعید، مبصر: سید خالد قادری، اپریل تا جون ۲۰۱۰

89- مقتل، مصنفہ بلراج مین را، مبصر: سرورالہدیٰ، اپریل تا جون ۲۰۰۸

90- موت کی کتاب (ناول)، مصنفہ خالد جاوید، مبصر: فرحت احساس، اپریل تا جون ۲۰۱۱

91- مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر، مصنفہ محمد ہارون، مبصر: سلمان غازی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

92- میں رونا چاہتا ہوں (شاعری)، از فرحت احساس، مبصر: شمیم حنفی جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶

93- نجیب محفوظ کی ناول نگاری کے امتیازی پہلو شو گر اسٹریٹ کے خصوصی حوالے سے، مبصر: ابرار احمد اجراوی اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۱۴

94- نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب، مصنف: ظفر احمد صدیقی، مبصر: یونس اگاسکر، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۴

95- نیر مسعود کا افسانہ، مبصر: قاضی افضال حسین، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۲

96- ہندوستان کی خطّی میراث، مصنفہ چندر شیکھر، مبصر: خلیق انجم، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱

97- ہندوستان میں فکری اور تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر، از صدیق الرحمن قدوائی، مبصر: محمد ذاکر، جنوری تا مارچ ۲۰۰۸

98- ہندوستانی سماج پر اسلامی اور دوسرے مضامین، مصنف: محمد مجیب، مترجم: محمد ذاکر، مبصر: اسلم پرویز، جنوری تا مارچ ۲۰۱۱

99- وحید العصر وحید الہ آبادی، از واصل عثمانی، مبصر: فضیل جعفری، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷

***

تبصرہ نگاروں کے اسمائے گرامی اور اندراج نمبر

(ابجدی ترتیب میں)

ابرار احمد اجراوی 93
ابو بکر عباد 8
احمد محفوظ 38, 81,83
اسلم پرویز
32,41,78,85,98
انتظار حسین 15
انیس الرحمن 39
اولاد احمد صدیقی 31,44
بونی۔جی۔اسمتھ 16
شمس الحق عثمانی 13,50
بیگ احساس 35
ثوبان سعید 28
خلیق انجم
5,21,68,75,86,
96
دیوبندر اسر 10
رشید حسن خاں 64
سرور الہدی
6,11,57,80,89

سکندر احمد 19
سلمان خورشید 1
سلمان غازی 91
سید خالد قادری 40,88
شارب ردولوی 12
شافع قدوائی 47
شمیم حنفی
14,18,23,27,29
,36,37,42, 51-
56,60,65,73,74
,92
صدیق الرحمن قدوائی
33,49,66
صفدر امام قادری 30
عامر عبداللہ 20
عبدالرشید 77
عتیق اللہ 3,9,25
علی رفاد فتیحی 7
فاروق ارگلی 59

فرحت احساس 4,90
فضل امام ملک 82
فضیل جعفری 2,
22,24,45,63,
76,79,84,99
فیاض رفعت 48
قاضی افضال حسین 95
کمال احمد صدیقی 62
مامون رشید 61
محمد ذاکر 72,97
محمد فیروز دہلوی
34,43,46,67,
70,71,
محمد ہارون عثمانی 17
مشرف علی 58
منصور عالم 69
نذیر فتح پوری 26
نیر مسعود 87
یونس اگاسکر 94

***

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل

مطابق فارم نمبر۱، قاعدہ نمبر۳

۱۔ جرنل کا ٹائٹل	:	خدا بخش لائبریری جرنل
۲۔ وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محمد جاوید اشرف
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۵۔ ایڈیٹر کا نام	:	ڈاکٹر شائستہ بیدار
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۶۔ ملکیت	:	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

میں محمد جاوید اشرف اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محمد جاوید اشرف

دکتر محمد صادق حسین

تاریخ بنارس مصنفۂ غلام حسین خان: معرفی نسخۂ خطی

تاریخ بنارس یکی از مہم ترین نسخه های خطی فارسی است که در سراسر جهان فقط دو تا نسخہ خطی آن دریافت شده است، یکی از آن در کتابخانۂ عمومی شرقی خدا بخش پتنا و دومین در کتابخانہ بودلین لندن نگه داری می شود۔ این نسخۂ خطی تاریخ قرنِ ہیجدھمِ میلادی همان شهر روشنایی واقع کنار رودگنگ است که از نام کاشی، بنارس، محمد آباد و وارانسی یاد کرده می شود۔ مؤرخ این تاریخ غلام حسین خان است که مولدش شاہجہان آباد بود۔ اجدادش از شروع به خدمت شاہنشاہی تیموریان هند پیوسته بودند۔ پدرش ہمت خان هم در خدمت فرخ سیر آمده تاعالمگیر دوم خدمت این خانواده کرده بود۔ غلام حسین درحدود سال ۱۱۵۴هجری/۱۷۳۲ میلادی به دنیا آمد۔ او در تلاش معاش در سال ۱۷۶۰ میلادی از شهر دہلی ہجرت کرد و چندی در شهر فرخ آباد، لکھنؤ و بنارس مانده در شهر پتنا سکونت اختیارکرد۔ او چہار سال در این شہر زندگی می کرد و در سال ۱۷۶۴ میلادی به بنارس رفت و در خدمت راجه بلوند سنگھ پیوست و تا زمان راجه چیت سنگھ از دربار راجگانِ بنارس ارتباط میداشت۔غلام حسین تا ۱۷۸۱ میلادی در بنارس ماند ووقتیکه زمینداری راجه چیت سنگھ را دولت انگلیسها به تصرف آوروند، راجه از بنارس فرارکرد و غلام حسین هم همراہی او شد(۱)۔غلام حسین واقعاتی که از زمان راجه بلوند سنگھ تا راجه چیت سنگھ به وقوع آمده آنرا عیناً مشاهده کرده تاریخ بنارس را تنہا نوشت۔ چنانچه او می نویسد:

> ''چنانچه خامه حقایق نگار غبار کوی ناکامی ذره ہوای گمنامی از اغراق وتصنع برگران غلام حسین خان ابن ہمت خان که عمری غبار آستانه دولتش بوده وبه ضیا اندوزی مهر مرحمتش ظلمت اخیر طالع زدوده متصدی تحریر وقایع ریاست این دودمان عالیشان است تصدیق این معنی می نماید(۲)''۔

این نسخۂ خطی کتابخانۂ خدا بخش که شمارۂ اش HL159 است ۲۲۰ برگ دارد و ہر برگ

۱۳ سطر و پیمایش آن ۶ × ۴/۸۳ ؛ ۴×۶ است۔ تاریخ کتابت ندارد۔ فہرست ساز مولوی عبدالمقتدر این رانسخۂ قرن ہیجد ہم میلادی بہ شمار آوردہ است۔ نام کتاب ہیچ جا در این نسخہ نونوشتہ شدہ است ۔ نام تاریخ بنارس را تنہا فہرست ساز دستی کتابخانۂ خدا بخش داداہ است و باین مناسبت دادہ است کہ رویداد ھائیکہ دریں نسخہ ذکر شدہ اند، مربوط بہ تاریخہای بنارس است۔ در تنہا فہرست خدا بخش دادہ است وتوضیحات بہ تفصیل درآردہ شدہ است واین جاھم نام لو پیدا نیست۔

No. 608: ''An annonymous history of the Zamindars of Banaras from the time of Raja Mansa Ram to the deposition of Rajah Chait Singh A.H. 1195= A.D. 1780 Author :Ghulam Husayn Khan ibn Himmat Khan,

غلام حسین خان ابن ھمت خان

The work is preceeded by an introduction written by Ghulam Husayn Khan's grandson Subhan Ali" ....

(۳) ھمین طور درنسخۂ بودلین ہیچ نام این نسخۂ خطی نونوشتہ شدہ است وفہرست ساز تفصیلات را این طور نوشتہ است:

"2472. Ms. Ind. Inst. Pers. 20

An untitled history of the zamindars of Benares from Mansaram to the deposition of Cait Singh in a.h.1195 = a.d.1780, compiled by Ghulam Husain Khan b. Muhammad Himmat Khan, and edited by his grandson Subhan Ali Khan b. Hasan Ali Khan. See Storey, no.921.

The only hitherto recorded copy is Bankipore vii. 608, which is described in the catalogue as 'lacking one or two folios at the end'. It appears, however, from the present copy that all that is missing after the word riydsat (quoted as the last word in the Banki pore copy) is the following:

مہاراجہ والا جاہ کہ مہاراجہ ایشری پرشاد سنگھ نراین سنگھ بہادر کہ بالاستحقاق وارث دودمان رفیع الانسان است ایزد لا یزال تا دور ثابت و سیار بر چار بالش ابہت وشوکت متمکنش دارد۔

Begining of the editor's preface, f. ib

ارتقای مرقات سخن بحمد وثنای بی منتها خالقی را سزاوار است

Copied by Sayyid Hasan Ali, native of Allahabad; undated, but early 19th century. Ff. 151, 11. 15; Nasta'lik; size, 12^x7^ in."(٤)

در حالیکه ولیم کروک(Wlliam Crook)این تاریخ غلام حسین را ذکر السیر نامیده است، او می نویسد:

"The following extract is translated from the Zikr-al-Sair, written at Cawnpore in1221 H.(20th March 1806-9th March 1807) by Ghulam Husain Khan, son of Himmat khan, a native of Shahjahanabad(Delhi). " (٥)

وهم درکتابخانه برطانیه ، سینت پنکراس(St. Pancras, British Library) شاید همین نسخهٔ بنام ذکر السیر نگهداری میشود وتوضیحاتی که ولیم کروک داده ازین پیدا می شود که این همین نسخه ایست که نگهداری میشود(٦).

این نسخهٔ تاریخ بنارس کتابخانهٔ خدا بخش دو مقدمه دارد. یکی از آن مقدمهٔ سبحان علی ابن حسن علی خان نوهٔ غلام حسین خان است. سبحان علی هدف خودش را در مقدمهٔ خود اینطور بیان می نماید:

> ''حالیا این کور سواد دبستان استعداد خواست که آن تالیف منیف را به منصهٔ اشتهار در آرد وسعی آن مغفور را مشکور نماید لیکن چون آن لالی آبدار بتلالو لمعان اغلاق برق چشم ناظرین می گرفت و بدین جهت طبایع راغبان ادراک سیر وآثار غالبا بحسن قبولش نمی پذیرفت به اقتضای وراثت کسوت انتصاب ثانیش پوشانید وبحلیه سلاست عبارت متجلی گردانید وحق نمک خوارگی آن اوجاق عالی رواق ولو بالواسطه بر آن داشت که این نسخهٔ بلاغت پیرا را نامزد باتحاف پیشگاه وارث آن ریاست مشتهر فی الآفاق .... الامیرابن الامیرابن الامیر مهاراجه ایسری پرشاد نراین سنگه بهادر .... فارغت گرداند وبه معنی ودیعتی است که به مالکش رساند''.(٧)

هر دو مقدمهٔ سبحان علی و غلام حسین خان به آب طلا منقش گردیده است و کاغذ های

رنگ گوناگون را دراین نسخه به کار برده شده است۔ این تنها نسخۂ خطی که در هند دریافت شده، در کتابخانۂ خدابخش وجود دارد واین طور آغاز می شود۔

''حمد و ثنای بی منتہا خالقی را سزاوار است که از خاک تیرہ ابوالبشر علیہ السلام آفریدہ بہ فرمان نفخت فیہ من روحی خلعت حیات پوشانیدہ الخ''۔ (۸)

دولت تیموریا ہند پس از وفات اورنگزیب رو بہ تنزلی آمد وصوبہ داران ریاست ھای مختلف پس از رحلت محمد شاہ در سال ۱۷۴۸ میلادی منطقۂ خودش را آزاد اعلام کردند و درنتیجہ آن ریاستہای مختلف چون حیدرآباد، بنگال، اودھ وغیرہ بہ وجود آمدند۔ بنارس در زمان اکبرشاہ صوبۂ اللہ بادشد و چہار سرکار (ضلع) جونپور، بنارس، چنار و غازی پور می داشت۔ تا زمان محمد شاہ این صوبہ قسمت دولت تیموریان ہند بود ولی در سال ۱۷۲۸ میلادی این منطقۂ در ریاست اودھ آمد وسعادت علی خان در سال ۱۷۳۰ میلادی نواب اودھ مقرر شد۔ سرکارہای غازی پور، جونپور و بنارس زیر تسلط میر مرتضی خان بود۔ سعادت علی خان این سرکار ہا را آزاد کنانیدہ بہ صوبہ اودھ درآورد و برای انتظام و بند و بست این سرکار بہ میر رستم علی خان بہ عوض ہشت لک روپیہ داد و میر رستم علی خان ہمہ اختیارات، مالی، دیوانی وفوجداری را بدست آورد۔ بنیان گرای بنارس جدید منسارام، درخدمت میر رستم علی خان پیوست۔ پدرش منورنجن سنگھ کہ باشندہ دہ تہتہرا (گنگاپور) بود و نیم دہ زمینداری داشت۔ او چہار پسر منسارام، میان رام، داسارام، دیا رام می داشت۔ منسا رام اول بہ خدمت راجہ کسوار کہ راجہ ای پیری سال بود پیوست۔ وقتی کہ راجہ کسوار بہ ہمراہ خود منسارام را بہ نزد میر رستم علی خان برای ملاقاتی می رفت۔ منسا رام بہ میر رستم علی خان راہ و رسم پیدا کردہ درخدمت او آمد ومعتمد خاص خان شد۔ ہنگامیکہ منسا رام از ہمہ امورمملکت داری آشنا شد برای معزولی میر رستم علی خان بہانہ ای ساختن آغاز کرد۔ او در ہدف خودش موفق شد و چہار لک روپیہ در مالگزاری بیش از میر رستم علی خان اضافہ کرد و بہ توسط میر قلی خان زمینداری بنارس را بدست آورد۔ منسا رام، زمیندار کوچک گنگا پور، بہ ذکاوت و فراست خود در سال ۱۷۳۸ میلادی میر رستم علی را بہ کنار گذاشتہ مستقیماً نظامت بنارس از نواب اودھ برگرفت۔ غلام حسین خان در این کتاب ذکرحوادث و واقعات زمان منسا رام را بدین عنوانات

زیردر آورده است۔

(۱) ذکر ارتقای مدارج راجہ منسا رام کہ مقدمہ ظہور تباشیر صبح اقبال آن فرآرندہ لوای دولت خدا داد است

(۲) ذکر حاضر آمدن و سرفراز گشتن بریار سنگھ بہ عطای سروپا وانعقاد بزم طوی راجہ زادہ چون طالع بلوند سنگھ

(۳) ذکر انصرام دادن راجہ بلوند سنگھ کاروبار محالات زمینداری

(۴) ذکر رخصت گرفتن راجہ بلوند سنگھ از پدر مہربان و روانہ گشتن بہ سمت اضلاع کوہستان

(۵) تاختن راجہ بلوند سنگھ بر قریات اطراف قلعہ لطیف پور و محاربہ با ملک فرخ حاکم آن قلعہ و کشتہ شدن او

(۶) ذکر تمرد زمینداران پرگنہ پتھیتہ و بہ کیفر کردار رسیدن

(۷) ذکر عنایت فرمودن راجہ خلعت فاخرہ مع سند قلعداری لطیف پور و پتھیتہ بہ بابو بیجناتہ سنگھ و برگزیدن بابو بہتکرای امراو سنگھ را بہ نیابت خود وسوانح دیگر

(۸) ذکر تاختن راجہ بلوند سنگھ بر قلعہ کواکھو و جراحت برداشتن وزچشم زخم رسیدن بہ سپاہ ظفر پناہ

(۹) محاربہ ثانی با زمینداران ضلع کواکھو بہ تسخیر قلعہ علم فیروزی برافراشتن

(۱۰) ذکر نہضت فرمودن راجہ بلوند سنگھ بہ بنارس حسب ایمای پدر بزرگوار برای معالجہ و شفا یافتن و ترتیب محفل ضیافت میر رستم علی خان

(۱۱) ذکر اطاعت برفتن زمینداران منگرور و فراریان پہٹیٹہ و آباد شدن بہ جاھای خود از مرحمت پوزش پذیر راجہ بلوند سنگھ

(۱۲) ذکر اشتعال نائرہ حسد ابنای میر رستم علیخان و پی بردن راجہ بلوند سنگھ بہ آن و ایمن و مصؤن بودن از مکاید ایشان

(۱۳) ماجرای انہدام اساس ایالت میر رستم علیخان و ایراد حدوث واقعہ عزت انجام آن نوئین عالیشان و پسرش سلامت علیخان

(۱۴) سرفرازی یافتن راجہ منسا رام بحصول سند و خلعت فوجداری سرکار بنارس و جونپور وخدمت ملبوس خاص آن ھردو سرکار

(۱۵) ذکر تسخیر قلعہ اکوہری

(۱۶) ذکر مرض الموت و جامہ گذاشتن را منسارام

پس از وفات راجہ منسا رام پسرش بلوند سنگھ در سال ۱۷۳۸ میلادی جای پدر را گرفت و پس از یک سال سند زمینداری از نواب اودھ و خطاب ''راجہ'' بہ شاہ تیموریان ہند بدست آورد۔ غلام حسین در کتاب خود جریانات و واقعات دوران راجہ بلوند سنگھ را مفصلاً بیان کردہ است و آنہا را بہ عنوانات زیر بہ سلک تحریر در آوردہ است:

(۱) ذکر رفتن راجہ بلوند سنگھ حسب الطلب بہ حضور نواب مستطاب و یافتن سند بحالی ملک و خلعت و خطاب

(۲) ذکر تسخیر قلعہ بجی گرھ

(۳) ذکر تدارک بدلاپور متعلقہ جونپور و زخمی شدن راجہ از دست فرستادگان اقربای مقہور

(۴) ذکر محاریب راجہ بلوند سنگھ با علی قلی خان رسالہ دار و ہزیمت دادنش با وصف کمی سپاہ و قلت سامان کارزار بتائید نصرت کردار

(۵) بہ پایان آمدن سرکار غازی پور بہ تصرف راجہ بلوند سنگھ بغیر جنگ و جدل از عزل فضل علی خان و رفتنش بحضور نواب شجاع الدولہ بہادر بہ امید بحالی و پایان کاران خان ذیشان بہ مشیت ایزد عزوجل

(۶) بیان تادیب بومیان بعض محال متعلقہ غازی پور از قوم راجپوت معروف بسنیکر و بعدت و عدت مفرور در رسیدن چشم زخمی تاشیر عین الکمال براجہ بلند اقبال ومحفوظ ماند اش بصیانت ایزد ذوالجلال

(۷) اشکر یزی خامہ دل دو نیم در بیان سفری شدن راجہ ازین نشاۃ فانی درعین زمان نشاط و انبساط و کامرانی

راجہ بلوند سنگھ پسری نداشت تنہا دختری کہ از رانی گلاب کنور زادہ کہ وی بہ درگ و جی سنگہ زمیندار سرسا در تر ہوت بود ازدواج کرد۔ پانا، زن داشتہ راجہ بلوند سنگھ بود وازبطن وی دو پسر چیت سنگھ وسجان سنگھ تولد یافتند۔ درگ وجی سنگھ می خواست کہ پسرش مہپ نراین سنگھ پس از بلوند سنگھ راجہ بنارس بشود کہ اختیار حقیقی دارد۔ طرفی دیگر برادر زادہ بلوند سنگھ منہیار سنگھ کہ راجہ ہم

قول داده بود یقین داشته بود که او پس از بلوند سنگھ تخت بنارس بدست خواهد آورد۔ ولی اوسان سنگھ چیت سنگھ را می خواست۔ او بہ طور مخفی بہ نواب وزیر الممالک بہ عوض بیست و دولک روپیہ نذرانہ و دولک و پنجاه ہزار روپیہ اضافہ مالگذاری بندوبست بنارس را فراہم آورده بود۔ وقتی کہ راجہ بلوند سنگھ فوت کرد و ہمہ برای سوزاندن جسد وی بہ رود گنگا رفتہ بودند در ہمین ساعت اوسان سنگھ تخت نشینی چیت سنگھ را اعلام کرد و بدین صورت راجہ چیت سنگھ تخت بنارس را بدست آورد۔ مؤرخ این تاریخ واقعات و حادثات دوران مہاراجہ چیت سنگھ را بہ عنوان زیر شرح داده است۔

(۱) نغمہ طرازی عندلیب قلم بہ بیان مسند نشینی مہاراجہ چیت سنگھ آن نوگل بوستان جاه و جم

(۲) ذکر عنوان ماند و بود راجہ جوان بخت و جوان سال وانہماک بہ عیش وعشرت بحد کمال

(۳) ذکر آمدن نواب مالک الرقاب نواب شجاع الدولہ بہادر از سمت مغرب و آمدن نواب گورنر جنرل وارن ہشتن صاحب بہادر از جانب مشرق برای ملاقات ہمدگر در بنارس وعتاب نواب بر مہاراج و رفع آن بر سرپرستی نواب گورنر جنرل بہادر

(۴) نیرنگی فلک رنگ آور نیلہ گون و پختن اش بر ہمی ریاست راجہ غافل از بقلیات دہر بوقلمون

(۵) ذکر بساط تازه چیدن چرخ دوار برای چیدن بساط حکومت راجہ چیت سنگھ و اخراجش از ملک و دیار

(۶) حکایت عبرت افزا و جور واعتداد فرمودن طامس گریم صاحب برین بی سروپا

(۷) آمدن نواب گورنر جنرل وارن ہشتن صاحب بہادر بہ بنارس بادل پرکین وقید کردن راجہ چیت سنگھ بہ اغوای معاندین و وقوع محاربہ بہ نہج شگرف بلا عمد بہ محض مشیت ایزد عز وجل وترک خانمان و جاده پیمای راجہ بہ صحرا و جنگل

(۸) املای ماجرای آمدن کنپنی ھای تلنگہ وکوره بتاریکی شب بارادہ شبخون برموچال پتہ و روانہ نمودن صبح مقصود و کشتہ شدن آنہا از دست مردم مورچال و باز گشتہ رفتن بندامت ازآن حرکت بی سود وشورش دہاقین باصغای شکست افواج انگریزی و رفتن نواب گورنر ہشتن با حال گدای بحصن حصین مع لحقہ وتا بعین

(۹) استعانت نواب گورنر بہادر از نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر ہزبر جنگ و عزم نہضت فرمودن آن دستور اعظم بی درنگ و اول فرستادن امیرالدولہ حیدر بیگ

خان بہادر مدارالمہام وشرح ذکر وقایع وصادرات آن ایام

(۱۰) اساس افگنی تحریر درتخریب بنیان ثبات وقرار راجہ چیت سنگھ وتسخیر قلعہ بجی گرھ بی آویزش و جنگ بہ تدابیر وتدارکات صاحبان بافرھنگ فرنگ

(۱۱) تتمّۂ احوال دل سرد بہای مہاراجہ چیت سنگھ از امداد واعانت و رفع خلجان دسترس ارکان دولت انگریزی و صیانت مہاراجہ عالیجاہ نوئین ذی فتوت و سراپا کیاست و باطاع تمکین مہاراجہ مہیپ نرائن سنگھ بہادر برؤساده ریاست انقطاع امید از اعاده معدوم یعنی عود ایالت

این تصنیف غلام حسین خان نہ فقط اہمیت تاریخی دارد بلکہ دارای مختصات ادبی ہم است۔ تاریخ بنارس را درادب فارسی یکی از ارزنده ترین نثر قرن ہیجد ہم میلادی می توان سنجید کہ در ہند نوشتہ شده است۔ نویسنده در این تالیف منیف دوگونہ شیوۂ نویسندگی را بہ کار برده است۔ مقدمۂ این کتاب تاریخ درنثر مرصع نوشتہ شده است کہ نمونہ آن در ذیل نقل می شود۔

''حمد و ثنای بی منتہا خالقی را سزا وار است کہ از خاک تیره ابوالبشر علیہ السلام آفرید بہ فرمان نفخت فیہ من روحی خلعت حیات پوشانیده خلیفہ روی زمین گردانید و بہ عطای تشریف علم آدم الاسماء کلہا مسجود ملایک ساختہ سر قدرش باوج عرش رسانید و مبدعی کہ ارض و سما رشحہ از سحاب مدرار ابداعش و صانعی کہ ثابت و سیّار نقطہ از دفاتر اختراعش ملکش پایدار و بی زوال و سلطنتش بری از وسمۂ تغیر و انتقال جل ثناوه عظمت کبریاوه واز عنایت شاملہ ومرحمت کاملہ ...... افروختہ(۹)''۔

ولی غلام حسین در بیان احوال و واقعات نثر ساده را بہ کار برده است و واژه ہای ہندی ھم جابجا بہ چشم می خورد۔

''دراین اثناء مہاراجہ عالیجاہ سیندیہ بہادر از راجہ جی نگر شکست فاش خوردند و معرکہ غلام قادر خان افعال وچشم برکند شاه عالم بادشاه درآن ممالک اغتشاش عظیم روداد و بہ محض صیانت ایزدی عیالم نزدمن رسیدند عذرخواستم باز بہ اصرارحکم طلب رسید اعتذار الضعیف پیری ساختم

و مفاد این اشعار مؤلفه خودم را عرضه دادم''(۱۰)۔

غیر از مختصات لفظی این کتاب مختصات معنوی هم دارد۔ نویسنده دراین تالیف خودش نثر به نظم آمیخته را به کار برده است۔ او دوران نگاشتن حادثات و جریانات کلام خود را از اشعار گوناگون غزل، رباعی، مثنوی و قصیده مزین کرده است۔ اشعاریکه او به کار برده است از شاعران برجسته ادب فارسی چون فردوسی، انوری، سعدی، حافظ، حزین، قتیل وغیره گرفته است۔ تذکر کردنی است که نویسنده اشعار خودش را هم درآورده است و پس از مطالعه اشعارش هویدا می شود که او شاعر برجسته فارسی هم بود۔ اشعار خود که نویسنده دراین نسخه ذکر کرده است او را نشان داده است و برای آن واژهٔ ''لمولفه'' نوشته است۔ اینگونه اشعار چندوی در زیر ذکر کرمی شود۔

لمولفه:-

فریاد و ناله آه چه سود است ای پسر　　هر کس که رفت باز نیامد ازین سفر

لمولفه:-

درین دار ناپایدار جهان　　نماند و نماند کسی جاودان
سکندر کجا هست و دارا کجا　　فریدون و ضحاک و جم وی فنا
نبردند همراه خود تاج و تخت　　مگر حسرت و درد و اندوه سخت
عبند د دل خویش عاقل بدان　　که بگذاشتن باشدش بیگمان(۱۱)

لمولفه:-

هرچه بادا باد اینک باد میدانست و تیغ　　نیست مارا درصف مردان بجان دادن دریغ
برکشاد کار باید مرد را بندد کمر　　هست اتمام از خدا وسعی از سوی بشر(۱۲)

لمولفه:-

سپرها کشیده برخ آن سپاه　　روان از دوسوهم چو ابر سیاه
علم در کف هر یکجا بود تیغ　　درخشان چون برق اندازان تیره میغ
بیارد ازان سخت باران تیغ(۱۳)

وقتیکه راجه بلوند سنگھ فوت کرد غلام حسین مادهٔ تاریخ وفاتش را ساخت که نقل می شود:-

راجه بلوند آنکه با حسن عمل داشت راضی خلق را و شادمان
چون ازین دار فنا رحلت نمود در قلمرو ماتمش گشته عیان
سال فوتش فکر گفتار از الم رفته راجه های افسوس از جهان

☆

بلوند چو از قضا کرد در عین شباب و جاه و اقبال
پنجشنبه وغرهٔ جمادی آخرشدش اول شب امال
تاریخ وفات او ز سنبت هژده صد و بست وهفت جو سال[۱۴]

درموقع مسندنشینی راجه چیت سنگھ، غلام حسین قطعهٔ تاریخ جلوس اوساخت :

هرگاه چیت سنگھ آن صدرنشین بر جای پدر نشست فرخنده چین
اندوه خجل فگند سر رفت ز دهر هر کس بدعای خیر گویان آمین
تاریخ جلوس هاتفی گفت چنین برمسند راج شد ز صد یمن مکین[۱۵]

علاوه ازین اشعارهای مختلف شاعران گوناگون زبانهای فارسی واردو و هندی را در بیان متن بکار برده است که این اشعاراهمیت ادبی این نسخه را اضافه می کند ـ چند از اشعار شاعران این زبانها راکه غلام حسین دراین نسخه بکار برده است در زیرنقل می شود:

آن دولتی که می طلبیدیم سالها پرسیده راه خانه و خود بر در آمده است

☆

بلا آتش فتنه را کرد تیز تو گفتی پدیدار شد رستخیز

☆

هم سرکش و جاهل جنگجو چو شمشیر آهن دل و سخت رو
به بحر وغا جملگی همقدم همه بسته چون موج دامان بهم

☆

زبس کرد کز چالش انگیختند زمین و فلک باهم آمیختند
زجوش درون مرد را پی به پی ز هر موئی خون جست بر جای خوی

ز شمشیر چاک افگن تابناک   بر آمد ز هر جانبی چاک چاک
بل بک شده سینها از سنان   ساز آن سبک تماشا کنان
هراسندگان را در آن رستخیز   شد از سیل خون بسته راه گریز

☆

ای آمدنت باعث آبادی ما   ذکر تو بود زمزمه شادی ما

☆

آن سبک سیر که گر کرم عنانش سازی   از ازل سوئے ابددر ابد آید بہ ازل
قطره ہا کش دم رفتن چکد از پیشانی   شبنم اساس نشنید که رجعت بکفل

☆

ای عروس هند از بخت شکایت منما   حجلۂ حسن بیارای که داماد آمد

☆

نمودند در پیش آن سبز کاخ   بساطی چو میدان همت فراخ
زبس سایبانهای زرینه تار   هوا بود چون پرده زر نگار
کشیده بگردون سایبانها   فرو پوشید عیب آسمانها
بهر دیوار نقشی کرده پرکار   فلک حیران شد چون نقش پرکار

☆

ز بس شمع کو مجلس افروز بود   شب تیره روشن از روز بود
دران بزم چو گلشن از هر کران   چو بلبل نواساز را مشگران
مغنی چوزهره به را مشگری   صراحی درخشنده چون مشتری
در خیال ترک کار روزگار افتاده ام   به ازین کاری نمی دانم که کار افتاده ام
جوهر قابل بود از تربیت ها بی نیاز   رفته رفته شیر در با دام روغن می شود

☆

نیش خاری نیست گر خون شکاری سرخ نیست   آفتی بود این شکار افگن کزین صحرا گشت

☆

یا با مرادبر سر گردون نهیم پای با مرد وار درسر همت کنیم سر

☆

عروس ملک کسی در کنار گیرد چست که بوسه بر لب شمشیر آبدار زدند

☆

خان زرینه چه ساری رای زرین بایدت جهد باید ملک ران کن اگر این بایدت
بادرشتی های گردون سازکاری کن بلطف بر کنار تخت ملک از بزم بالین بایدت
کز عروس سلطنت را می کنی عقد نکاح ترک مهر خویشتن از بهر کابین بایدت
روی در روی سپر کن چشم بر پرچم گماز کزنظر در روی خوب وزلف برجبین بایدت

☆

حالیا مصلحت وقت دران می بینم که کشم رخت به صحرا و دمی ننشینم

☆

خبر آستان خان زمان سر کجا نهم دولت درین سرای وگشایش درین دراست

☆

عدو شود سبب خیر گر خدا خواهد خمیر مایه دکان شیشه گرسنگ است

☆

دریا نکشی اگر نهنگی نکنی بر کوه نتازی اگر پلنگی نکنی

شعرناصرعلی :

نکوی گر رود زین دہر نیکو تر شود پیدا چو گیرد قطره راهِ عدم گوہر شود پیدا

☆

بگفتی هر چه کردندی مهیا کرایا را که گوید جز نعم الا
گذشتی روز شب در عیش و عشرت الم را دور باشی از مسرت

خواجہ میر درد :

رات مجلس میں تیرے حسن کے شعلہ کی حضور   شمع کے منہ پر جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

بیت افصح المتاخرین مرزا محمد حسن قتیل :

روی زیبای تو چون نور نظر مردم را   هست دردیده و از دیده جدا می گردد

☆

چو خلد برین بزمی آراستند   به رقص آسمانها ز جا خاستند
در عیش جاوید گردید باز   به رامشگری زهره برداشت ساز
چوکل عالمی را ز فیض طرب   فراهم نمی آمد از خنده لب
چنان مجلس آرای از سرگرفت   زمین را انگبین وار زر گرفت
ز یک طرف زرواز یکطرف گهر می ریخت   گهر طبق طبق و زر سپر سپر می ریخت

یکی از مهم ترین نکات این نسخه این است که ذکر شیخ علی حزین در آن آمده است۔ راجه بلوندسنگه از شیخ ارادت صمیمانه می داشت۔ شیخ هم به راجه محبت وشفت رفتار می کرد و برای دوام عمرو دولت راجه دعا می کرد۔ ارادت بلوندسنگه به شیخ آنقدر بود که پسر کوچک خود راجه چیت سنگه را برای تعلیم و تربیت به نزد اومی فرستاد۔ وقتیکه چیت سنگه فرمانروای بنارس شد او شیخ حزین را باحترام استقبال میکرد و در بارهٔ این محبت وشیفتگی وی غلام حسین می نویسد:

"بحکم پدر بیشتر خدمت شیخ محمد علی حزین حاضر شدی و شیخ باهمه
بابائی وفضل و هنر بر سریر کوچکی که می نشست وهیچکس از امراء و وزرا
آرزوی نشستن بران نداشت راجه ممدوح را می نشانید واز دست مبارکش
مروجه می جنبانید و وقت رخصت چیزی ازقسم جواهر خواه اشرفی می داد[۱۶]"

راجه بلوندسنگه شیخ را "بابا" می گفت و زمینی برای روضهٔ فاطمان مختص کرد۔ وقتیکه نواب شجاع الدوله برای تادیب راجه بلوندسنگه بسوی بنارس تاخت در راه به شیخ حزین ملاقاتی نمود وشیخ برای راجه سفارش نمود ومؤلف غلام حسین سفارش شیخ به نواب شجاع الدوله برای راجه بلوندسنگه را این طور مطرح کرده است:-

> ''شیخ محمد علی حزین تخلص اولاد جد و مادری سلاطین صفویہ بارالله برہانم بود بہ جہت رفعت حسب و نسب و انصاف کمالات نواب صفدر جنگ بہادر با او بہ تواضع و فروتنی بر می خورد۔ حتی کہ نواب شجاع الدولہ بہادر برای ملاقاتش رفتند نصیحت مشفقانہ کرد کہ راجہ بلوند سنگھ فرمانبردار آبادان کار زر بر وقت میرساند رعایا و برایا از و راضی، عزم تخریب برای اوچیست۔ معہذا راہ کوہسار دشوار گذار مرور فوج بہ سہولیت ممکن نیست۔ برای اندک کار رنج بسیار کشیدن و بندہ ہای خدا را ہلاک گردانیدن کوہ کندن و کاہ برآوردن است'' ۔[۱۷]

خلاصہ کلام اینکہ این تالیف غلام حسین خان دارای مختصات تاریخی و ادبی است وبدون شک و تردید می توان گفت کہ تاریخ بنارس یکی از نمونہ ہای بہترین نثرقرن ہیجدھم میلادی است کہ نیاز بہ تدوین و انتشاراست۔ بندہ این نسخۂ خطی کتابخانۂ خدا بخش را تدوین کردہ ام و در تلاش نسخۂ بودلین ہستم ۔ از استعانت خدای متعال وقتیکہ نسخۂ بودلین را دریابم، با مقایسہ کردن از نسخۂ خدا بخش انتشار خواہم داد۔

حواشی:-

۱۔ North India Notes Quries volumn 3 p. 157

۲۔ تاریخ بنارس نسخۂ قلمی کتابخانہ خدا بخش پتنا، برگ ۳ الف و ب

۳۔ A Discriptive Catalogue of Manuscript volumn vii , p. 141

۴۔ Catalogue of Persian Manuscript in the Library of India Office

۵۔ North India Notes Quries volumn 3 p. 157

۶۔ تاریخ بنارس نسخۂ قلمی، کتابخانہ خدا بخش، برگ ۴ الف

۷۔ ہمان، برگ ۴ الف

۸۔ ہمان، برگ ۲۱۹ الف

۹۔ ہمان، برگ ۱۵۵ الف

۱۰۔ ہمان، برگ ۶۰ الف

۱۱۔ ہمان، برگ ۶۲ الف

۱۲۔ ہمان، برگ ۸۴ الف

۱۳۔ ہمان

۱۴۔ ہمان، برگ ۱۰۴ ب ۱۰۵ الف

۱۵۔ ہمان، برگ ۸۸ الف و ب

۱۶۔ ہمان، برگ ۱۰۷ ب

۱۷۔ ہمان، برگ ۸۸ الف و ب

مآخذ ومنابع :-

(۱) تاریخ بنارس، جلد اوّل و دوم، سید مظہر حسن، سلیمانی پریس بنارس ۱۹۶۶

(۲) تاریخ آثار بنارس، مولانا عبدالسلام نعمانی، مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس ۱۹۶۳

(۳) Banaras in Transition, Kamla Prasad Mishra, Munshiram Manohar Lal, New Delhi 1975

(۴) North ,December,William Crooke , Poineer Press Allahabad 1893 India Notes Queries,volumn3

(۵) Handlist of Persian manuscripts 1895-1966, G. M. Meredith, London 1968

(۶) Catalogue of Persian Manuscript in the Library of India Office by Hermann, Ethe, Oxford 1903

(۷) A Discriptive Catalogue of Manuscript volumn vi, KBL Patna

☆☆☆

ادارہ

تازہ کتب و رسائل: تعارف

خدا بخش لائبریری میں مشاہیر کے جو خطوط محفوظ ہیں، ان میں قاضی عبدالودود صاحب کے نام خطوط کی ایک بڑی تعداد ہے، اہم ترین مکاتیب میں، قاضی صاحب کے خط بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ ان خطوں میں بڑا حصہ ڈاکٹر محمد حسن کے نام ہے۔

مکاتیب قاضی عبدالودود (۲۰۱۶ء)، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر سرور الہدیٰ کی نگرانی میں ڈاکٹر محضر رضا نے قاضی صاحب کے مکاتیب کو مرتب کر کے دو جلدوں میں پیش کیا ہے، اسے دیکھ کے خیال ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں کو پی ایچ ڈی کے لئے کبھی کبھی ایسے کار آمد موضوعات بھی میسر ہوتے رہیں تو کیا کہنا۔

پہلی جلد میں ۶۴ افراد کے نام خط ہیں، خطوں کی کل تعداد ۴۵۷ ہے، جن میں : آل احمد سرور، احتشام حسین، اسلم فرخی، دوار کا داس شعلہ، رشید حسن خاں، عبدالستار صدیقی، عندلیب شادانی، فخر الدین علی احمد، قرۃ العین حیدر، کالی داس گپتا رضا، کلیم الدین احمد، گوپی چند نارنگ، مالک رام، محفوظ الحسن وغیرہ ہیں۔ اور دوسری جلد میں جو میم سے شروع ہو کر 'ی' پر ختم ہوتی ہے، ۱۸ لوگوں کے نام ۱۱۷ خطوط ہیں، جن میں: مختار الدین احمد آرزو، مسعود حسن رضوی، مسعود حسین خاں، مسلم عظیم آبادی، مشفق خواجہ، مہیش پرشاد، ، نادم بلخی، نثار احمد فاروقی، نظیر صدیقی، نیر مسعود وغیرہ ہیں۔

مرتب ڈاکٹر محضر رضا کا **مقدمہ** مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ تھیسیس ایسی ہی مختصر ہونی چاہیے، جیسا یہ مقدمہ، جسے پی ایچ ڈی نہ سہی ایم فل کا بدل ضرور مان سکتے ہیں۔ جس میں ان خطوط کے ہر پہلو پر روشنی پڑی ہے۔ مرتب نے قاضی صاحب کے مکاتیب کی خصوصیات اور اہم نکات کے ہر پہلو کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ اور اپنی نظر میں ان کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، مگر یہاں بھی مرتب کا پیار ٹپکا پڑتا ہے۔ چالیس بیالیس صفحے پر

پھیلا ہوا ہے یہ مقدمہ۔ جو مقدمہ نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ اہمیت رکھے گا،سرور الہدیٰ جنہوں نے مرتب کو اس کام کے لئے آمادہ کیا۔ اور محضر رضا دونوں قابل مبارکباد ہیں کہ اتنے ضروری کام ایسے سلیقے سے انجام پا گیا۔

''نامعلوم'' کے ذیل میں دوسرے خط کا مکتوب الیہ پتہ چل گیا۔ یہ رولینڈ لارنس کے نام ہے، جو شرت چندر چٹر جی اور اس سے کہیں زیادہ **بمل رائے** کے **فلم دیوداس** کے مداح رہے ہیں ۔ ان سے ذکر ہوا تھا کہ شرت چندر پر جو مضمون ہے وہ کہیں پٹنہ کے قاضی صاحب کا تو نہیں ہے۔لیکن پھر پتہ چل گیا کہ بنگلہ زبان کے ادیب ہیں، اور بنگلہ یا انگریزی میں لکھتے ہیں اور کلکتہ میں قیام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ہمنامی کے سبب غلط فہمی رہی، جو اس خط سے دور ہوجاتی ہے۔ لارنس صاحب ریاضی کے استاد رہے مگر ادب سے بہت شغف رہا، شاعر بھی ہیں، عابد سہیل مرحوم کے رسالہ **کتاب** میں اور دہلی کے مشہور رسالہ **شاہراہ** میں ۱۹۶۰ کی دہائی میں کافی چھپتے رہتے تھے، ان کے ایک مجموعۂ کلام کا نام'' گاہے گاہے'' ہے۔

ادھر ادھر کی باتیں تو ہوئیں، مگر ضروری باتیں تو شمیم حنفی کی زبان سے سنیے جو مجھ سے زیادہ ضروری ہیں، اس لئے ضروری ہیں کہ اس عبارت میں محضر رضا کی ترتیب کی قدر و قیمت کا مناسب تعین کیا گیا ہے۔کوئی اچھا کام ہو تو داد دینے میں کنجوسی سے دل پر زنگ لگتا جاتا ہے، ایسے ہی جیسے کوئی دوسرے درجہ کا کام ہو تو اس کی کمیوں کی طرف اشارہ نہ کرنا ادبی جرم بھی ہے، اخلاقی بھی۔تو دل پر زنگ کیوں لگنے دیجئے شمیم حنفی کو سنیے اور دل سے سنیے:

''اس کتاب کی دنیا اور اس دنیا کے مرکز میں موجود شخصیت، قاضی صاحب کی عام اور معروف شخصیت سے بہت مختلف دکھائی دیتی ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب اردو کے سب سے بڑے محقق تھے۔ انھوں نے علمی اور ادبی تحقیق کی جو روایت قائم کی اس کی روشنی میں وہ بہت خشک، غیر دلچسپ اور بے مروت قسم کے انسان نظر آتے ہیں۔علمی تحقیق کے عمل میں وہ ذرا سی رو رعایت کے بھی قائل نہیں تھے، اور بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ علمی تحریروں میں وہ کسی طرح کی عبارت آرائی، مبالغے اور مروت کے عادی نہیں تھے، اور یہ تاثر بہت عام ہے کہ ان کے قلم سے کبھی کوئی دلچسپ جملہ سرزد نہیں ہوا۔ حوالوں کی کثرت اور اپنی مرکز جوئی کے باعث کہیں کہیں تو

ان کی ادبی تحقیق پر کسی سائنسی اور تکنیکی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن ہزار صفحوں سے زیادہ کی یہ کتاب قاضی صاحب کی ایک انتہائی نرم، شفقت آمیز اور انسانی عناصر سے مالا مال تصویر مرتب کرتی ہے۔ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی ہمہ جہت، نرم، بامروت اور انسانی تعلقات کا پاس رکھنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ تقریبا ساٹھ دوستوں، ادیبوں، طالب علموں اور شناساؤں کو لکھے جانے والے ان خطوط میں قاضی صاحب کا اسلوب بہت پرکشش، بے ریا اور رنگارنگ ہے۔ کہیں بھی وہ اپنی دیانت داری اور معروضیت پر حرف نہیں آنے دیتے، لیکن ان کی دوست نوازی، شفقت اور دلداری میں بھی کہیں کمی نظر نہیں آتی۔

''یہ ایک غیر معمولی دستاویز ہے اور اس کی تاریخی حیثیت اور اہمیت ہمیشہ قائم رہے گی۔ محضر رضا صاحب نے جس توجہ، انہماک اور سلیقے کے ساتھ یہ صبر آزما کام انجام دیا ہے اس کی قدر کی جانی چاہیے۔ اردو معاشرے، بالخصوص تعلیمی اداروں میں ایسے افراد بہت کم نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی علمی روایت، تاریخ اور ثقافت کی چھان بین اور مطالعے میں محضر رضا صاحب کی جیسی دیدہ ریزی اور شغف کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے اس کتاب کا مقدمہ بھی بڑی محنت سے لکھا ہے۔ قاضی صاحب کے خطوط پر نظر اس طرح ڈالی ہے کہ تمام محاسن پڑھنے والوں پر روشن ہوجائیں۔ مجھے یقین ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی قدر ہوگی''۔ (شمیم حنفی)۔

یہ کتاب ادب دوستوں کے لئے تازہ تحائف میں سب سے بڑا تحفہ ہے۔

☆☆☆

Khuda Bakhsh Library

Journal

No. 179-182 January – December 2015

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Reg. No. 33424/77
Issue : 179-182
Quarterly Journal

Subscription
Individuals ₹ 400/-
Institutions ₹ 500/-
Foreign Individuals 30$
Foreign Institutions 60$

Editor
Dr. Shayesta Bedar
Director

ख़ुदा बख़्श लाइब्रेरी जरनल

अंक 179–182 जनवरी–दिसम्बर 2015

Opinions expressed by contributors are not necessarily those of the editor.

Printed by Md. Jawaid Ashraf at Pakiza Offset, Shahganj, Patna & published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna-800 004.

CONTENTS
Journal No. 179-182

English/Hindi Section

▪ Princess Zebunnisa : Facts & Fiction	*by* Prof. Syed Hasan Askari (Late)	1
▪ History and Politics	*by* Dr. Om Prakash Prasad	19

Urdu Section

▪ Editorial	-	v
▪ Afzalul Fawaid : *Malfoozat* of Nizamuddin Aulia	*by* Dr. Rizwanullah Arvi	1
▪ Letters of Qazi Abdul Wadood *to* Dr. Mohd. Hasan	*Comp. by* Dr. Fardul Hasan	20
▪ Ghalib's Modernism and British Imperialism	*by* Dr. Nasir Abbas Nayyer	54
▪ Oldest writings on Iqbal : Authored by Khalil Ahmad of Montgomery	*by* Dr. Asad Faiz	72
▪ Memorabilia Concerning Raja Mahendr Pertab	*by* Dr. Abdul Khaliq Rasheed *Tr. by* Dr. Hayatuddin	77
▪ Maulana Syed Abdul Ghani Asthanvi	*by* Dr. Talha Nemat Nadvi	87
▪ Syed Hamid's Autobiography	*Interviews by* Dr. Najma Mahmood	95
▪ Prof. Ahmad Shah Bukhari **Petras**	*by* Dr. Ghulam Shabbir Rana	133
▪ Al-Beruni and his Observations regarding India	*by* Dr. M. Anwarul Haq Tabassum,	150
▪ An Index of Great Reviewers of 21st Century, "Urdu Adab" **Anjuman**, 2001-14	*by* S.K.	175
▪ Introduction to "History of Benaras" of Ghulam Husain Khan.	*by* Dr. M. Sadiq Husain	187
▪ New Arrivals: Books/Periodicals	*by* Ed.	202

Our Contributors

- *Dr. Asad Faiz, Associate Professor, Islamabad Model College for Boys, F-10/3, Islamabad.*
- *Dr. Fardul Hasan, Iram Publishing House, Daryapur, Sabzi Bagh, Patna*
- *Dr. Ghulam Shabbir Rana,Mustafabad, Jhang City, Pakistan*
- *Dr. Md. Anwarul Haq Tabassum, Formerly Associate Prof. Oriental College, Patna City*
- *Dr. Md. Hayatuddin, 232 E, Brahmaputra Hostel, JNU, New Delhi*
- *Dr. Md. Sadiq Hussain, Professor of Persian, Patna University, Patna*
- *Dr. Najma Mahmood, Formerly Professor of Education, AMU, Aligarh*
- *Dr. Nasir Abbas Nayyar, Director General, Urdu Science Board, 299 Upper Mall, Lahore*
- *Dr. Om Prakash Prasad, Formerly Associate Professor, Deptt. Of History, Patna University, Patna.*
- *Dr. Rizwanullah Arvi, Professor, Deptt. Of Persian & Urdu, H. D. Jain College, Ara*
- *Dr. Syed Hasan Askari, Ex-Professor of History, Patna University, Patna*
- *Dr. Talha Nemat Nadvi, Asthawan, Bihar Sharif*

Princess Zebun-Nisa Facts and Fiction

***by :* Prof. S.H. Askari.**

Ex- Professor of History, Patna University, Patna

Dilras Bano, the first and favourite wife of Prince Mohyuddin Aurangzeb and the daughter of the Iranian noble, Badi-uzzman entitled as Shah Nawaz Khan Safavi was mother of five children of whom three were daughters and two were sons. Of these the eldest was the highly talented princess Zebunnisa born in 1638 A.D. Fifteen years after, in 1653 she was followed by Prince Azam Alijah an equally accomplished and a capable person in arts and literature besides politics. Writing that she had been brought out of jail to offer condolence to Ruhullah Khan an Iranian noble, Maulana[1] Shibli was off the mark and quite wrong in confusing her name with that of the other sister. The fact is that he confused the name of Zinatunnisa with her eldest sister Zebunnisa. In giving birth to the fifth and the last child who was given the name of the greatest of the imperial Mughals, sovereign Akbar, Dilras Bano died due to the pangs of delivery. The self imposed duty of acting as the God-Mother of the newly born boy Man-jaya (Uterine brother) devolved upon the 19 years old Zebunnisa and her love and affection for him remained to the last of her days.

The evidence available to us leads us to think that Aurangzeb had a very warm heart and had a tender feeling for her

---

[1] Maqalat-i-Shibli.

eldest daughter Zebunnisa who was a highly talented poetess and a stylish writer in prose and poetry with fine hands. We have got a letter of the imperial father which begins with the very affectionate address "Baba-i man, Jaan-I Man, Janan Man (My darling, My soul, My life)" [2]. He eulogized in appreciative terms her diction in writing a brochure on Ashura (10th Muharram). But not long after this she fell from grace and was never pardoned till her death in 1701-2 A.D. There can be no doubt about the close connection of her fall from grace and the affair of her beloved but wayward or self-willed brother Akbar with whom she appears to have kept up the practice of writing clandestine letters which may had been intercepted. One can presume that the contents of such letters comprised advice and warnings, so as to keep him off from taking some wrong steps and displaying any evil designs against her imperial father, rather than afford any encouragement for wrong steps. Akbar originally called Farzand-i Arjumand, and 'Baland Akhtar' and later on dubbed as 'bad Akhtar' and 'Akbar as Abtar'. Akbar was only 16 or 17 years of age in 1682 when he was deputed to lead an army for a war against the Rathors of Jodhpur, over the posthumous sons of the great Rathore Raja Jaswant Singh of Marwar.

Both Zebunnisa and Akbar had been great favourites of their imperial father. Bernier the shrewd French traveller and intellectual, who had close and long connection with and knowledge of royal family shrewdly observed that the emperor had taken great care in giving good education to both, and there was a time when he dangled or held out temptations of Akbar succeeding to the throne after him. Zebunnisa was held in high esteem because of her good education and scholarship. As a result of the care and attention bestowed upon her, he had taken care to give her best education of the time. He had called Hafiza

---

[2] Maadanul Inshe by Chiranjeev Das.

Maryam the sister of his secretary Inayatullah Kashmiri and appointed her as the first tutor of the Princess. The first thing she was called upon to do was to memorize the Holy Book of Islam, the whole of the Quran. When she was examined and her recitals (Qira'at) from the different places in the Holy Book was found to be quite correct, she was given 30,000 gold Mohars and a small *jagir* in Kashmir, where she built a small house meant for the tourists and way farers; Aurangzeb the great emperor himself had an occasion to stay in this house when he went to Kashmir to recuperate his health after his continued illness in 1664. Hafiza Maryam was also richly rewarded. A much worthy and accomplished tutor and guide, who came from Iran in early years of the regime was Akhund Saeed Ashraf Mazandrani, a direct descendant on the mother side of the renowned Shia Mujtahid Mullah Taqi Majlisi. Mullah Saeed Ashraf remained in India for more than a decade after which he got home-sick, and sought permission to return to Iran. He, in the petition for the permission, wrote the following lines "Yakbar az watan natawan be giraft dil" (I could not withraw even for once my heart from my homeland). "Dar ghurbatam agar che fuzun ast aitibar" (althought in my self-exile, I have had increasing honour and trust). "Nisbat cho batinist che Dehli che Isfahan" (I shall remain spiritually linked with you whether I am in Delhi or in Isfahan). "Dil pesh-i tust man che ba Kabul che Qandhar" (My heart will remain with you whether I am in Kabul or in Qandhar).

Ahmad Ali Sandelvi has given a fairly long account of the fall of a notebook from the hands of a maid servant into water. But others had mentioned only one line, "As Qaza Aaina-i-Chini Shikast" (accidently the Chinese mirror fell and broke into pieces). Akhund Saeed Ashraf immediately added, "Khoob Shud Asbab Khud-Bini Shikast" (It was quite good that the cause of becoming self-conceited is gone).

Akhund Saeed Ashraf came to India again for the second time and became very much attached to Zebunnisa as her tutor and guide. A small booklet named Mufidul Insha which I had it purchased for the K.B.O.P.L. Patna compiled by Champat Rai has furnished very valuable material regarding the Princess and the Iranian scholar Akhund Saeed Ashraf Mazindran. The latter composed a chronogram giving the year of the death of his Princely pupil which happened two years before his own death in 1704 A.D. He lies buried in Monghyr.

In studying the career and the literary contributions and achievements of Princess Zebunnisa and her relations with Saeed Ashraf we have to consult the following sources and detailed accounts : *Alamgirnama* by Muhammad Kazim[3]. He was the first and the single official historiographer of the great emperor (dealing with the first ten years of reign), *Maa'sir-i-Alamgiri* by Musta'id[4] Khan Saqi, translated into English by Sir Jadunath Sarkar, Maa'sirul Umarah[5]. Tazkira-e Sarkhush, Khazan-e Amira, Serv-e Azad and Yad-e-Baiza by Ghulam Ali Azad Bilgrami in three volumes and also translated in English. Incidental notices are also found in Makhzan-ul-gharaib by Ahmad Ali Sandelvi[4], the book of Maulana Mohammad Hussain Azad. On Zebunnsia, also an article by Sir Jadunath Sarkar in 'Studies in Mughal India and Ancestors of Aurangzeb'[6].

Zebunnisa like many princesses of the family of the imperial Mughals remained unmarried like Jahan Ara Begum and Roshan Ara Begum, the sisters of Aurangzeb. Jahan Ara called Begum Sahiba had been scandalized by the gossipy Venetian

---

[3] He was the first and the single official historiographer of the great emperor.

[4] Translated into English by Sir Jadhunath Sarkar.

[5] In three volumes and also translated into English.

[6] Makhzan-ul-ghraib

Manucci. She had been the favourite daughter of Shah Jahan and like Dara Shikoh was a pious authoress of a biographical book on the Chishti Qadri Sufi Saint named Mulla Shah. She did not marry of her own accord because she was much more immersed in learning and had built up a magnificent library in the imperial metropolis full of books written by scholars coming from far and near. Many of the works were written by others in her name such as Zebut-tafasir, a Persian rendering of the well known Arabic Commentary of Fakhruddin Razi rendered into Persian at her biddings by the Persian Savant Safiuddin Ardbeli, who named it after her. She was herself the compiler of her letters called Zebul Munsha'at, which has become extinct. Her poetical effusions in Persian with her nom-de-plume 'Makhfi' have been confused with those in the Diwan of Rashti Irani whose pen name was also 'Makhfi'. The Diwan of Rashti has been published in many places notably by Nawal Kishor Press of Lucknow and Saeedi Press of Lahore.

The gossipy European travellers say that the Mughal kings allowed their daughters to remain unmarried. This is not true. Jahangir called Salim was the son of a Hindu mother but his eldest son and heir apparent Pervez who was appointed Governor of Bihar, whose name appears not only in the Sangin Masjid of Patna but also in a Mausoleum in Sultanpur, a suburb of Bhagalpur and who gave the name of Pervazabad to what is known as Pahlazaghat, was married with an Iranian Lady whose daughter became the wife of Dara Shikoh. Aurangzeb himself was responsible for marriages of Izad Bakhsh and the son of his brother Sipah Shikoh, the son of Dara. The fact generally ignored is the importance attached to 'Kufv' which means of the same rank, standing and qualities to which great importance was generally given.

Zebunnisa's picture has been painted in very dark colours not only by some European scholars who were ignorant of the reality of the situation and wrote out gossipy accounts which they heard from the rabble in the street. The scandalous picture painted by the Europeans of the female members of the imperial Mughal falls into less significance as compared with what we find from the pen of the story tellers in Persian language of places like Lahore and Kashmir. Perhaps there is streak of sectarian prejudices which impelled these people to write all sorts of false stories. One wrote that Princess Zebbunnisa, standing on the balcony said to Aqil Khan Razi who was passing on the road side: "Shunidam Tark-i Khidmat Kard Aqil Khan ba Nadani" (I have heard that Aqil Khan had given up his job due to his foolishness). The reply came, "Chera Karey Kunad Aqil Ke Baz Aayed Pashemani" (Why should Aqil do a thing for which he had to regret afterwards).

There is an another story. Aqil Khan going on the road side, saw the Princess Zebunnisa on the balcony garbed in a red dress and said, "Surkh Poshey ba Lab-e Bam Nazar mi Aayed (One garbed in red clothes comes into view on the balcony). Immediately came the reply, "Na ba zari, na ba zorey, na ba zar mi aayed" (She cannot come either through weeping or lamentation or any kind of strength and not even because of gold and silver).

The climax was reached by malicious people in maligning the Princess for immorality and impurity of character when they connected the story that once Zebunnisa and Aqil Khan were talking together in the palace where there was a large cauldron for hot water. Aurangzeb entered and made a show that he had not seen the affair. Then Mirza Aqil was concealed under the cauldron and on the Emperor's order fire was set to the water in the cauldron for the bath of the Princess and the infatuated

lover was roasted alive. The last words dinned into the heart of the lover by the Princess were these.

بعد مردن زجفاے تو اگر یاد کنم

از کفن دست بروں آرم و فریاد کنم

"Bad murdan ze jafaye tu agar yad kunam

Az kafan dast barun aaram-o- faryad kunam"

(After my death when I remember my oppression practiced by you, I shall bring my hands out of the shroud and would pour out my lamentations).

Before we proceed it is worth while to give the correct and historical version about the life and career of Aqil Khan. The real name of the so-called lover of Zebunissa was Mir Askari an Iranian, and his nom-de-plume[7] was Razi. He was a devotee of a saintly personage Shah Burhanuddin after whom Burhanpur city was named. He was a favourite official of the Emperor Aurangzeb who conferred upon him the title of Aga Khan. He was made Post Master General but resigned in 1669 and does not find any mention till 1676. In 1676 he was appointed to be superintendent of the bathroom and was given a Mansab of two thousand. In 1680 he retired from Public Service with annual pension of considerable amount. Again in 1690 he was made Bakhshi, two years later he was elevated to the office of the Governor of Delhi. He was at the same place with Zebunissa at Daulatabad in 1658, then at Lahore in 1665 for a week only, then forthwith the imperial court at Delhi and Agra till his resignation in April 1669. Again was with the court during the Rajput Wars of 1679 and 1680 and finally at Delhi from January 1681 to 1696. According to Alamgirnama and Ma'asirul Umara he died in 1699 A. D.

There is another story which appears to have had some basis. A poor impertinent poet of Sirhind named Nasir Ali composed a line:

---

[7] See Ma'asirul Umara for Aqil Khan. See also the royal letters in the supplement of Kalemate-Taiyebaat and also Sarkar's Study in Mughal India, 14

از ہم جدا نہ شد زحلاوت جدا لبم

شاید رسید بر لب زیب النسا لبم

"Az ham juda na shud ze Halawat juda labam
shayed Raseed bar labe Zaibunnisa labam"

(Owing to sweet deliciousness my lips did not part one from the another; perhaps my lips have had access to the lips of ornament of women).

When the Princess heard of this affront from an ordinary poet of Sirhind, she became furious and burst out:

ناصر علی بنام علی بردۂ پناہ

ورنہ بہ ذو الفقار علی سر بریدنی

"Nasir Ali Banam-1-Ali Burdai Panah
Warna ba *zulfiqar-i* Ali Sar Buridarni"

(Nasir Ali has taken refuge under the name of Ali, otherwise I would have got his head severed from the body by the sword of Ali).

The Mughal ladies specially the Princesses were inaccessible to all and there was no prying into the secrets of the *Harem* or Seraglio. But we have to explain a few facts about the great Princess: (1) why is it that Zinatunnisa her younger sister finds much more and frequent mentions from the Emperor in the letters of the *Akham* while references to the most favorite and the highly talented Princess Zebunissa are few and far between in the imperial letters; (2) what really led to the sudden change in the attitude of the Emperor towards his erstwhile most favourite daughter. The Emperor stopped her annual pension of four lakhs and confiscated all her properties and goods and ordered her to be kept confined in the Fort of Salimgarh. As already indicated, Maulana Shibli was quite wrong in taking Zinatunnisa as Zebunnisa. It was not a fact that her innocence was established and she was brought out from her prison house to offer condolence on the death of Hamida Bano Begum, the mother of Ruhullah Khan. She remained in Delhi and did not accompany the Emperor to the Deccan because she was immersed in her own studies and in the library which she had built up at Delhi. As regards the reason for her sudden fall, we had already referred to the clandestine correspondence with her willful brother Akbar. The go-between the brother and the sister was Mulla Aqil

not Aqil Khan Razi. It was not the question of Aqil Khan which had wrongly been taken as the main cause of her fall by the Muslim story writers. It was not Mirza Askari entitled Aqil Khan Razi but Mulla Aqil who acted as the emissary of correspondence[8] between the brother and the sister and who probably egged in the Prince to display his proverbial Mughal Spirit. Before we proceed to deal with overt and covert matters considered as the dereliction of the duty on the part of the Princess leading to her fall and the time of her imprisonment. It would be better if we take up the pieces definitely of the Princess occurring in the printed Diwans of Rashti Irani who called himself 'Makhfi'. They have been quoted in Yad-e Baiza and also Serv-e Azad of Ghulam Ali Azad Bilgrami. But they all are devoid of her pen name 'Makhfi', which fortunately has been mentioned by Champat Rai in `Mufidul Insha'. Of these, three quoted in 'Yad-e Baiza' are the following:—

(1) "Bulbul az gul bugzrad gar dar chaman binad mara; but prasti kai kunad gar barhaman (Brahman) binad mara."

(While the nightingale passing through the rose garden fleetingly looks at me. How can a Brahrnin worship an idol if he looks at me).

(2) "Dar sukhan pinhan shawam manind-e bu dar barg-e gul ;
har ke didan mayl darad dar sukhan binad mara."

(I become concealed like the sweet smell in the leaves of a rose flower. Whoever has any desire to see me, may find me out in my poetical effusions).

(3) "Gar che man laila asaasam, dil chun majnun dar hawaast;

sar ba sahra mi zanam lekin haya zanjir-i-paast"

(Although I am basically garbed in the attire of Laila, but my heart is like that of Majnun in mood of flattering blandishment. I dash my head against the barren deserts but the sense of modesty fettered my feat.

[8] See Sarkar's Study in Mughal India, on Zebunnissa.

(1) "Dukhtar-e shaham wa lekin ru ba faqr awurda-am;

zeb –o- Zinat az haminast, nam-e man Zebun nisaast".

(I am the daughter of a king but 1 have taken to the ways of poverty like *derweshes.* My beauty and decoration lies only in my name which is the ornament of the women).

(2) "Kaar-e mashuqan namak bar Zakhm pinhan raikhtan;

Kare Aashiq khun-e khud bar pay-e jaanaan rekhtan.

(The business of the beloved ones is to sprinkle salt on the wounds; but the way of the lover is to shed his blood at the feet of his beloved).

(3) Bish kanad Pushtey-i-ke kham dar garden-i-yare na shud; Kor beh chashmey ke lazzatgir-i didarey na shud."

(Let the arm break which does not go round the neck of the beloved; Let the eyes become blind which does not have a taste of the sight of **the** beloved).

(4) "Sad Bahar Akhir shud-o- har gul ba farqey ja giraft;
ghuncha-i Baghe dil-e ma zeb-i dastarey na shud."

(Hundreds of springs have come to an end and every flower has become a decoration on the head. But the rose-bud of my heart has failed to become an ornament of the head-dress).

(5) "Parwana nistam ke ba yak dam adam shawam;
Sham'am ke bargudazam-o-dam bar niawuram".

(I am not a moth which with one stroke becomes non-existent, I am the lamp light which dissolves and loses its light but does not complain).

(6) "Kushad-e ghuncha agar az nasim-i gulzar ast, Kaleed qufl-e dil-e ma tabassum-e yar ast."[9]

[9] Obviously these 6 verses imanated from the pen of the great poetess, Zebunissa and not from Rishti Irani.

(The rose-bud shoots out into a flower when the breeze of the spring flows over it. The key to the lock of my heart is the smile of my infatuated lover).

The career and character of Princess Zebunissa and of her life and conditions necessitates a thorough study so as to realise the starting reality of the situation and remove the cobwebs of fanciful, false, fictional and malicious stories invented by unsympathetic Muslim story tellers so as to malign her character. Be it be said to the credit of the renowned historian of Aurangzeb, Sir Jadunath Sarkar that he has brushed aside all such stories as which bring the Princess and Aqil Khan Razi together and end in the latter being roasted alive under a huge cauldron of hot water; and it is he who distinguishes Aqil Khan from Mullah Aqil, the latter being an emissary of secret correspondence between the Princess and her uterine brother Akbar. But the great historian was also off the track when he suggested that 1663 was the date of her fall from grace and imprisonment two years after the dispatch of Akbar to Malwa and his seduction by Durgadas Rathor. Sarkar was not aware of the long and pathetic letter[10] to her father when she was 40 years of age perhaps sometime even earlier than 1678 when she might have been put into prison from which she was never allowed to come out till 1702 when she died at the age of 64 years.

When Aurangzeb heard of the death of Princess Zebunissa in the jail (Salimgarh fort) he said to have shed tears and issued directions for her burial in a Mausoleum within a very large garden. As regards the actual place of her burial there is a difference of opinion among the authorities. Some say that she was buried at Nawan Kot near Lahore, but obviously it was incorrect. Beale, in his biographical dictionary which is known as *Miftah'* (Persian version) writes that her grave was close to Subzimandi outside the Kabuli Gate in Delhi. This is supported by Maulana Muhammad Hussain Azad the author of *Sukhandan-i-Fars* and *Aabe-Hayaat*. He goes so far as to write that he saw with

---

[10] This unique and rare letter occurs among other collections of royal letters in the supplement of lintat-e-Tayibaat.

his .own eyes the inscription on her tomb which was a Quranic verse 'Fadkhuli Jannati'.

The writer Princess Zebunissa begins her letter to her father the Emperor Alamgir by offering endless thanks for his having been responsible for bringing her out from non-existence into existence assuming form of human being. Then she makes a very important statement saying that under the fostering care and favours of the Emperor she had grown up from a child to a forty years old lady. How could she be able to offer her sense of frustration to His Majesty for his reprimands, rebukes and reproofs which very often conduced to the clearness and purity of the .carnal and spiritual maladies. The writer felt very much indebted to imperial father for the miraculous treatment and curative prescription which had been very effective in removing the ills in her. It was impossible to offer her sincere and adequate thanks-giving for the favours and blessings which were conferred upon her and were boundless in extent and innumerable in measure. Declaring his Majesty as her spiritual guide, she ventured to put a question as to what was the cause of the wrath and the reproof meted out to her. How could she be completely free from the worldly dust and rubbish in her body and soul. She did not care if she were to be kept without food for hours or days together. She felt satiated even when her stomach was devoid of food or nourishment. She also did not mind if she had to face defeat in the world. There was an occasion when being struck by torment, physical and mental, she cried out alas; and shed tears, in profusion evincing the feelings of an immature person. The aspirations of a worldly person may have once cropped up and bad blood might have begun to flow in her veins. But it was a passing phase and a transitory affair. How happy were the eyes of those which shed tears for her. How august and sacred were the hearts which burnt for her. Every moment of weeping and lamentations is followed by cheers and smile. Blessed is the person who keeps her eyes on the final issue (Dar pas-e har girya Akhir khandah Aist, Mard-i-Akhir-been Mubarak Bandah Aist). Ultimately all pains and tribulations converged on a final point, and the things which were sour and bitter became sweet and pleasant.

At the end of the letter she wrote that she was desirous of being favoured with two things: one was the permission to approaeh his Majesty and kiss the dust at his feet. The second thing was the opportunity offerred to her to go on a pilgrimage to Mecca and other sacred places in Arabia. By virtue of her prayers and devotions she hoped that his Majesty might have some considerations for her affections whatever faults and shortcomings she might have been taken to have committed sinful or sinless, in straight forward or crooked way. Never was any manual of ethical or moral instructions issued for the writer, who remained always engaged in counting the beads and offering her obligatory prayers. She repeated her request to his Majesty to permit her to kiss the dust at his feet, so that she might have something in store for her on the judgement day.

As we know the Emperor was relentless even after the receipt of this beseeching and pathetically-worded letter. It failed to excite any feeling of compassion or forgiveness in the heart of his Majesty. We don't know how, in what way and through whom the letter was dispatched. She was left to rot and mourn her lot from 1671 to 1701 or 1702. But as already indicated when the news of her death came, the Emperor could not help shedding tears and ordered a Mausoleum to be erected in a magnificent garden called 'Tis Hazari'. Let us see what a modern poet 'Barq Dehlavi' in a book named 'Irshad-us-Salihin available in Khuda Bakhsh Library, wrote in Urdu verses, a sort of Mournful elegy. It is being reprinted here as appendix to this article.

***

Appendix

(Elegy *by* Barq Dehlavi)

(1)

زیب النسا کی قبر جو تھی خاک میں نہاں

صدیوں کے بعد اس کا ملا گم شدہ نشاں

Zeb-un-Nisa Ki Kabr Jo thi Khak men Nihan

Sadyon Ke Bad Uska Mila Gumshudah Nishan

(The tomb of Zebunnisa which was hidden under the debris of sands; Its trace was at last found out after many centuries).

(2)

مشہور ہے جو تیس ہزاری کے نام سے

تھا گنج بے بہا اسی میداں میں نہاں

Mashhur Hai Jo Tees Hazari Ke Nam Se

Tha Ganj-i-Be Baha Usi Maidan men Nihan

(What is well known as Tees Hazari. The priceless precious jewel lay hidden herein).

(3)

مٹی میں مل رہا تھا درِ شاہوار حیف

اوجھل نظر سے خاک کے تودوں کے درمیان

Mitti men Mil Raha the Dur-i-Shahwar Haif

Ojhal Nazar se Khak ke Todon ke Dermiyan

(The precious pearl was hidden under the heap of earth. It was hidden to the eyes and was buried under the earth).

(4)

شاہد پس فنا یہ تخلص کا تھا اثر

مخفی کی قبر بھی جو رہی خاک میں نہاں

Sahid Pas-i-Fana yeh Takhallus ka tha Asar

Makhfi ki Kabre bhi jo rahi Khak men Nihan

(Perhaps it was due to the allusion indicated by and involved in her pen name, that the tomb of Makhfi (concealed one) remained hidden under the heap of the sand for a long time).

(5)

اگلا ہے خود بخود یہ دفینہ زمین نے

ممنون جستجو نہیں روداد بیکساں

Ugla Hai Khud Ba Khud ye Dafina Zamin Ne

Mamnoon-i-Justuju Nahin Rudad-i Be-Kasan

(This hidden treasure has risen up out of its own accord. The narrative devoid of any mark or sign was not indebted to any deliberated search).

(6)

تصویر دستبرد حوادث ہے سر بسر

ابھرا ہے فرش خاک پہ جو نقش رائیگاں

Taswir Dast burd Hawadis Hai Sar Ba Sar

Ubhra hai Farsh-i-Khak pe jo Naqsh-i-Raigan

(It is an image struck down by the hands of calamities; The faint mark which has shot out from beneath the earth).

(7)

گنبد ہے مقبرہ ہے نہ لوح مزار ہے

تعویذ قبر کا بھی ہے مٹتا ہوا نشاں

Gumbad Hai Maqbara Hai Na Lauh-i-Mazar Hai

Tawiz-i-Kabr Ka Bhi Hai Mit'ta Hua Nishan

(There is neither a dome nor a mausoleum nor any thing like stone tablet; Every thing about the structure of stone of brick (tawiz) is becoming increasingly traceless).

(8)

نے شمع ہے، نہ چادر گل ہے نہ قبر پوش

مٹی کا ایک ڈھیر ہے عبرت کی داستاں

Nai Shama Hai Na Chaadar-i-Gul Hai na Kabr-posh

Mitti Ka Ek Dher Hai Ibrat Ki Dastan

(There is nothing like lamp post or carpet of flowers nor any covering over the burial place. There is only a heap of dust, what has become only a legendary story of warning of example).

(9)

ویرانی لحد ہے مجاور سر مزار

زائر ہجوم یاس تباہی ہے پاسباں

Wiraniy-i-Lahad Hai Mujawir Sar-i-Mazar

Za'ir Hujum-i-Yas Tabahi Hai Pasban

(The desolation of the inner portion of the tomb serves as its custodian. The devastation of the inside portion of the tomb (lahad) serves its Pilgrim and as its Watchman).

(10)

ہے گرد سے اٹا ہوا انبار خاک کا

سبزہ تو کیا کہ شکل نمو بھی نہیں عیاں

Hai Gard Se Ata Hua Ambaar Khak Ka

Sabzah to Kya Ke Shakl-i-Numu Bhi Nahin Ayan

(Which over-hidden by heap of dust, what to speak of vegetation, there is no sign or trace of an iota of grass shooting out of it).

(11)

اڑتی ہے خاک اور برستی ہے تیرگی

چھایا ہوا ہے حسرت و اندوہ کا سماں

Udti Hai Khak Aur Barasti Hai Tirgi

Chahya Hua Hai Hasrat-o-Andoh Ka Saman

(There is at times rise of dust and it is followed by the down-pour of darkness. The atmosphere presents a scene of grief and affliction).

The reference to the garden of Tees Hazari and mention of 'Makhfi' as the nom-de-plume of the princess Zebunnisa in the above Urdu verses are worthy of our special attention.

A Ghazal by Zebunnisa

با گلشن غم ساز کہ باغے بہ از ایں نیست
خون خود عوض مئے کہ ایاغ بہ از ایں نیست
Ba Gulshan-e-Gam Saz Ke Baghey beh azin Neest
Khoon-e-Khud iwaz-e-maye Ke ayaghey beh azin Neest
پروانہ تحمل کن و مہتاب نشیں باش
در خانہ مفلس کہ چراغے بہ از ایں نیست
Parwana Tahammul Kun-wa-Mahtab Nasheen bash
Dar Khana-e-muflis Ke Chiraghey beh azin Neest
ہنگامہ کنم گرم من از نشہ صحبت
در مذہب احباب دماغے بہ از ایں نیست
Hangama Kunam garm man az nasha-e-sohbat
Dar Mazhab-e-ahbab dimaghey beh azin Neest
معشوق و مئے و گلشن وجمعیت خاطر
خوش باش کہ اسباب فراغے بہ از ایں نیست
Mashooq-o Maye-o Gulshan-o Jamiyat Khatir
Khush Bash Ke asbab faraghey beh azin Neest
سوز جگر و شعلہ بفانوس بدن زد
بر سینہ عاشق گل داغے بہ از ایں نیست
Soz-e-Jiger wa Shola bafanoos badan zad
Bar seena-e-ashiqn Gul-e-daghey beh azib Neest
مخفی نہ نہد گام برائے کہ بود کام
در راہ طلب ہیچ سراغ بہ از ایں نیست
Makhfi na nihad gaam bara'eke buwad kam
Dar Rah-e-Talab Hech Suraghey beh azin Neest

***

इतिहास और राजनीति

– डॉ.ओम प्रकाश प्रसाद

इतिहास के आइने में अपना चेहरा काफी लोग देखना पसन्द नहीं करते। इतिहास के चेहरे को राजनीति के रंग से पोतकर वास्तविकता छिपाने का प्रचलन लोकप्रिय होता जा रहा है। सैकड़ों वर्षों से राजनीति के चाबुक से इतिहास पर चोट करते रहने की निरन्तरता बनी हुई है। कई प्रकार के वैज्ञानिक आविष्कार करने वाले गरीब, अनपढ़ और निम्न वर्गों को सुविधा–भोगियों ने इतिहास के मंच पर उचित स्थान कभी नहीं दिया। आज भी राजा–रानी ही इतिहास हैं। प्रारम्भ से ही सुविधाभोगियों का पूर्ण नियंत्रण राजनीति पर रहा। फलस्वरूप इतिहास के पन्ने–पन्ने पर विरोधाभास और निष्पक्ष तथ्यों को नज़रन्दाज करने की स्पष्ट झलक दिखाई देती है। चमार ने जूता का आविष्कार किया। लोहार ने ही विश्व को लोहा से परिचित कराया। बढ़ई ने उन लकड़ियों की मजबूती और लम्बी जिन्दगी से परिचित कराया जिनसे तरह–तरह के सामान आज भी बनाए जाते हैं। बुनकर नहीं होते तो वस्त्र का आविष्कार कैसे होता? मजदूरों, कारीगरों, संगतरासों और शिल्पकारों के अमूल्य दिमाग, योजना और कारीगरी के अभाव में इमारतें, मंदिरें और राजमहलों तथा देवी–देवताओं का निर्माण सम्भव था? कृषि का आविष्कार स्त्रियों ने किया। ऐसे सभी वर्गों को शूद्र और निर्धन मानकर आज़ाद भारत में आरक्षण की श्रेणी में रख दिया गया; जबकि ये सभी वैज्ञानिक थे और विज्ञान के दायरे में इन्हें राष्ट्रीय स्तर का उच्च स्थान मिलना चाहिए था। इस मुद्दे पर विचार करने की आवश्यकता राजनीति ने कभी नहीं महसूस किया। कुछ ही वर्ष

पूर्व ऐतिहासिक धरोहर बाबरी मस्जिद को राजनीति ने नष्ट कर दिया। कुछ ही दिन पहले राजनीति ने आदेश पारित कर दिया कि 14 अप्रैल अथवा किसी दिन विशेष को संघाधिपति अशोक महान का जन्म हुआ और वह कुशवाहा जाति का था। मौर्यकाल में वर्ण–व्यवस्था (ब्राह्मण, क्षत्रिय, वैश्य और शूद्र) थी। जाति व्यवस्था की शुरूआत गुप्तकाल से हुई। काश! यह जानने का प्रयास नहीं किया जाता कि यादव, अहीर और ग्वाला में क्या अन्तर है। राजनीति ने इतिहास की नकली धारा प्रवाहित की जिसके फलस्वरूप इतिहास का वास्तविक रूप समाप्त, प्रायः हो गई है। ऐसी बातों से इतिहास के छात्र और शिक्षक परेशानियों में फंसते जा रहे हैं। इतिहास के वैज्ञानिक स्वरूप पर राजनीति हथौड़ा चलाई जा रही है। हमारा देश किराए के विज्ञान और वैज्ञानिक दृष्टि से काम चलाते जा रहा है। पूंजीवाद के गोद में राजनीति बैठ चुकी है। निर्धनों की संख्या बढ़ती जा रही है। आम नागरिक परेशान हैं। नौकरियों पर पूंजीवाद का कब्ज़ा हो चुका है। सरकारी संस्थानों में भी इतिहास अछूत बन चुका है। राजनीति की कृपा से विकास की इमारतें खण्डहर का रूप लेती जा रही हैं।

आज भीड़ ही शहर का रूप लेती जा रही है; तनहाई है और शहर में केवल तनहाई। नौकरी के बाद रिटायर हो गया। ऐसा लगता मानो बिना आक्सीजन वाले बन्द कमरे से बाहर निकल खुली हवा में मनभर स्वतंत्र सांसे ले रहा हूँ। बाल सफेद और झूर्रियाँ बढ़ गई हैं। मित्रों, जान–पहचान वालों और बन्धन से अलग होकर दिनभर टेलीविजन देखता और परिचित सड़कों पर घूमता हूँ। ऐसा लगता कि सड़कें भी अपरिचित हो गई हैं। मन दुखी और चंचल नहीं है। पेंशन के कारण मेरा स्वाभिमान बरकरार है। उसी सड़क पर 45 वर्षों से चलता रहा; हर कदम पर छात्र, शिक्षक और दूकानदार तथा कर्मचारियों से

भेंट मुलाकातें–हंसना, मुस्कराना, प्रणाम, नमस्ते हो जाया करता था। अब मुझे कोई नहीं पहचानता। मैं घर से विश्वविद्यालय आना–जाना करता किन्तु मुझे पहचानने वाले नहीं मिलते। अस्करी साहब कहा करते – मौत कब, कहाँ और कैसे आएगी – कोई नहीं जानता। पढ़ने का दिल नहीं करता। अपने घर में रहने का मीठा स्वाद चखते रहता हूँ। अपने घर की मैंने कोई कल्पना ही नहीं की थी। 45 वर्षों की अवधि मैंने किराए के छह घरों में बारी–बारी से व्यतीत किया। आज मैं अपने घर में रहता हूँ। जहाँ आप पहुँचे छलांगे लगाकर वहाँ मैं भी पहुँचा मगर धीरे–धीरे।

वह किताबों की दुनिया थी। वहाँ चारों ओर किताबें ही किताबें थीं – हंसती, खिलखिलाती, मुस्कराती, समझाती, मार्गदशक, अच्छी–बुरी की दास्तान। उन किताबों पर आदमी मंडरा रहे थे; वे किताबों को देखते, उन किताबों से बातचीत करते और खुश होते थे। कुछ वैसे लोग थे जो किताबों के पास आते तो जरूर किन्तु उनसे बातचीत किए वग़ैर चले जाते थे; किताबों की इच्छा थी कि वे उनका हालचाल पूछकर जाएँ। कुछ वैसे भी थे जिन्हें किताबों से गहरा प्रेम था; वे उन्हें अपने कलेजे से सटाकर कमरों में ले जाते और दिन–रात बातें करते थे। गुरूजी ने उन्हें बताया था कि किताबें विचारों को खाना खिलाती हैं। चिंतन की प्यास बुझाती हैं। शहरों में जितनी भीड़ उतनी ही तनहाई। किताब तनहाई दूर करती है; मित्र बन जाती और अकेलापन दूर करती है।

किताब पढ़ने की इच्छा बिल्कुल नहीं होती। ढलती उम्र का कठोर असर मेरे दिल और दिमाग़ पर पड़ा है। घर में अकेला रहना पसन्द किन्तु शिक्षकों और छात्रों के पास जाना बिल्कुल नापसन्द है। अकेला रहना अच्छा लगता क्योंकि कोई शिकायतकर्ता नहीं होता। इस उम्र में इच्छा और चाहत दम

तोड़ने लगती है।

स्त्रियाँ परिवार की ज्योति और अत्याचारी परिवार के लिए ज्वाला होती हैं। सब कुछ बताने से ही होता है। दिया दर्द कोई दवा न दी। मुकद्दर की मरम्मत वहीं कर सकता है। बहुत ऊँचाई हासिल करने के लिए दिल का टूटना जरूरी है। रिश्ते और मुहब्बत में फर्क यही होते कि रिश्ते तोड़े जा सकते किन्तु मुहब्बत नहीं। मैं खामोशी की आवाज़ सुनते रहता हूँ। बदलता है रंग आसमाँ कैसे कैसे। अपनी ज़िन्दगी को कई बार तरसते हुए मैंने देखी है। मुसीबतों का दरवाजा इतना मुश्किल से बंद कर सका हूँ कि अब उसे खोलने के बारे में सोचने से भी डर लगता है। पैसा खून से ज्यादा गाढ़ा हो गया है। कुछ आंसू जिस्मानी होते हैं। ज्यादा से ज्यादा ख्वाइश को हवस में बदलते देर नहीं लगती। तनहा तो भरी मजलिस में तनहा ही होता है। न मैदान में शेर है न मचान पर शिकारी। मैं बहुत अलग तरह का इंसान हूँ; मेरे साथ रहना आसान नहीं। ज़िन्दगी चक्कर काटकर वहीं आ गई। छात्र जीवन में अकेला था; अवकाश प्राप्त करने के बाद भी अकेला हूँ। न कहानियों की सीमा होती, न जजबातों की कोई जुबान। नरमदिली नहीं छोड़ें। अपने ऊपर बोझ लेना दूसरों पर डालने से बेहतर होता है। जो आप पर मेहरबानी नहीं करे उसकी सज़ा है कि आप उसपर मेहरबानी कर दें। दुख ने मेरे घर का दरवाजा देख लिया है। आप जैसा मजबूत आदमी को बिखरता हुआ पाता हूँ। नजदीकियाँ दूरियाँ पैदा करती हैं। काफी भटका, भटकना भी जरूरी था।

ज़िन्दगी का सफर कभी–कभी बहुत लम्बा हो जाता सफर किए वग़ैर। ग़म की चिल्लाहट मुझे हमेशा सुनाई देती रहती। आज के आइने में कल का अश्क नज़र आता है। हर इंसान अपनी किस्मत इच्छाशक्ति से बनाता है। शक के ज़हर का शिकार बनना मुनासिब नहीं। मुस्कराहटों में कभी–कभी जख्मों के

निशान दिखाई दे जाते हैं। जोखिम तकदीर की खान है। छोटी गली का मैं बड़ा सपना रहा। ज्ञान, विज्ञान और खोज आदमी की बेहतर ज़िन्दगी के लिए किया जाता; न कि हैवानियत के लिए। भीख में शोहरत के सिक्के आज भी मिल जाते हैं। झगड़े मसलों को सुलझा नहीं सकते। हर तरफ शोर –शराबा, कौन सुनता है मेरा। ऐसा नहीं हो सकता कि मैं कुछ न कहूँ और तुम सब समझ जाओ?

सल्तनत काल में चरखा भारत में लोकप्रिय हुआ। भारत में इसका पहला लिखित उल्लेख इसामी कृत *फुतूह–उस–सलातीन* (1350 ई.) में मिलता है लेकिन चित्रों में इसकी अभिव्यक्ति 17वां शताब्दी में हुई। मुग़ल चित्रकार विचित्र ने सत्रहवीं शताब्दी के मध्य के एक चित्र में मध्य–एशिया का दृश्य दिया है जिसमें दृश्यित चरखे भारत की तुलना में छोटे और सरल हैं। इरफान हबीब कहते हैं कि चरखा और धुनिया की कमान सम्भवतः 13वीं शताब्दी में बाहर से भारत आये होंगे।

ऐसे प्रमाण मिलते हैं कि कागज लगभग 100 ई. के आसपास चीन में बनाया गया, सम्भवतः यह कागज का प्रथम प्रमाण था। 8वीं शताब्दी में यह समरकंद और बगदाद, 9वीं शताब्दी तक मिस्र में और 12वीं शताब्दी तक उत्तरी अफ्रीका के रास्ते स्पेन तथा फ्रांस पहुँचा और 14वीं शताब्दी में वह जर्मनी पहुँच गया। जहाँ तक भारत का प्रश्न है तो अलबरूनी ने स्पष्ट किया है कि 11वीं शताब्दी के प्रारम्भिक वर्षों में मुस्लिम पूरी तरह से कागज का इस्तेमाल करने लगे थे लेकिन भारतीयों ने अभी प्रयोग प्रारम्भ भी नहीं किया था। वे ताड़ के पत्तों और छाल पर ही लिख रहे थे। भारत में काग़ज़ का निर्माण 13वीं शताब्दी में ही आरम्भ हुआ जैसा की अमीर खुसरो ने उस शताब्दी के अंत में उल्लेख किया है। लेकिन तब शायद इसका अभाव था। अब तक के मौजूद काग़ज़ी दस्वावेजों में सबसे पुराना कागजी दस्तावेज

फारस का है जिसका समय 718 ई. का है, जबकि भारत में निश्चित रूप से कागज़ पर लिखित पाण्डुलिपि 1223–1224 ई. में गुजरात में लिखी गयी थी।

इरफान हबीब बताते हैं कि प्रधान आविष्कार है 13वीं शताब्दी में समुद्री जहाजों में चुम्बकीय कुतुबनुमा का प्रयोग। इस आविष्कार का व्यापार पर सकारात्मक प्रभाव पड़ा होगा। दूसरा प्रमुख आविष्कार था फीरोज़ तुग़लक द्वारा समय सूचक उपकरणों का प्रयोग। भारतीय घुड़सवार सेना में लोहे की रकाब और नाल का आविष्कार हुआ। 12वीं शताब्दी से पूर्व भारत में रकाब का उल्लेख नहीं मिलता।

भारत में तुर्क हमलावरों द्वारा इसके प्रयोग का प्रत्यक्ष उदाहरण इल्तुतमिश के शासन काल में *फख़–ए–मुदब्बिर* की कृति में मिलता है। लगभग इसी काल की मूर्तिकला में पहली बार (खुजराहों की मूर्त्ति में शायद) रकाब को दर्शाया गया है। रकाब का बेहतर चित्रण 1298 ई. की दुमद (बड़ौदा) की एक मूर्त्ति में मिलता है। *फख़–ए–मुदब्बिर* की कृति से प्रतीत होता है कि 13वीं शताब्दी के प्रारम्भिक वर्षों में भारत में तुर्क अपने घोड़ों के सुमों में लोहे की पट्टियाँ ठोकते थे। शासक वर्ग के रहन–सहन और अन्य आवश्यकताओं के क्षेत्र में भारतीय परिस्थितियों के अनुरूप परिवर्तन किए गए होंगे। नए शासक वर्ग के साथ–साथ भारत में इस क्षेत्र में भी एक नई शैली और उसके अनुरूप नई तकनीक का आरम्भ हुआ। छत का भार, जो अब तक लिंटन और बीम द्वारा नीचे उतारा जाता था, अब मेहराबों और गुम्बदों के माध्यम से उतारा जाने लगा। तकनीकी शब्दावली में कहें तो **ट्रबिएट शैली** (शहतीरी शैली) का स्थान **आर्कुएट शैली** (चापाकार शैली) ने ले लिया। मेहराब और गुम्बदों को बनाने के जुड़ाई कार्य में चूने का इस्तेमाल किया जाने लगा। सल्तनत काल में अधिकतर उत्पादन स्वतंत्र घरेलू पद्धति पर

आधारित था। सूत कातने का काम अधिकतर महिलाएं घरों में करती थीं। कपड़ा बुनने वाले अपने–अपने घरों में करघे पर उस सूत से कपड़ा बनाते जो वे स्वयं कातते या बाजार से खरीदते थे। लेकिन यदि कपड़ा बनाने में प्रयुक्त होने वाला कच्चा रेशम, सोने और चांदी के तार जैसा कीमती सामान होता तो इसे बनाने के लिए उन्हें किसी की निगरानी में कारखानों में जाकर यह कार्य करना होता था। मुहम्मद तुग़लक़ के कारखानों में लगभग चार हजार रेशम के कारीगर कसीदाकारी का कार्य करते थे। अफीफ के अनुसार फिरोज़ तुग़लक़ के कारखानों में कपड़े और कालीन बड़ी मात्रा में बनाए जाते थे।

मुसलमानों के साथ इस देश में अरबी, तुर्की और फारसी के बहुत से शब्द आए। जैसे अरबी के अक़्ल, इम्तहान, औरत, इंसाफ, ऐब, खबर, शरबत और सलाह। तुर्की से काबू, कुली, ताप, लाश, कैंची तथा बोतल। फारसी से आदमी, आबादी, खरीद, कमर, चश्मा, साबुन, हवा और हजार। विज्ञान का इस्लामी शब्दावली में पर्याय इल्म है। कुर्आन में 'इल्म' के साथ 'हिकमत' की शब्दावली का प्रयोग हुआ है, जिसकी विस्तृत भावभूमि में 'विज्ञान' की पाश्चात्य कल्पना समाहित हो जाती है, जिसमें साइन्स का अर्थ है, किसी प्रकार का बौद्धिक कार्यकलाप, जो भौतिक जगत् के तात्त्विक, निष्पक्ष, प्रेक्षण एवं क्रमबद्ध परीक्षण पर आधारित हो। रसायनशास्त्र शब्दावली का अंग्रेजी पर्याय **कमेस्ट्री** अरबी शब्दावली कीमिया से उद्धृत है। इस्लामी औषधि विज्ञान को इस्लामी शब्दावली में **हिकमत** (विज्ञान) कहा गया है तथा इसके प्रयोग करने वालों को हकीम कहते हैं। वर्तमान में हकीम शब्द चिकित्सक के अर्थों में प्रयोग किया जाता है। इस्लामी औषधि–विज्ञान भारत में साधारणतया यूनानी चिकित्सा के नाम से जाना जाता है।

भारत में मुस्लिम सल्तनतों के स्थापित होने के बाद अरबी

चिकित्सा विज्ञान ईरान के मार्ग से भारत पहुँचा। उस समय तक यह चिकित्सा विज्ञान 'यूनानी तिब्ब' के नाम से प्रचलित हो चुका था। परन्तु अपने वास्तविक रूप में यूनानी, भारतीय, ईरानी और अरबी चिकित्सकों के प्रयत्नों का एक सम्मिश्रण था तथा अपना कार्यक्षेत्र निश्चित कर चुका था। भारत में इन पद्धति के चिकित्सकों की सर्वप्रियता इतनी बढ़ी कि हर नगर तथा छोटी–बड़ी बस्तियों में वे फैल गये। सिकन्दर लोदी के काल में (1488–1517) शाही बहूद ने आयुर्वेद की एक महत्त्वपूर्ण पुस्तक *मादन–उल–शिफा* के नाम से फारसी में लिखी, जिसमें आयुर्वेद के विशेषज्ञों में सुश्रुत, चरक, सारंग चिन्तामणि, नेकसेन आदि से लाभ लिया गया।

अलाउद्दीन खिलजी के शासनकाल (1296–1316) में एक उच्च कोटि के चिकित्सक सद्रउद्दीन दमिश्की की चर्चा मिलती है, जिसने इब्न–सीना (मृ.1037 ई.) के कानून पर अभिभाषण प्रस्तुत किये थे। इस काल में हिन्दू वैद्यों और मुस्लिम हकीमों के बीच सहयोग एवं तादात्म्य स्थापित था। सुल्तान मुहम्मद–बिन–तुग़लक़ (1351 ई.) भी इब्न–सीना के प्रति व्यक्तिगण अनुराग एवं श्रद्धा रखता था।

मुग़ल साम्राज्य भारतीय विज्ञान की दृष्टि से स्वर्णिम युग कहा जा सकता है, जिसमें मुस्लिम देशों से विशेषज्ञों एवं विद्धानों के आगमन की गति बढ़ी। बड़ी संख्या में शिफाखाने (चिकित्सालय) स्थापित किये गए। चिकित्सा विज्ञान और उपचार – पद्धति पर कई पुस्तकें अस्तित्व में आयीं। इस कार्य में मुसलमानों के साथ स्थानीय हिन्दू भी सम्मिलित हुए। पुरूषों के अतिरिक्त महिलाएँ भी चिकित्सक बनीं। यूसुफ़ मुहम्मद यूसुफी हरवी ने बाबर के प्रति अपने प्रसिद्ध अभिनन्दन काव्य में चिकित्साशास्त्र के अनेक महत्वपूर्ण शब्दावलियों का न केवल प्रयोग किया बल्कि विभिन्न रोगों के उपचार हेतु सुझाव भी

प्रस्तुत किये हैं। हकीम यूसुफी ने बादशाह हुमायूँ (मृ.1556 ई.) के राजकाल में भी चिकित्सा पर कई किताबें लिखीं, जिनमें *दलायल–उल–नब्ज, दलायल–उल–बोल, रिसाला शिनाख्तन कारूरा, रियाज–उल–अदविया* आदि महत्त्वपूर्ण हैं। हुमायूँ के राजकाल का एक और नामचीन चिकित्सक मुहम्मद बेग था, जो बाबर के साथ भारत आया था। उसकी दो पुस्तकें *दस्तूर–उल–फरद* तथा *रववास–उल–अशिया* प्रसिद्ध हैं। इसके अतिरिक्त मुजफ्फर अलशिफाई (मृ. 1556 ई.) की दो पुस्तकें *काराबादीने–शिफाई* तथा *शिफा–उल–अलील* की चर्चा की जा सकती है। अकबर के समय अनेक **चिकित्सालय** स्थापित किये गए।

जहाँगीर के शासनकाल में अकबरी दरबार के समान हकीमों की मान–मर्यादा होती रही। उसने पारित किया था कि समस्त बड़े नगरों में चिकित्सालय स्थापित किये जायँ। रोगियों के उपचार हेतु हकीम नियुक्त किये जायँ और उससे संबंधित सभी व्यय राजकोष से व्यय किये जायँ।

शाहजहाँ (शाह शब्द फारसी है) के शासनकाल में हकीम ऐन–उल–मुल्क नूरउद्दीन मुहम्मद अब्दुल्लाह शीराजी नामचीन चिकित्सक था, जिसने *अलफाजे अदविया* शाहजहाँ के नाम समर्पित की है। शाहजहाँनी दरबार के एक महत्वपूर्ण चिकित्सक मीर हासिम गीलानी (मृ.1650 ई.) अपनी उपाधि ''मसीहुज्जमाँ खानबहादुर'' के आधार पर अधिक प्रसिद्ध है।

औरंगजेब आलमगीर के शासनकाल में भी तबीबों की सरपरस्ती होती रही। वह शिफाखाने के लिए अफसर–उल–अतिब्बा की नियुक्ति स्वयं करता था। दरबारी तबीबों में मुहम्मद रज़ा शीराजी ने *रियाजे–आलमगीरी,* दरवेश मुहम्मद ऐमनाबादी ने *तिब्बे–औरंगजेबी,* मुहम्मद अकबर अरजानी (मृ.1757 ई.) ने *तिब्ब–उल–अकबर* लिखकर औरंगजेब के नाम

समर्पित किया। औरंगजेब के ज्येष्ठ पुत्र मुहम्मद आजम शाह (मृ. 1719) के मुसाहिब नव्वाब अमीर खाँ ने पैंतीस वर्ष की आयु में *शिफा–उल–कुलूब* लिखी। शाहजहाँ मुहम्मद आजम शाह के लिए हकीम मुहम्मद रज़ीउद्दीन ने *अजायब–उल–इत्तेफाक़–दर–शिनाख्तने–तिरयाक* लिखकर हलाहल (विष) का प्रतिकारक बताया और उसके प्रयोग की विधियाँ भी सुझायी। औरंगजेब के अमीरों में नेअमत खान आली (मृ.1710 ई.) अपने समय का सर्वश्रेष्ठ चिकित्सक था। एक अन्य अमीर बख्ताबर खाँ भी चिकित्सकों का पोषक था। हकीम अब्दुल्लाह अकबराबादी ने उसके लिए *हमदने–बख्त* लिखी। इसी प्रकार हकीम राजी खाँ बहादुर ने बादशाह शाह प्रथम (मृ. 1712 ई.) के लिए *फवायदे–मेदा–ओ–अमराजे–मेदा* लिखी। बांस द्वारा भूमि नापने का प्रचलन अकबर के जमाने में शुरू हुआ।

अपने अगल–बगल पर निगाह डालिये, मुस्लिम सभ्यता के क्या–क्या लक्षण हैं, जिन पर साधारणतया निगाह भी नहीं जाती। चलिये कुछ शब्दों के माध्यम से उनकी खोज करें। देखिये क्या–क्या शब्द अरबी–फारसी के हैं, जो आपके जीवनचर्या में इस प्रकार घुल–मिल गये हैं कि आपको उनके विदेशी होने का एहसास नहीं होता। ये शब्द अकेले नहीं आते, अपने साथ में उन वस्तुओं को लाते हैं जो उनसे सम्बन्धित हैं। आपके शरीर पर वस्त्रों की स्थिति, उसकी तराश–खराश, 'कमीज'(कमीस), 'पाजामा', 'शेरवानी', 'साफा', 'दस्ताना', 'रूमाल', आदि; आपके भोजन में सम्मिलित वस्तु चावल, रोटी, सब्जी आदि के सैकड़ों प्रकार हैं, जिनसे अत्यन्त स्वादिष्ट व्यंजन बनाये जाते हैं। इन पर बहुत–सी पुस्तकें उपलब्ध हैं जिनमें इनके बनाने की विधियाँ लिखी गयी हैं। जनसाधारण भी उनमें से कुछ वस्तुओं का प्रयोग करते हैं। जैसे चावल में 'पुलाव', 'बिरयानी', 'मुतंजन', 'मुर्जाफर' आदि, रोटी में 'बाकरखानी', 'शीरमाल' तथा 'आबी' अथवा 'नान'

और सालन में 'कोरमा', 'कलिया', 'दो प्याजा', 'रोगनजोश' आदि। एक अनाज से ही चावल, रोटी और सालन के अनेकानेक प्रकार आविष्कार किये गये हैं।

इस शब्द 'मसाला' पर क्या कभी आपने विचार किया है, इसका शुद्ध रूप 'मसालेहा' है, जिसके अर्थ होते हैं, दोस्ती का सामान अथवा सुधार की वस्तु। बाहर से आये हुए मुसलमानों के लिए भारत के वातावरण एवं जलवायु से तदात्म्य स्थापित करने हेतु भोजन को सन्तुलित बनाने के नुस्खे मसाले के रूप में प्रचलित हुए। यह हलवाई कौन है, यह हलवा बनानेवाला है, 'हलवा', अरबी शब्द है। अपने मिष्ठान्न भण्डार के साथ ही यह भी बाहर से आया है। आज जिन वस्तुओं से अपने घर की साज–सज्जा करते हैं, जैसे 'कुर्सी', 'सोफा', 'मेज', 'तख्त', 'चौकी', 'चादर', 'ताकिया', 'गिलाफ', 'लिहाफ', 'रजाई', 'तोशक', 'दरी', 'जाजिम' आदि और जिनसे पढ़ते–लिखते हैं, 'कागज', 'कलम', 'दवात' आदि सब मुसलमानों के साथ बाहर से आये हैं।

मुग़ल दरबार में भैतिकी का प्रकाण्ड विद्वान फत्ह–उल्लाह शीराजी (मृ.1589 ई.) के आविष्कारों का क्षेत्र अत्यन्त विस्तृत था, जिनमें एक ऐसे स्पन्दित दर्पण का आविष्कार भी था, जो निकट और दूरी से समान रूप में दिखायी पड़ता था।

बारहवीं शताब्दी के दौरान क्षत्रिय शब्द समाप्त–प्रायः था। राजपूत शब्द का चलन शुरू होने से पूर्व इन्हें ठाकुर, राय, राणा और रावत के नाम से जानते थे; इस समय के कुछ संस्कृत–ग्रन्थों में 'क्षत्रिय' शब्द भी देखने में आता है (मोहम्मद हबीब, 'उत्तरी भारत में नगरीय क्रान्ति, *मध्यकालीन भारत* (सं.) इरफान हबीब, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली, 2006 पृ.12) तुर्की में फारस और मध्य–एशिया (असीरियन शब्द असु (सूर्योदय) से एशिया शब्द बना है।) को **अजम** कहते हैं।

उत्तर प्रदेश में अवस्थित फर्रूखाबाद नगर को नवाब मुहम्मदशाह बंगश ने मुग़ल–सम्राट फर्रूखसियर (1712–1719) के नाम पर बसाया था। इस इलाके (जो प्राचीन काल में दक्षिण पंचाल कहलाता था) की राजधानी पहले कन्नौज थी। इस नगर के बस जाने पर राजधानी यहीं बनाई गई और कालपी के बंगश शासकों ने अपने प्रांत का मुख्य स्थान इसी नगर को बनाया। उत्तर प्रदेश के आगरा जिला में अवस्थित फिरोज़ाबाद नगर को फिरोजशाह तुग़लक़ ने बसाया। मैसूर के जिला गुलबर्गा में अवस्थित फिरोजाबाद को फिरोजशाह बहमनी (1397–1422) ने बसाया। लखनऊ को राजधानी बनाने से पूर्व, अवध के नवाबों ने फैजाबाद में ही अपने रहने के लिए महल बनवाए थे। नवाब शुजाउद्दौला और परवर्ती नवाबों के समय में यहाँ अनेक सुन्दर प्रासाद, मकबरे और उद्यान बने जिनमें से खुर्द महल, बहूबेगम का मकबरा, गुलाबबाड़ी तथा दिलकुशा आज भी वर्तमान है।

मद्रास की पुरानी बस्ती का नाम चेन्नापट्म था। इसी ग्राम में 1640 ई. में अंग्रेज व्यापारी फ्रांसिस डे ने फोर्ट सेंट जॉर्ज की स्थापना की थी। इसी किले के चतुर्दिक भावी महानगरी मद्रास का कालांतर में विकास हुआ। वक्त की सूई को पीछे घुमा पाना असंभव था।

पृथ्वीराज के तरायन के युद्ध में (1192 ई) मारे जाने पर दिल्ली पर मुहम्मद ग़ौरी का अधिकार हो गया। इस घटना के पश्चात लगभग साढ़े छः सौ वर्षों तक दिल्ली पर मुसलमान बादशाहों का अधिकार रहा और यह नगरी अनेक साम्राज्यों की राजधानी के रूप में बसती और उजड़ती रही। मुहम्मद ग़ौरी के पश्चात् 1236 ई. में गुलाम–वंश की राजधानी दिल्ली में बनी। इसी काल में कुतुबमीनार का निर्माण हुआ। गुलामवंश के पश्चात् अलाउद्दीन ने सीरी में अपनी राजधानी बनाई। तुग़लक़कालीन दिल्ली वर्तमान तुग़लक़ाबाद में थी किन्तु फिरोजशाह तुग़लक़

(1351–1388 ई.) के जमाने में इसका विस्तार दिल्ली दरवाजे के बाहर फिरोजशाह कोटला तक हो गया। तुग़लक़बाद में मुहम्मद तुग़लक़ का मकबरा है। तुग़लकों के पश्चात् लोदियों का कुछ समय तक दिल्ली पर कब्जा रहा। 1526 ई. में पानीपत के युद्ध के पश्चात् बाबर ने दिल्ली पर अधिकार कर लिया। बाबर और हुमायूँ की राजधानी दिल्ली ही में रही। शेरशाह सूरी ने भी पांच वर्ष दिल्ली में राज्य किया। अकबर तथा जहांगीर के समय में दिल्ली का गौरव फतहपुर सीकरी तथा आगरे ने कुछ समय तक के लिए छीन लिया किन्तु शाहजहाँ ने पुनः दिल्ली में अपनी राजधानी बनाई। वही शाहजहाँबाद या चहारदिवारी के अंदर के शहर का निर्माता था। औरंगजेब ने भी दिल्ली में अपने विशाल साम्राज्य की राजधानी कायम रखी। 1857 ई. तक मुग़लों का राज्य किसी न किसी रूप में चलता रहा।

दिल्ली की वास्तुकला का वास्तविक गौरव मुग़लकालीन है। हुमायूँ के मकबरे को 1665 ई. में उसकी बेगम हमीदा बानो ने बनवाया था। इसमें हमीदा की कब्र भी है। इसके अतिरिक्त विभिन्न कालों में बनी दाराशिकोह, फर्रूखसियर तथा आलमगीर द्वितीय आदि की भी कब्रें यहीं स्थित हैं। कहा जाता है कि मुग़ल परिवार के तथा उससे संबंधित 90 से अधिक व्यक्तियों की कब्रें यहाँ हैं। 1857 ई. की राज्य–क्रांति में अंतिम मुगल सम्राट् बहादुरशाह को अंग्रेजों ने यहीं कैद किया था। यह मकबरा मुगल वास्तुकला का प्रथम प्रारूपिक उदाहरण है।

लालकिला जो फर्ग्युसन के अनुसार शायद संसार का सर्वश्रेष्ठ राजप्रसाद है, 1639 और 1648 ई. के बीच शाहजहाँ द्वारा बनवाया गया था। दीवाने खास में जगप्रसिद्ध मयूर सिंहासन या तख्तेताऊस था जिसे शाहजहाँ ने, तत्कालीन यूरोपीय लेखकों के अनुसार 20 लाख पौंड की लागत से बनवाया था। लालकिला के ठीक सामने कुछ दूर पर, चांदनी चौक के पास भारत की

सबसे बड़ी मस्जिद, जामा–मस्जिद है। इसे शाहजहाँ ने 1650–58 ई. में बनवाया था। इसके तीन पट्टियोंदार कंद्राकृति गुंबद और दो 130 फुट ऊँची पतली मीनारें हैं। ये विशेषताएं मुगलशैली की परिचायक हैं। बीच में विशाल प्रांगण है जिसके तीन ओर खुले हुए प्रकोष्ठ हैं और तीन ओर विशाल दरवाजे जो भूमितल से काफी ऊँचाई पर हैं। इन तक पहुँचने के लिए सीढ़ियों की पंक्तियाँ बनी हैं।

कहा जाता है कि विभिन्न कालों में यमुना नदी की धारा के साथ ही साथ दिल्ली नगरीकी स्थिति भी बदलती रही है। प्राचीनतम दिल्ली मेहरौली के आसपास तथा पुराने किले के परवर्ती प्रदेश में थी। गुलाम राजवंश की राजधानी भी लगभग इसी प्रदेश में रही। अलाउद्दीन की दिल्ली वर्तमान सीरी (तुगलकाबाद और कुतुब के बीच) के पास और तुग़लक़ों की दिल्ली तुगलक़ाबाद (दिल्ली–मथुरा मार्ग के निकट) में थी। शाहजहाँ ने जो दिल्ली बसाई वही आजकल की पुरानी दिल्ली है जिसके चारों ओर परकोटा खिंचा हुआ है। चांदनी चौक और इसके बीच बहने वाली नहर शाहजहाँ ने ही बनवाई थी। अंग्रेजों ने पुरानी दिल्ली से कुछ दूर हटकर अपनी राजधानी नई दिल्ली बनाई। इसके निर्माता प्रसिद्ध शिल्पी सर एडवर्ड लुट्येंस और सर हर्बर्ट बेकर थे। इस भव्य नगरी का आनुष्ठानिक उद्घाटन 1931 में हुआ था। दिल्ली के पास फिरोजशाह कोटला है जहाँ मुग़ल–सुल्तानों ने 14वीं शती में अपनी नई राजधानी बसाई थी। यहाँ फिरोजशाह तुग़लक़ का मकबरा व अशोक का स्तंभ है।

त्रिवेन्द्रम या तिरूवांकुर (ट्रावनकोर) केरल की भूतपूर्व राजधानी थी। 18वीं सदी में राजा मार्तन्ड वर्मा ने केरल देश की सीमाएं विस्तृत करने के पश्चात् इस नगर में अपनी राजधानी स्थापित की थी। इस नगर के अधिष्ठातृ–देव पद्मनाभ को उन्होंने अपना राज्य समर्पण कर दिया तथा स्वयं देवता के प्रतिनिधि के

रूप में राज्य करते थे। यहाँ पद्मनाभ में विष्णु का विशाल मंदिर स्थित है। उन्हें अनन्तस्वामी भी कहते हैं। जान पड़ता है कि तिरूविंदम् या त्रिवेंद्रम तिरूअनंतपुर नाम का ही रूपांतर है। मध्यकाल में गली के लिए सबसे प्रचलित शब्द **कूचा** था जिसे अकसर बाजार शब्द के साथ जोड़कर आज भी दिल्ली में इस्तेमाल किया जाता है। बड़ी मंडियों को **चौक** कहते थे। छोटा चकोर बाजार को **कटरा** कहते थे। बंगला (बैंगलौ) शब्द बंगाल से आया है (एस. नूरूल हसन *"एक मध्यकालीन भारतीय नगर की संरचना", मध्यकालीन भारत,* (सम्पा.), इरफ़ान हबीब, जिल्द 5, राजकमल प्रकाशन दिल्ली, 2006, पृ. 85–93)।

13वीं शती में कश्मीर मुसलमानों के प्रभाव में आया। ईरान के हज़रत सैयद अली हमदानी नामक संत ने अपने धर्म का यहाँ जोरों से प्रचार किया और धीरे–धीरे राज्यसत्ता भी मुसलमानों के हाथ में पहुँच गई। कश्मीर के मुसलमानों का राज्य 1338 ई. से 1587 ई. तक रहा और जैनुलआब्दीन के शासनकाल में कश्मीर भारत–ईरानी संस्कृति का प्रख्यात केंन्द्र बन गया। इस शासक को उसके उदार विचारों और संस्कृति प्रेम के कारण "कश्मीर का अकबर" कहा जाता है। 1587 से 1739 ई. तक कश्मीर मुगल साम्राज्य का अभिन्न अंग बना रहा। जहांगीर और शाहजहाँ के समय के अनेक स्मारक आज भी कश्मीर के सर्वोत्कृष्ट स्मारक माने जाते हैं। इनमें निशात बाग, शालीमार उद्यान आदि प्रमुख हैं। 1739 से 1819 ई. तक काबुल के राजाओं ने कश्मीर पर राज्य किया। कश्मीर का प्राचीन नाम **कश्यप का पर्वत** था। कश्मीर शब्द को **कश्यपमेरू** का ही रूपांतर कहा जाता है। दूसरा मत यह भी है कि कश्मीर, कश्यप की झील का अपभ्रंश है। 1537 ई. में सरदार केम्पगोन्दा ने कर्णाटक की राजधानी बंगलौर में मिट्टी का दुर्ग बनवाया था और नगर के चारों कोनों पर चार मीनारें। इस प्राचीन दुर्ग के अवशेष अभी

तक स्थित हैं। हैदर अली ने मिट्टी के दुर्ग को पत्थर से पुनर्निर्मित करवाया (1761 ई.) और टीपू ने कई महत्वपूर्ण परिवर्तन किए। यह किला आज मैसूर राज्य में मुसलमानी शासन का अच्छा उदाहरण है। किले से 7 मील दूर हैदर अली का लालबाग स्थित है।

शाहजहाँ के जमाने में भी इमारतें बनीं, किन्तु लखनऊ की वास्तविक उन्नति तो नवाबी काल में ही हुई। मुहम्मदशाह के समय में दिल्ली का मुग़ल साम्राज्य छिन्न–भिन्न होने लगा था। 1720 ई. में अवध के सूबेदार सआदत खां, बुरहानुल मुल्क ने लखनऊ में स्वतंत्र सल्तनत कायम कर ली और लखनऊ में शिया संप्रदाय के नवाबों की प्रख्यात परंपरा का आरंभ किया। उसके पश्चात् लखनऊ में सफदरजंग, शुजाउद्दौला, आसफुद्दौला(1775–1797 ई.) के समय में राजधानी फैजाबाद से लखनऊ लाई गई (1775 ई.)। आसफुद्दौला ने लखनऊ में बड़ा इमामबाड़ा, विशाल रूमी दरवाजा और आसफी मस्जिद नामक इमारतें बनवाई – इनमें अधिकांश इमारतें अकाल पीड़ियों को मजदूरी देने के लिए बनवाई गई थीं। आसफुद्दौला को लखनऊ निवासी 'जिसे न दे मौला, उसे दे आसफुद्दौला' कहकर आज भी याद करते हैं। आसफुद्दौला के जमाने में ही अन्य कई प्रसिद्ध भवन, बाजार तथा दरवाजे बने थे जिनमें प्रमुख ये हैं – दौलतखाना, रेजीडैंसी, बिबियापुर कोठी, चौक बाजार आदि।

***